DUE DATE

Cl. No. *Acc. No.*

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night Book **Re. 1/-** per day.

ی کاپی

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں
عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

اردو علمِ ادب کی دلچسپیوں کا ماہوار مجموعہ

بہارستان

ادارہ

مسئولِ عمومی
اختر شیرانی

معاون
رفیعی اجمیری

مقامِ اشاعت
دفتر رسالہ "بہارستان" مزنگ لاہور

فروری ۱۹۳۵ء

آج بھولے

کا باد کیا برسوں نہ

بشرطیکہ آپ اکسیر دماغ استعمال کریں

"اکسیر دماغ" دنیا بھر میں صرف ایک دوا ہے جو دماغ کو قوت دینے اور حافظہ کو بڑھانے کی یکتا دعوے دار ہے!

اگر بچے تعلیم سے اس لئے جی چراتے ہیں کہ ان کا دماغ کمزور ہے تعلیم پر طبیعت نہیں جمتی، پڑھا لکھا یاد نہیں رہتا سر خالی معلوم ہوتا ہے یا اٹھتے بیٹھتے چکر آتے ہیں

تو والدین کا فرض ہے

کہ وہ اپنے بچوں کو اکسیر دماغ استعمال کرائیں اور پھر دیکھیں کہ خدا نے اس دوا کو دماغ کی نشوونما کے لئے کیا تاثیریں دے رکھی ہیں

قیمت
چھوٹی آزمائشی شیشی جس میں پندرہ روز کی دوا ہوتی ہے صرف دو روپے
بڑی شیشی جس میں ایک مہینے کی دوا ہوتی ہے صرف تین روپے

المشتہر
حکیم محمد مسعود مستند پنجاب یونیورسٹی، بیڈن روڈ محبوب بلڈنگ لاہور

جلد ۱ - نمبر ۱

بہارستان لاہور

فہرست مضامین ماہ جنوری ۱۹۲۷ء

بڑے بابو

جو اسی نمبر میں اشاعت پذیر ہے نہایت قابل قدر اور اچھوتا مضمون ہے جس کی دلچسپی کی آپ داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے

تصاویر ۱۔ اے عشق کہیں لے چل! ۲۔ لسان الاسرار مولانا احسن لکھنوی! ۳۔ ہیرو (کیف انتظار)

معزز معاصرین سے مخلصانہ استدعا ہے کہ بہارستان کے مضامین نقل کرتے وقت حوالہ ضرور دیا کریں

بہارستان سبھا

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

نئی جلد کا آغاز ہے احباب کی زبان پر مبارکباد کے ترانے ہیں، اور "حریفوں" کی تیرہ درونی ع

قبولِ خاطر و حسنِ سخن خدا داد است

کی شکوہ سنج — ہم ہیں کہ جہاں اُن کی نوازشوں پر مغرور ہیں، وہیں ان کی حسد پیشگی کے بھی ممنون! کہ قدردانی کے نزدیک یہ بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ جس قدر وہ —! تلخی کے بغیر حلاوت کا مزا نہیں آتا، اور حلاوت نہ ہو تو تلخی کی حقیقت معلوم —! تعرف الاشیار باضدادہا کی یہی دلچسپ حقیقت ہے جو دنیا کے رنج و غم کی تلخیوں میں کسی قدر تسکین کی عسلیت شامل کر دیتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بہارستاں کی "کمسنی" بھی اس عالمگیر حقیقت کے اثرات سے بیگانہ نہیں ہوسکتی ؎

کسے بخاک فگند و کسے نواخت مرا   بقدرِ ہمت خود ہر کسے شناخت مرا

"بہارستان" کی یہ نئی منزل آرائی جس طرح ناظرین کیلئے اکثر تازہ توقعات کی حامل ہوگی، اسی طرح ہم نے بھی اپنے اہل قلم کی جانب سے نئی نئی امید و ں کے قیام کی طلبگار رہے۔ ان کی پچھلی عنایتوں کا شکریہ ادا نہ کرنا کفرانِ ادب" تھا۔ ہم ایک حد تک اس سے عہدہ برا بھی ہو چکے، اب تو صرف اسی قدر عرض کرنا ہے کہ ہمارے قلمی نوازش فرماؤں کا نازِ بے التفاتی، اگر کفرانِ نیازمندی" کا گنہگار نہ ہو تو زہے نصیب! خاص طور پر اپنے ان محترم بزرگوں کی توجہاتِ عالیہ سے گذارش ہے جن کی گرانمایہ عنایتیں صرف ہماری محبت ہی کو لائق خطاب تصور کرتی ہیں اور بہارستان کی سب سے پہلی ادبی عزت ہے —!

اس اشاعت میں قبلہ مولانا احسن لکھنوی کی تازہ تصویر باصرہ نواز ہوتی ہے۔ ارادہ تھا کہ اسکے ساتھ مولانا کے مختصر سوانح عمری کے طور پر ہم کچھ لکھیں گے جس میں مجملاً تبصرۂ کلام بھی ہوگا۔ اسی طرح مولانا کے ڈراموں پر بھی ایک مستقل تبصرہ کی ضرورت تھی اور یہ حصہ ہمارے محترم صاحبزادہ محمد عمر صاحب (مولف ناٹک ساگر) نے اپنے ذمے لیا تھا مگر افسوس ہے کہ جہاں زخم پا کی وجہ سے مولانا کو، حالات سوانح کے متعلق، ہمارے سوالات کا جواب لکھنے کی مہلت نہیں مل سکی، وہاں صاحبزادہ صاحب کا مضمون بھی مکمل نہ ہو سکا اور اس طرح یہ دونوں ضروری چیزیں نظر افروز نہ ہوسکیں ہمیں امید ہے کہ صاحبزادہ صاحب کا معرکۃ الآرا مضمون بہت جلد اشاعت پذیر ہوگا۔ بشرطیکہ سوادِ کشمیر کی سرمائی تندی نے جناب کے دل و دماغ کو "منجمد" نہ کر دیا

پچھلے دنوں نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیال عظیم آبادی

تھا مگر محبت کا پہلا موقع نہ تھا، اور اس لئے زیادہ پر لطف تھا —— اس سہ روزہ قیام کی صحبتوں میں نواب صاحب قبلہ کی جن بزرگانہ نوازشوں سے ہمیں بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملا وہ حدِ اظہار سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ صرف احساس ہے اور ہمارا خیال ہے کہ خلوص و نیاز کی بے زبانی کے لئے احساس ہی سب کچھ ہوتا ہے اگر نواب صاحب قبلہ بے ادبی پر محمول نہ فرمائیں تو عرض کریں ؎

آں دل کہ رم گرفتے از خوب روجواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

ہمیں یقین ہے کہ نواب صاحب قبلہ بہارستان سے متعلق اپنے وعدوں کو فراموش نہ فرمادیں گے —— خدا نہ کرے!

اس مرتبہ سبھا کو اردو کے نامور افسانہ نگار مسٹر پریم چند بی۔ اے کی شرکت سے مفتخر ہونے کا موقع ملتا ہے، جسے یقیناً ناظرین بصد مسرت کی نظر سے دیکھیں گے۔ مسٹر موصوف کی افسانہ پردازی کا جوہر امتیازی حقیقت نگاری ہے اور اسی لئے ان کو ملک میں بجا طور پر "فطرت نگار" کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہمیں آپ کی "دیر آشنائی" کی شکایت کا تو حق نہیں، البتہ "آشنائی" کے "بعد کم التفاتی" کا گلہ ضرور ہے۔ امید ہے ہماری نیازمندیاں آپ کی قیمتی توجہات کو آئندہ تھوڑی بہت "فیاضی" ضرور سکھا دیں گی ؎

لائے اس بت کو التجا کر کے   کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے!

ہمارے مکرم جناب سید حفیظ الدین صاحب (شملہ والے) کا قیمتی مضمون "مصر کے آثار قدیمہ" جن لوگوں کی نظر سے گذرا ہے وہ یہ معلوم کر کے خوش ہونگے۔ کہ اب موصوف نے آثار قدیمہ کے باب کو مستقل طور پر اپنے ذمہ لے لیا ہے ہمیں امید ہے کہ آپ کی توجہ سے یہ سنگلاخ زمین ایسے ایسے قیمتی لعل و جواہر اگلے گی، جن کی اردو کو سخت ضرورت ہے ——!

بہارستان میں آثار قدیمہ کے مستقل باب کا جس طرح بہترین انتظام ہوا ہے اسی طرح ہم آرٹ کے متعلق ایک قابل قدر سلسلہ مضامین کا اہتمام کرنے میں بھی کامیاب ہوگئے ہیں۔ جسے سبھا کے "نوارد مہمان" جناب شیخ عطاء الرحمٰن صاحب دہلوی بی اے (آنرز) ال ال۔ بی وکیل نے اپنے ذمہ لیا ہے جن کی "تشریف آوری" کا ہم دلی تپاک سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ ع

اے آمدنت باعث آزادی ما!

عنقریب اس سلسلہ کی پہلی قسط نظر افروز ہوگی —!

ہمیں دلی اندوہ کے قلم سے لکھنا پڑتا ہے کہ اس مہینے کے شروع میں اردو کے مشہور اور موقر رسالہ زمانہ کے فاضل ایڈیٹر جناب منشی دیا نرائن صاحب نگم بی۔ اے کے والد بزرگوار اپنے نامور فرزند اور دوسرے اعزا کو داغ مفارقت دے گئے۔ ہم اپنی اور بہارستان کی جانب

سے اصالتاً اور ناظرین کی طرف سے وکالتاً منشی صاحب
قبلہ اور خاندان کے دوسرے افراد سے دلی ہمدردی
کا اظہار کرتے ہیں ——— !

دوسری افسوسناک خبر چچا عبدالسلام صاحب
(خیال ایم۔ اے علیگ) کی والدہ ماجدہ کی رحلت کی
ہے مرحومہ کو ۸ اگست کو اختلاج قلب کا پہلا دورہ
پڑا۔ ۲۹۔ اکتوبر کو دہنی جانب فالج گرا اور ۳ نومبر ۱۹۲۶ء
کو شام کے ۵ بجے ۵۸ سال کی عمر میں ہمیشہ کیلئے عبرت
آباد دنیا سے سدھار گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
ہمیں اس شدید حادثہ میں چچا عبدالسلام صاحب قبلہ
سے دلی ہمدردی ہے۔ دعا ہے کہ خدا مرحومہ کو جوارِ
رحمت میں جگہ دے ——— !

جیساکہ ناظرین نے اندازہ کیا ہوگا۔ بہارستان
کے "پرانے" کاتب منشی عبدالحمید وزیرآبادی خوشنویس
نے دوسرے نمبر کے بعد ہی سے پنشن لے لی تھی۔
شاید اس لئے کہ عالم کتابت میں آپ "پیرجی" کر کے
مشہور ہیں۔ اور پیری بہرکیف پنشن طلب ہوا ہی کرتی ہے
ہمیں دلی مسرت ہے کہ آپ نے پھر "بہارستان" کو
اپنے قلم بہار رقم کے سپرد کر دیا ہے اور اب جہاں تک مضامین
اور کتابت کا تعلق ہے ع
عروسِ جمیل "و" لباسِ حریر"
کا معاملہ اہل نظر کے ذوقِ سلیم کو نئے سرے سے دعوت
موازنہ دے رہا ہے ——— !

• ہم تقریباً ایک ماہ سے ع
زہے مسافتِ عمرے کہ در سفر گذرد !
کا مفہوم سمجھنے کی عملاً کوشش کر رہے ہیں۔ جے پور اور
جودھپور کی گل زمینوں کے اُن قیامت آفرین ہنگامہ ہائے
ذوق و نظر سے لیکر جن کا تعلق ع
پنگھٹ پر ہو رہی بھیڑ !
سے ہے۔ ٹونک اور اجمیر کے دلآویز اور "تصوف آموز"
مناظر تک، جا بجا سفر کے راستے میں آتے ہیں لیکن ———
سچ کہہ دیں ——— تلخی جذبات اور پریشانی دل کے سوا
مصرعہ کا ایک لفظی نکتہ بھی حل نہ ہو سکا۔ خیر یہ ایک علاحدہ
داستان ہے۔ جسے اس جگہ چھیڑنا موزوں نہیں معلوم ہوتا۔
کہنا صرف یہ ہے کہ "آج یہاں، کل وہاں" کے سبب سے ڈاک
کا مستقل انتظام نہیں کیا جا سکا اسلئے جن احباب کے خطوط کا
جواب اب تک نہیں دیا گیا وہ ہماری سفری مجبوریوں پر نظر رکھ کر
ہمیں معاف فرما دیں تو بہتر ہے۔

"سب سے پہلی اور آخری درخواست" کرنیوالوں کو "روڈ اینڈ سنز
فوٹوگرافر اینڈ آرٹسٹ۔ دی مال۔ لاہور سے خط و کتابت
کرنی چاہئے بہارستان اس "درخواست" (حکم؟) کی تعمیل سے
معذور اور شرمسار ہے

اختر ——— اجمیر

شذرات

رین بسیرے کا تھیٹر

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند
چوں بخلوت مے روند آں کار دیگر میکنند

تصوف آباد دہلی کے صوفی عالی مقام کو تھیٹر نوازی کا بہت شوق ہے لیکن ادارت پرستانِ درگاہ کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ خود جناب خواجہ حسن نظامی صاحب کا عرفان کدہ راز بھی ایک عجیب و غریب تھیٹر سے کم نہیں ہے اگرچہ ہمیں افسوس ہے کہ اس طلسمی تھیٹر کا اصل حال جو حسن صباح کے نیرنگ زارِ الموت سے زیادہ پر اسرار تھا ع

ہم کب آئے جب تماشا ہو چکا!

کے مصداق اُس وقت معلوم ہوا جب کہ مولانا محمد علی صاحب قبلہ کی طلسم کشائی نے اُس "طلسم تصوف افشاں" کی تعمیر لطائف فتو کو ملیا میٹ کرکے، اُن سامری پرستان غفلت کیلئے ماتم و عبرت کا سامان مہیا کردیا جو ایک خضر جادہ حقیقت کے دھوکے میں ایک گم کردہ راہِ حجاز کی فریب کارانہ سراب آسائیوں کی پرستش کرتے رہے ہیں!

اس تھیٹر کی صحیح تاریخ اساس کا تو علم نہیں، البتہ اسکے موسس اعلیٰ کی طبع تصوف سنج کی تمثیل آرائیوں کی یاد اب بھی حافظہ نواز ہے۔ جن میں مسالک چشتیہ و نقشبندیہ کی پُر فریب نقلیں تو عام طور پر جلوہ ریز ہوتی ہی رہی ہیں۔ تاہم خصوصی تمثیل پیرائیوں کا ذکر بھی کچھ کم مایۂ دلچسپی نہیں ہے۔ یہ جوہر لطیف حسب جس انوکھے طریقے سے وقتاً فوقتاً بے حجاب ہوتا رہا ہے وہ تماشائیوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے، کہیں ذوقِ تماشا کی "آپ بیتی" کے قصیدوں سے تواضع کی گئی ہے کہیں کرشن بیتی سنا نا پسند فرمایا گیا ہے۔ ایک طرف وقتی ضرورت سے کرشن بیتی کے مصنف کا بھروپ بھرا ہے۔ دوسری طرف ایسی ہی مصلحت سے تبلیغ کا عصا سنبھالا گیا ہے۔

غرض کہ اس تھیٹر کا چیف ایکٹر بھی اپنے فن میں ماہر اور نہایت زبردست ماہر ہے۔ آج آپ اسے رعیت کی کرسی ادارت پر جلوہ گر دیکھیں گے، کل درویش، دین و دنیا، نظام المشائخ، منادی، غریبوں کا اخبار اور الا، بلا خدا جانے کتنے اخبار اور رسالوں کی ترتیب میں مصروف پائیں گے۔ ایک طرف وہ راجوں مہاراجوں کی خدمت میں عیاری آزما نظر آئے گا دوسری طرف ایک گدائے دلق پوش کی شان میں تعویذ گنڈے کرتا دکھائی دے گا۔ کبھی وہ تجارت کے ابتدائی مسائل

پر قلم اٹھائے گا۔ کبھی شبِ عروسی کے نکات غوامض
کے حل میں مصروف ہوگا چند روز ادھر وشملہ کی چوٹیوں
پر وائسرائے کے خدام درگاہ کے ہاں، سر بر آستان
مصرفِ تملق ہوگا، اور چند روز ادھر وہ مولانا محمد علی
کے خیر مقدم میں ایڈریس پڑھتا نظر آئے گا ——
—— غرض کہ اس قسم کے تھیٹر کو جس کا اسٹیج محض
ایک طبع چالاک پر قایم ہے، جس چالاکی مکاری اور
دغا و فریب کی ضرورت ہے وہ سب اسکے پیکر تصوف
امتزاج میں جمع ہیں۔ !

لیکن افسوس ہے کہ رین بسیرے کے تصوف کا
یہ عدیم المثال تھیٹر اب اجڑ چکا ہے جس اسٹیج کی مصنوعی
فضاؤں پر رات کو کاشانۂ روح الامین کا دہوکا ہوتا تھا
وہ اب محض چند سجدہ ہائے ریائی کا مدفن نظر آتا ہے
جن خوش حرکات نازنینوں کے چہروں پر بجلی کی
روشنی میں برکات کا نور برستا دکھائی دیتا تھا وہ سب
نمود و نمائش، مکر و زرق، اور فریب و ریا کی مصنوعی
تصویریں ثابت ہو چکی ہیں —— تاہم آڈئینس کی
ہما ہمی بدستور ہے۔ کیونکہ اسٹیج ابھی خالی نہیں ہوا
ہے —— !

اسٹیج پر اب بھی ایک شخص موجود ہے جسکی الوہیت
کا لباس اتر چکا ہے، جذب و تسخیر کے ہتھیار چھن چکے
ہیں، تصوف و تقدس کا عمامہ گر پڑا ہے۔ زہد و ورع کی
عبا تار تار ہوگئی ہے (اور وہ کبھی بھی سلامت نہ تھی)
مقبولیت کا عصا ٹوٹ چکا ہے، تاثیر کی آواز پست
ہوگئی ہے، اجابت کی تسبیح ہزار دانہ بکھر چکی ہے، اور کرامت
کا مقدس مصلا بھی نیچے سے کھسک گیا ہے خمار آلودہ
آنکھوں میں معصیت شبانہ کے نشے چھلک رہے ہیں
اور لانبی لانبی زلفوں کا بکھراؤ بدمستی دوش کی چھلیاں
کھا رہا ہے۔ چاکِ دامن آلودہ دامنی کا شکوہ سنج ہے
اور بندِ قبا کی پریشانی برسوں کے مصنوعی تقدس
کی میت پر فاتحہ پڑھ رہی ہے —— یہی اس تھیٹر
کا موسس اعلیٰ اور چیف ایکٹر ہے جو رات کی تمام نمائشوں
اور بناوٹوں سے بری، اس وقت اپنی اصلی حالت میں
بالکل "برہنہ درحمام"، نظر آ رہا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ
اس کوشش میں بھی ہے کہ پر پروازِ تصوف کا ایک
آخری زور صرف کر کے پھر ایک بار وہی نقاب پہن لے
جواب تک حاضرین سے اس کی اصل ہیئت کو چھپاتا
رہا ہے —— !

مگر یہ نہ ہوگا۔ اب یہ نقاب کبھی بھی درست نہ ہوگا۔
ایک ہاتھ کی جگہ ہزار ہاتھ ایک مکاری کی جگہ لاکھ
مکاریاں، کارآزما ہونگی تب بھی نہیں —— افریب
تقریر کی ابلیسانہ اثر آفرینیوں کے باوجود بھی درست نہ
ہوگا۔ رات کی کامیابی خواب و خیال سے زیادہ حیثیت

نہیں رکھتی۔ اب اس کی صورت اس کی آواز اسکی عبا قبا غرض کوئی چیز دھوکا نہیں دے سکتی، کیونکہ صبح حقیقت طلوع ہو چکی ہے اور واقعیت کی روشنی میں تماشائیوں نے آنکھ بھر کے اسکی اصل عریانیوں کو دیکھ لیا ہے اور اچھی طرح دیکھ لیا ہے ـــ اب تماشائیوں کے نعرہ ہائے تحسین نہایت مہیب لعنتوں کا لباس اختیار کر چکے ہیں۔ اور اگر مسلمانوں میں ایک ذرہ بھی احساس حقیقت ہے تو یہ لباس دائمی ہوگا ـــ!

خواجہ صاحب کی ہر قسم کی عشوہ طرازیاں عالم آشکارا ہو چکی ہیں اور جو باقی ہیں وہ عنقریب طشت از بام ہو جائیں گی، خواہ ان کو بے حجابی کیلئے مولانا محمد علی کا قلم موزوں نہ ہو کسی اور کا ہو، اور یہ ایسی تلخ صداقت ہے جس پر اب کسی بحث آرائی کی ضرورت نہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اظہار خیال کیلئے استعارہ نما اشارات روا رکھے ہیں لیکن خواجہ صاحب کے اس تھیٹر کا آخری پردہ اور جہاں تک ان کی جوابی کوشش کا تعلق ہے (ابتدائی پردہ) ضرور ایسی چیز ہے کہ اسکے ذکر میں، ذرا سادہ بیانی برتنے کی ضرورت ہے ـــ یہ چیز انکا "بیان" ہے ـــ

اس میں شک نہیں کہ بیان مسلمانوں کی دماغی تاریخ میں ایک خاص پایہ رکھتا ہے اگرچہ ہمیں افسوس ہے کہ اس پر مسلمانوں کی دماغی تاریخ ناز نہیں کر سکتی۔ تاہم ع

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہئے ـــ کے مصداق اس بیان میں مکاری، چالاکی، جھوٹ اور فریب وہی کو جس عجیب و غریب سلیقہ سے درپردہ انتہا کو پہنچایا گیا ہے، اور راز آفرینی کا جو حیرت انگیز اور گمراہ کن ملکہ دماغ فریب طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔ وہ اسقدر اہم، ایسا خوبصورت اور اتنا استعجاب انگیز ہے کہ ہم اس کی داد نہیں دے سکتے۔ مسلمانوں کیلئے یہ بہت ہی بڑے فخر کا مقام ہے کہ ان میں ایسی عجیب و غریب چالاکی اور عیاری کا ایسا ماہر اکمل الشخص موجود ہے جسکے سامنے شاید مدبرین یورپ کی عمیق ترین عیاریاں بھی کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ ہم خواجہ صاحب کو انکے بیان کی اس کامیاب حیثیت پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند لیکن ساتھ ہی اپنی نگاہ ادا شناس کی رسائی کی داد بھی چاہتے ہیں کہ

ہم نظر بازوں سے تو چھپ سکا جان جہاں
تو جہاں جا کے چھپا ہم نے وہیں دیکھ لیا

آخر ہم اپنے سیاست باز، تبلیغ باز، اشتہار باز، اخبار باز، تصوف باز، راجہ مہاراجہ باز، گورنمنٹ باز اور خدا جانے کیا کیا باز صوفی پاکباز کی خدمت میں نیک نیتی سے ایک مفید مشورہ پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے۔ کہ ان کی مصلحتیں جوابی بیانات کا جو راستہ اختیار کر رہی ہیں وہ "کعبہ" کے بجائے انکی حیثیت کو "ترکستان" لے جائیگا۔ اس لئے انہیں فریب تکلم کی ان عشوہ سنجیوں سے باز آکر وہ راستہ اختیار کرنا چاہئے جو انکے لئے موزوں ہے۔ اور اسکا ایک ہی نام ہے۔ یعنی توبہ ع

اب بھی جھکا دے سر کہ در توبہ باز ہے

اختر

اے عشق کہیں لے چل!

اے عشق کہیں لے چل! اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہہِ عالم سے، لعنت گہہِ ہستی سے
اِن نفس پرستوں سے، اس نفس پرستی سے
دور — اور کہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

ہم "پریم پُجاری" ہیں، تو "پریم کنھیا" ہے!
تو "پریم کنھیا" ہے، یہ پریم کی نیّا ہے!
یہ پریم کی نیّا ہے، تو اس کا کھویا ہے!
کچھ فکر نہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

بے رحم زمانہ کو اب چھوڑ رہے ہیں ہم
بے درد عزیزوں سے منہ موڑ رہے ہیں ہم
جو آس کہ تھی وہ بھی اب توڑ رہے ہیں ہم
اب تاب نہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

یہ جبر کدہ، آزاد افکار کا دشمن ہے
احرار کا مدفن ہے، ابرار کا دشمن ہے
اشرار کا مسکن ہے، اخیار کا دشمن ہے
چل! یاں سے کہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

آنکھوں تلے پھرتی ہے اک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن، مہتاب نما دنیا
جنت کی سی سرسبز اور شاداب نما دنیا
للہ وہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

سنسار کے اُس پار، اک اس طرح کی بستی ہو
جو صدیوں سے انساں کی صورت کو ترستی ہو
اور جس کے مناظر پر تنہائی برستی ہو
یُوں ہو تو — وہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

برسات کی متوالی گھنگھور گھٹاؤں میں
کہسار کے دامن کی مستانہ ہواؤں میں
یا چاندنی راتوں کی شفاف فضاؤں میں
دل چاہے وہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

ان چاند ستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
اِن نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی نہروں میں
ٹھہری ہوئی نہروں میں سوئی ہوئی لہروں میں
اے خضرِ حسیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اک ایسی بہشت افشاں وادی میں پہنچ جائیں
جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپائیں
اور جس کی بہاروں میں جینے کے مزے آئیں
لے چل تو وہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

اے عشق کہیں لے چل

اختر شیرانی

BAHARISTAN



اے عشق کہیں لے چل

BAHARISTAN



لسان الاسرار مولانا احسن لکھنوی

بہارستان

جلد ۲ جنوری ۱۹۲۷ء نمبر ۱

نامۂ احسن

ناٹک ساگر پر ایک اجمالی تبصرہ

اُردو سٹیج کے متعلق قیمتی معلومات

ہمارے بعض نئے پرانے ڈرامے اور ڈراما نگار

ہندی اور اُردو گانوں پر ایک اہم محاکمہ

(لسان الاسرار حضرت علامہ سید مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی کا گرامی نامہ)

اختر شیرانی کے نام

ہمارے مکرم صاحبزادہ محمد عمر و نور الٰہی صاحبان کی تصنیف لطیف "ناٹک ساگر" باعتبار تعارف، ہماری خامہ فرسائی کی محتاج نہیں ہے۔ البتہ اس کی بعض ایسی ادائیں، جن کا تعلق، اردو ڈراما اور اس کے متعلقات سے خاص ہے، ایک حد تک نظر انتقاد کی تشنہ ہیں۔ لیکن ان معاملات کے رد و قبول پر قلم اُٹھانے کی ہر ایک نقاد کو جرأت بھی نہیں ہو سکتی کہ یہ حق صرف انہی ارباب علم کو ہے جن کی عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔ اور جنہیں افراد و مباحث متعلقہ کے مطالعہ کا بہترین اور بہت زیادہ موقعہ ملا ہے ——— اس لحاظ سے قبلہ مولانا احسن لکھنوی کا نامہ گرامی مخصوص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس سے بہتر اس موضوع پر کوئی سند نہیں ہو سکتی ———!

اس خط میں، جیسا کہ ناظرین ملاحظہ فرمائینگے، صرف "ناٹک ساگر" پر ہی اجمالی نظر نہیں ڈالی گئی ہے، بلکہ ضمناً ہمارے بعض ایسے سوالات پر بھی توجہ فرمائی گئی ہے جن کے جوابات سے مولانا اور بعض دوسرے ڈراما نگاروں کے متعلق، اہم معلومات حاصل کئے جا سکتے ہیں، ہر چند مولانا نے، جہاں تک آپ کی اپنی سوانح عمری کا تعلق تھا، ہماری درخواست کی کامل طور پر پذیرائی نہیں فرمائی، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں، کہ "اب کہاں اس کا موقعہ ہے، کہ میں اپنے سوانح اپنے ہاتھ سے

لکھوں، اگر صحت ہوگئی تو دیکھا جائیگا، ضعف بڑھ رہا ہے مجھ سے کوئی امید نہ رکھو، اور دعا کرو" تاہم اس تکلیف کے باوجود آپنے اپنے بعض ہم عصروں کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ انکی خاص قدر و قیمت کا مستحق ہے ——— !

ڈراما کے اصول فن اور اس کی تکمیل و تعمیل کا جہانتک تعلق ہے، مولانا اردو میں اس فن جلیل کے "سوسس ادیس" کا درجہ رکھتے ہیں، اور تذکرہ نگاروں کو جب کسی ایسے نام کی تلاش ہوگی جس نے اردو ڈراما کی اصولی اور حقیقی علاقوں کو خلاف درندی فطرت کی تلخیوں سے پاک کیا، تو وہ صرف مولانا کا نام نامی ہوگا، آپکی ڈراما نگاری کی تربیت دیق کا آغاز تقریباً ۱۸۸۵ء کے قبل سے ہوتا ہے، اور یہ نصف صدی کے قریب طویل عرصہ ڈراما اور اسکے لوازم کے متعلق جس قدر گراں بہا تجربوں اور اہم سابقوں سے لبریز ہوگا، اہل نظر بخوبی اندازہ فرماسکتے ہیں، اس اعتبار سے جب ایک ایسی جلیل القدر اور گرامی مرتبت شخصیت اپنی یاد داشتوں کی کتاب کے بعض ضروری اوراق الٹ کر ڈراما کے شائقین کے سامنے رکھدیگی، تو وہ کیسے کچھ مفید معلومات سے بہرہ اندوز ہوسکینگے، محتاج بیان نہیں ——— !

تبصرہ اور معالات سے قطع نظر اسدو اور ہندی گانوں پر مولانا نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ بساط ڈراما کے تازہ واردوں کے لئے خصوصیت سے قابل توجہ اور سبق آموز ہیں، زیادہ تر اس لئے بھی کہ مولانا فن موسیقی میں بھی ید طولی رکھتے ہیں، اور ڈراما کی "موسیقیانہ" حسن کی نزاکتوں کو دوسروں سے بہتر سمجھتے ہیں بلکہ اس عالم میں کوئی ہمعصر آپکا حریف نہیں ہوسکتا ——— !

یہ خط "بستر جراحت" پر لکھا گیا ہے، اسلئے اس سے بعض نگاہوں کو مولانا کی انشاء لطیف کی گلفشانیوں کی توقع نہ ہوگی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس لحاظ سے بھی یہ ان کی توقعات سے کہیں زیادہ ——— ہے! اور ہمیں اگر "ایاز" کی "قدر شناسی" کی غایت۔ تعلّی نہ ہوتی، تو یہ لکھنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی، کہ اس "کوزہ" میں بھی بدستور سابق مولانا کے ادب العالیہ کی رعنائیوں کا ایک "بحر بیکراں" موجزن ہے ——— !

یہ خط تقریباً ۱۸ صفحات پر محیط ہے اور شائد "بہارستان" کی دو اشاعتوں میں ختم ہوگا۔ ساتھ ہی ایک اور تحریر جو (ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ناٹک ساگر کے بعض اور بیانات پر ہونی چاہیئے) ہمارے قلم سے ہوگی، اور یہ انشاءاللہ سلسلہ کی تیسری اشاعت میں نظر سے گذریگی، اس سے بعض ایسے مباحث سامنے آجائینگے جن کی بیحجابی سے (ہمارا جہانتک خیال ہے) مولانا نے مصلحتاً پہلو بچانا مناسب سمجھا ہے !

آخر میں ہم مولفین ناٹک ساگر کو ان کی اس خوش نصیبی پر مبارکباد دیتے ہیں، کہ ان کی کتاب کو ایک ایسے فرد اکمل کی نظر استفاد نصیب ہوئی جس کی ایک حقیر سی نیم نگاہی کا اشارہ بھی ہزاروں نازشوں کا سبب ہوسکتا ہے بقول لسان الغیب حضرت خواجہ حافظ شیرازی ؒ ؎

کیمیائے است عجب بندگی پیر مغاں   خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

اختر

(۱)

بیار بادہ کہ مینائے عمر لبریز است !

مریض را دم آخر چہ جائے پرہیز است ؟

اختر سلمہ۔ ناٹک ساگر کو میں نے بالاستیعاب دیکھا۔ یہ گرانمایہ   تصنیف قابل قدر ہے، فن ڈراما کے اصول و متعلقات پر کافی بحث

کی ہے، ڈرامہ کی تاریخ قدیم کو قطرہ قطرہ جمع کر کے فی الحقیقت ساگر (سمندر) بنا دیا ہے۔ جو لوگ فن تصنیف و تالیف سے آگاہ ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تالیفات کی تدوین و شیرازہ بندی ایک اہم کام ہے، ادبیات کے جوہری اس خزانہ کو بیش بہا جواہرات سے لا مال پائیں گے مصنفین کو بصیغہ تہنیہ مبارکباد دینا چاہیئے، کہ ہندوستان میں یہ پہلی کتاب ہے۔ جو ڈراما نویسوں کے عمل مبتذل کی تکذیب کرتے ہوئے، اہل علم کو گرانبار احسان بنا رہی ہے، مصنفین ناٹک ساگر نے ہندوستان کے ڈرامہ نویسوں پر وہ احسان کیا ہے۔ جو اہل جرمن نے شکسپیر کے رخ پر کیا تھا، اتنی بڑی حجیم و ضخیم کتاب کا اسطقس درست رکھنا علمبرداران فن ادب کا کام تھا، جو اپنی ماحول سے موضوع کتاب پر پوری روشنی ڈال رہا ہے، رعنائی خیال دلفریبی الفاظ من حیث الادب ہر قلب پر اپنا سکہ بٹھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ واقعات و واردات کتاب کو ہر دلعزیز بنانے کیلئے فصاحت کے آب حیات میں ڈوبا ہوا لب و لہجہ پسندیدہ و ممتاز ہے نثر کی مستانہ روش بلاغت و جزالت کی موجوں پر کروٹیں لیتی ہوئی بحر ناپیدا کنار ادب کے فاصلہ لامتناہی کو طے کرنے میں دیدہ مشتاق کے تارنظر کو اپنی قوت جاذبہ سے کھینچ رہی ہے، اردو کو چار چاند لگانے کیلئے ایسے اہل قلم سرمایہ ناز ہیں جن کے جذبات کی زمانہ مستقبل قدر کریگا، موضوعات ڈرامہ پر یہ کتاب ایسی مشرح و منقح ہے کہ مخالف و موافق تبصرہ نویسوں کا فیصلہ چھان بین کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی دکھا دیگا۔ بہت بکار آمد نتائج پیدا ہونگے، غلط فہمیوں کے پردے اٹھینگے، طرفداریوں کے راز افشا ہونگے شخص پرستی کے عقدے کھلینگے پارٹی بندی کے جذبات ظاہر ہونگے۔ انصاف کے عارض روشن سے نقاب اُٹھے گی !

ہندوستان کے ڈرامہ نگاروں کی خصوصیات کا علم زیادہ تر مصنفین کو بالواسطہ ہے بالذات نہیں ہے، اس وجہ سے کیرکٹر لکھنے میں، جو فروگذاشت ہوئی ہے وہ بہت زیادہ قابل توجہ نہیں مورخ اور تذکرہ نویس کی تصنیف فانیات کے اثر سے بہت کم پاک صاف ہوتی ہے۔ بااین ہمہ یہ محنت رائگاں جانے کے قابل نہیں اور زبان ستائش خاموش نہیں رہ سکتی !

ایک تبصرہ نگار کی حیثیت سے مجھے تصویر کے تاریک پہلو پر بھی نظر ڈالنے کا حق ہے، تاریخی فروگذاشت کو میں اپنی چہل سالہ معلومات سے روشنی میں لاؤنگا، اور ایسی حالت میں کہ جب کوئی خاص جذبہ محرک انصاف طلب ہے۔ میں اپنی محفوظ رائے کو معرض اعلان میں لانے کیلئے پس و پیش نہ کرونگا !

انگریزی ڈرامہ نگار

ناٹک ساگر میں مغربی اہل قلم کا تذکرہ ضرورت سے زیادہ اور سودیشی معلومات کا سرمایہ بہت کم ہے۔ بیدار قوم کے حالات لکھنے میں اس وجہ سے آسانی ہوتی ہے۔ کہ کملائے قدیم کے کمالات کا میٹیریل کثرت سے مل جاتا ہے مصنفین کے قلم کا مقتضا یہ تھا، کہ اپنی قوم کے کارنامہ لکھنے کیلئے بحر عمیق سے موتی نکالے جاتے، حالانکہ یہ نہیں ہوا۔ میں آگے چل کر ثابت کرونگا۔ کہ مصنفین کی تاریخی معلومات ہندوستان کے ڈرامہ نگاروں کے متعلق بہت ہی سطحی اور نہایت محدود ہے، اور حاضرہ کے اہل عمل کا تقابل کر کے ہر فرد کی خصوصیات کو نمایاں نہیں کیا گیا۔ جو کچھ سامنے پڑا ملا۔ اُٹھا لیا، اس سہل انگاری و تن آسانی سے فن تذکرہ نویسی کو نقصان پہنچا ہے مگر ع

عمرت دراز باد کہ اینہم غنیمت است

بمبئی کا پہلا سفر

میں ۱۹۱۳ء میں پہلے پہل بمبئی پہنچا ہوں، مسٹر رتن جی دادا بھائی ٹھونا جو دنیائے ڈراما کے بابا آدم سمجھے جاتے ہیں ان کی ملازمت کا فخر مجھے سنہ مذکور میں حاصل ہوا۔ دادا بھائی آنجہانی چترا بکاولی کی طرز نگارش کے والہ و شیدا تھے، منشی کریم الدین صاحب کے انتقال کے بعد وہ ہندستان کے گوشہ گوشہ میں ڈرامہ نگاروں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ اس تلاش میں ایک مرتبہ میں ان کو مل گیا۔ اور چترا بکاولی کا نمونہ پیش کر کے مجھ سے اسی زبان میں ڈرامہ لکھنے کی فرمائش کی گئی، میرا پہلا ڈراما جو کسی مالک کے اندر کرشمۂ دل لکھا گیا وہ چندراولی ہے صاحبان مذاق سلیم جانتے ہیں۔ کہ چترا بکاولی کی چٹخارے دار زبان کا جواب چندراولی میں موجود ہے میرا مذاق خاص نہ تھا، میں نے اس خدمت کو اپنے مالک کی پابندی خیال کے ساتھ ساتھ ادا کیا ہے اور اس کے بعد مقتضائے وقت کا اتباع کرتا رہا؛

میرے ڈراما طرز نگارش و سیاق ادبیت میں اس قدر متباین ہیں۔ کہ ہر شخص یہ بات قبول کرنے کو طیار نہیں ہے۔ کہ جس مصنف نے چندراولی لکھا ہے، اسی کے قلم سے خون ناحق عالم وجود میں آیا ہے ان منزلوں کو بہت عمیق خیال والے طے کریں گے۔ بہر کیف جب میں پہلے پہل بمبئی پہنچا ہوں، تو پیشرو وہاں معرکۂ ڈراما نگاری کے نقش قدم تازہ تھے، اور وہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے، ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے + کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

ان زباں آوروں کو موت نے خاموش کر دیا تھا۔ اور وہ اہل اکرائے کی تحسین و نفرین سے مستغنی ہو کر عالم روحانی میں آسودہ حال تھے جی چاہتا ہے کہ منشی کریم الدین صاحب کی وہ تصویر بھی قارئین کے سامنے پیش کر دوں، جو میرے ایک دوست نے کسی قدر الفاظ کے ذریعہ سے میرے سامنے کھینچی تھی۔

منشی کریم الدین

سن شریف ساٹھ سال کے قریب تھا سالولا رنگ۔ میانہ قد لاغر اندام۔ ڈھیلا بر دار پائجامہ در دامن کوٹ کا انگرکھا۔ دلی کا سادے چمڑے کا جوتہ ایک رومال گز بھر لانبا کاندھے پر پڑا رہتا تھا، چہرہ پر پوری ڈاڑھی نہایت زندہ دل ظریف شوخ مزاج شخص تھے یہ ان کی تصنیفات سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ فن موسیقی سے فی الجملہ ماہر تھے، ستار بھی بجاتے تھے اپنے تماشوں میں ہندستان کے پرانے ہندی نولیسوں کی شہرہ ٹھمریاں جو یاد تھیں، کدریا، بسند پیا تاآں پیا وغیرہ کی محل وقوع سے اس کا جو گلبند کر کے تمام سرمایہ صرف کر گئے۔ اپنے بعد آنیوالوں کیلئے کچھ نہیں چھوڑا۔ استعداد علمی بہت معقول تھی، تصنیف گواہ ہے۔ بعض بعض مقام پر صنائع بدائع بھی صرف کر گئے ہیں۔ میں انشاء اللہ مختصر نمونہ پیش کروں گا ان کے تماشے نہایت دلچسپ ہیں، راقم کے استاد روحانی ہیں میں نے چترا سے سبق لیا ہے۔ جیسا کہ میں اوپر بیان کر آیا ہوں، ان کا کمال قابل تقلید تھا، وہ وہی ڈرامہ نگار تھے، ایک مشرقی شاعر میں فطرت نگاری کا جوہر قدرت کی جانب سے ودیعت تھا۔ وہ اک طرز جدید کے مخترع تھے، اور ڈراما کی دنیا میں ان کا وہ درجہ ہے جو شاعری کی دنیا میں میر تقی میر کا۔ ان کے ڈراما آج بھی اگر کسی سلیقہ شعار ڈائرکٹر کے ہاتھ سے تمثیل کئے جائیں۔ تو نسل کے

کرنے میں ذرا بھی تکلف نہ ہوگا۔ استداد زمانہ نے ان کی زبان پر کوئی اثر نہیں کیا۔ حال کے ڈرامہ نگار ادب کی اس شوخی سے آج بھی محروم ہیں جو ان کیلئے متماز ہے،

خاندان امان خداداد چترا بکاؤلی ان کے کارنامہ ہیں

وہ پچاس برس قبل وہ کام کر گئے ہیں جب کی باعتبار رفتار ترقی آج یعنی پچاس برس کے بعد امید کی جاسکتی تھی۔ عورتوں کی زبان محبت کے سین سہیلیوں کی شوخی۔ دربار نسوانی کی مہذب طرح نقشے کھینچنے میں ان کا قلم سبق آموز تھا، لگاوٹ اور اسرار افسانہ لکھنے کے وقت وہ رینالڈ کے خیال کی جھلک دکھاتے ہیں۔ وہ ایک صدی پیشتر پیدا ہوئے اور نصف صدی قبل مر گئے۔ ان کی پیدایش ۱۹ انیسویں صدی کی متقاضی تھی لیکن قدرت کے کارخانوں میں کسی کو دخل نہیں۔ ان کی تقریریں تاثیر سے لبریز ہیں۔ ان کی نثر فصاحت سے ممزوج ہے، ان کا خیال ترفع سے وابستہ ہے ان کا کمال محاسن سے مالامال ہے اگر وہ زندہ ہوتے تو سفید ڈاڑھی کے سامنے سیاہ موچھوں والوں کا چراغ نہ جلتا دنیا مردہ پسند ہے لیکن مرنے کے بعد بھی اس صاحب کمال کی قدر نہ ہوئی۔ عبرت اور افسوس ع۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

صنائع و بدائع کی مثال } بکاؤلی کی سہیلیاں بکاؤلی کے آدم زاد پر عاشق ہونے کی وجہ سے طعن و تشنیع کرتی ہیں؛

۱۔ کور کوائے نظر کیا شکل نیکوکار کی
۲۔ مور کو ہونے لگی افسوس لعنت مار کی
۳۔ گور سی آخر حویلی شاہ خدمتگار کی

اندر۔ دور ہو مردار کہلاتی ہے غیرت دار کی

پہلی سہیلی۔ پانی سے ہوا اور خاک سے انسان کو سانا
۲۔ پھر کس لئے ہم سب نے سلیمان کو مانا
۳۔ مخلوق میں افضل ہی بنی جان کو جانا

جو کچھ یاد آگیا۔ مثال کے طور پر لکھدیا۔ ایسے جواہر ریزے ان کے کلام میں بہت ہیں۔ نظر قدر شناس کی ضرورت ہے!

حسینی میاں ظریف } یہ ڈراما نگاروں میں سینیر ہیں۔ ایک پارسی خانصاحب کا نام بھی ان کے نام کے ساتھ سننے میں آتا ہے، انکو میں نے چشم خود دیکھا ہے جسیم و تہیم ملبند بالا وجیہ آدمی تھے، جب میرا عنفوان شباب تھا، تو یہ بزرگ اسی سال کے قریب تھے، لیکن بڑھاپے کی کمزوری نے قوٰی و جوارح پر کوئی اثر نہیں کیا تھا، پیری کا اضمحلال نہ تھا ہوش و حواس میں اختلال نہ تھا، ظریف زندہ دل تھے، مسٹر نوروزجی پری کے خاص منشی تھے، شاید کسی زنیکلر اسکول کے مدرس بھی تھے، وہ تین روز میں ڈراما لکھدیتے تھے، اصول فن سے اس قدر ناواقف تھے، جو کچھ کہتے تھے، وہ خود بھی نہ سمجھتے مسٹر نوروزجی خشونت مزاج کی بابت ایک مشہور شخص تھے، منشی ظریف سے جبری کام لیا جاتا تھا، اور بہر حال فرمایش پوری کئے بغیر چارہ کار نہ تھا، مسٹر نوروزجی کا مقصود حصول منفعت تھا، ان کو محاسن ڈراما سے کوئی غرض نہ تھی، اس سے ظریف صاحب کی تصنیف کی تعداد زیادہ ہے۔ لیکن ان کے کمال کا ذکر کسی زبان پر نہیں ہے۔ حیات و ممات میں شہرت و مقبولیت سے محروم رہے کسی بڑی کمپنی میں کام نہیں

کیا یا بڑی کمپنیوں کے مالکوں نے کام نہیں لیا؟

منشی رونق مرحوم ان کو میں نے نہیں دیکھا، جب میں بمبئی پہنچا ہوں تو یہ بزرگ مر چکے تھے مگر ان کے ڈراموں کی شہرت ہندوستان کے مختلف شہروں میں پہنچی ہوئی تھی، مصنفین ناٹک گر نے ان کو پارسی لکھا ہے۔ گر میری معلومات میں یہ دکنی تھے، ان کا اب تک بمبئی کے ساکنوں سے بہت ملتا جلتا ہے۔ منشی رونق صاحب کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت ذکی نہایت طبیعت دار اور نئے جدید الذہن تھے، فی الجملہ جوہر علم ... آراستہ نظر آتے ہیں تخیلات شاعری ارفع اعلیٰ تھی، ان کی نظم بحیثیت تخیل پاکیزہ و گرانقدر ہے۔ مگر بحیثیت زبان و فن کمزور ہے زبان اردو کی خامی جابجا محسوس ہوتی ہے لیکن جذبات انسانی کے مصور ہیں، ان کے کلیات کو شیخ عبداللہ صاحب نے اصلاح دیکر اپنی ملک بنا لیا ہے اتفاقات سے ان کو پلاٹ بہت اچھے اچھے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں محمود شاہ کا تماشا گل رسیدہ ہے اس اعتبار سے کہ یہ قصہ ایک ہی رات میں ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی تمام افسانہ ایک ہی رات کا واقعہ نہایت عمدہ صنعت ہے۔ شاعر عموماً عاشق مزاج ہوتے ہیں اس خصوصیت سے جناب رونق بھی محروم نہیں رہا جاتا ہے، کہ عاشق کا خون لکھ رہے تھے، اور کسی محبوب کے ستائے ہوئے تھے، جفا شعار معشوق کی کج ادائی کی تاب نہ لا سکے، اور استرے سے گلا کاٹ کر مرگئے۔ عاشق کا خون نکلنے سے پہلے خون عاشق کی خبر باہر نکلی۔ ہرمزد جی بلی کی زبانی واقعات قلمبند کئے ہیں واللہ اعلم بالصواب ان کے شاعرانہ تخیلات ہندوستانی ترنم سے بالاتر ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو خود فی الجملہ علم انگریزی کے ماہر تھے، یا کسی ذریعہ سے ان کو مغربی اہل قلم کے ترجمے مل جاتے تھے، یہ نکتہ بہت عمیق ہے، ذکی الحس شاعر فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ ترجمہ کسی انگریزی خیال کا ہے کیونکہ ترجمہ یکتائی قبول کرنے کے بعد اپنے منقول عنہ کی جھلک دیتا ہے مگر یہ میدان ارباب تحقیق کا حق ہے ان کے ڈراما میں غزلیں بھی ہیں۔ اور غزل کی زمین تجویز کرنے میں ان کو ایک خاص ملکہ تھا،

منشی مراد علی مراد مرحوم یہ الفریڈ کمپنی کے پرانے ڈرامہ نویس تھے، الفریڈ کمپنی سے نیو الفریڈ کمپنی کی شاخ پھوٹی۔ تو یہ نیو الفریڈ کمپنی میں آگئے، یعنی سہراب جی کے زیر حکومت کام کرتے رہے، بہت معمولی پڑھے لکھے تھے، کثرت مشق میں موزونیت پیدا ہو گئی تھی، اب تک کہیں کہیں غیر مانوس بحروں میں غوطہ کھا جاتے تھے، بڑے تنک مزاج اور زود رنج آدمی تھے، اور یہ جاہلوں کی صفت مخصوص ہے میں نے اور مراد نے، ایک عرصہ تک نیو الفریڈ کمپنی میں ساتھ ساتھ کام کیا ہے، ان کی تنک مزاجی کے متعلق ایک قصہ یاد آگیا بہت مضحکہ خیز ہے، ایک بار دہلی کے سفر میں ہم دونوں کیلئے ایسے کمرے ملے۔ جو متصل تھے۔ ایک کمرہ میں بات کی جائے۔ تو دوسرے کمرہ میں آسانی سے آواز جا سکتی تھی، اتفاقاً دلی کے دو تین شاعر میری ملاقات کو آئے اور حسب دستور زمانہ بعض میرے ڈراما کی تعریف کرتے رہے۔ ان کے چلے جانیکے بعد جناب مراد نے شکوہ کیا۔ اور سختی سے فرمایا۔ کہ یہ بات اچھی نہیں ہے کہ جو آپ سے ملنے آتا ہے وہ آپ کی تعریف کرتا ہے۔ تو کیا آپ منشی ہیں اور میں گھاس کھودتا ہوں، اس حماقت آمیز شکایت پر مجھے بجائے غصہ ہنسی آگئی

اور میں نے کہا۔ کہ آئندہ میں ایسے لوگوں کو روک دونگا۔ اس مرتبہ معاف کیجئے۔ میرے معذرت سے مراد علی صاحب کا کسی قدر غصہ کم ہوا۔ اور اللہ اللہ کر کے اپنے آپ میں آئے جہالت کیا بُری چیز ہے۔ یہ فیض آباد کے رہنے والے تھے، ان کے والدین سفر کر بلا سے ملی میں واپس ہو کر بمبئی میں رہ گئے، اور یہیں انتقال کیا مراد صاحب اس وقت بہت کم سن تھے نجابت علیشاہ صاحب ایک فقیر منش بزرگ تھے انہوں نے ان کی پرورش کی۔ اور کچھ تعلیم بھی دی، بمبئی میں اس وقت اتنے لکھے پڑھے آدمی بھی عنقا صفت تھے خصوصاً تھیٹر کمپنی والوں کو اتنی استعداد کا آدمی بھی غنیمت تھا، کہ کچھ نظم و نثر لکھ لے۔ یہ الفریڈ کمپنی کے ڈرامانٹسٹ مقرر ہوئے۔ اور پھر اسوقت سے تادم مرگ یہی کام کرتے رہے۔ آخر میں نیو الفریڈ کمپنی سے ترک تعلق کر کے مسٹر جوزف ڈیوڈ کیساتھ کسی کمپنی میں کام کرتے رہے، انہیں کثرت مشق و عمل سے ڈرامہ نویسی کا کافی ملکہ ہو گیا تھا، صاحب تصنیف کتب ہیں اور آخر میں چھپی بکری کی ہیں۔ مگر بہرحال یہ جہالت کی جھلک موجود ہے زبان اہل بمبئی کی سی تھی، فصحائے دہلی ولکھنو کی طرح بات کرنا چاہتے تھے، مگر سوجھ باقی رہتی تھی۔ اپنے آپ کو کسی سے کم نہیں سمجھتے تھے شعرا ئے ماضی و حال کے مطبوعہ دیوانوں سے کام نکال لیتے تھے، کہیں کہیں اپنی گرہ کا بھی صرف کرتے تھے، لیکن ذاتی مال خود بتا دیتا تھا، کہ میں جناب مراد کے جیب خاص کا سرمایہ ہوں، انہوں نے آخر زمانہ میں منشی کریم الدین صاحب کے زبان کا چربہ اتارنے کا ارادہ کیا تھا، مگر نظم مائل سے مجبور ہو گئے، نقل کرنے کو بھی لیاقت درکار ہے۔ تہی دامنی نے نام آوری سے محروم رکھا، ان مرحوم کے ایک تماشہ "فسانہ عجائب" نے بڑی شہرت پائی، میں نے جب یہ تماشہ اول مرتبہ دیکھا، تو میں حیران تھا، کہ الٰہی یہ کیا بات ہے۔ الفاظ کا ترنم منشی کریم الدین کی آواز باز گشت معلوم ہوتا تھا، آخر معتبر ذرائع سے معلوم ہوا۔ کہ یہ تماشہ کریم الدین مرحوم کے کسی وارث سے بریلی میں مول لیا گیا، اور جناب مراد نے اس کی کڑیاں ملائیں یہ ڈرامہ ان کی تصنیف میں کارنامہ ہے۔ جو کچھ تھے غنیمت تھے ایسے وقت میں کہ جب ہندوستان میں ڈرامہ کیلئے کوئی اسکول نہ تھا، ہر شخص اپنے دماغ کی قوت سے کام کر رہا تھا، جس کو جو راستہ پسند آیا، وہ اختیار کیا، اسٹیج کے اداب سینری کی خوبی ڈرامائی زبان۔ افسانہ کی ترتیب سے کوئی واقف نہ تھا قدما نگاروں میں طوائف الملوکی تھی، مذاق سلیم نے جس کی مدد کی اور فطرت نگاری نے جس پر الہامی سایہ ڈالا۔ وہ چل نکلا؛

منشی و نائک پرشاد طالب بنارسی آنجہانی

طالب آنجہانی کے تاریخی حالات بالذات، اور بالواسطہ دونوں طرح میں لکھونگا، بالواسطہ ان کے حالات مسٹر اڈیل جی سیلانی آنجہانی نیو الفریڈ کے نامی گرامی ایکٹر کی زبانی لکھے جاتے ہیں، دور ثانی میں ان کا اسٹیج یعنی وکٹوریہ کمپنی کا اسٹیج ناولٹی تھیٹر قلعہ میں واقع ہے، ۱۸۹۸ء میں میرا دوسرا دورہ بمبئی کا ہوا اور یہی وہ زمانہ ہے، جب "خون ناحق" کا ڈرامہ ہنگامہ حشر کو بغل میں دبائے ہوئے ناولٹی تھیٹر میں نمودار ہوا، اور دنیا کی نگاہیں اس نئی دنیا کی طرف اٹھ گئیں، میں نے خون ناحق کے بعد "بزم فانی" نکالا، اور بوجوہ چند کاؤس جی سے علیحدہ ہو کر

نیو الفریڈ کمپنی میں ملازم ہوگیا، "دل فروش" زیر تصنیف تھا۔ کہ کاؤس جی کی کمپنی دہلی روانہ ہوگئی۔ اور مسٹر بالی والا سفر حیدرآباد سے واپس ہوکر اپنے تھیٹر یعنی ناولٹی میں براجمان ہوئے اس وقت میں منشی طالب صاحب کے پاس کبھی کبھی جاتا تھا، اور یہیں سے ملاقات کی ابتدا ہوئی۔ خود مسٹر خورشید جی بالی والا بہت عنایت فرماتے تھے، اور جب میں جاتا تھا، سب خلاق سے ملتے تھے، وکٹوریہ کمپنی کے اور بھی تمام آدر ایکٹروں سے ملاقات ہوئی، اکثر اتوار کو دن کے تماشہ میں میرے جانے کا اتفاق ہوتا تھا، بعد ختم تماشہ تا قبل شروع تماشہ حضرت طالب کے کمرہ میں غپ شپ اڑتے رہتے تھے، طالب بقدر ضرورت انگریزی سے بھی واقف تھے، مسٹر سیلانی کہتے تھے کہ جناب طالب کلکتہ کے پوسٹ آفس میں ملازم تھے، مضمون نگاری کا ان کو ہمیشہ سے شوق تھا، الفنسٹون کمپنی کے بعض ایکٹروں سے اور ان سے ملاقات ہوگئی تھی کبھی کبھی کمپنی میں آتے رہتے تھے، سیلانی نے انکو ڈرامہ نویسی کی طرف توجہ دلائی۔ یہ اکثر کچھ لکھ لاتے تھے، اور دوستوں کو سناتے تھے، اس زمانہ میں بالی والا کو ایک منشی کی ضرورت تھی، سیلانی نے بذریعہ مراسلت ان کی سفارش کی، طالب وہاں پہنچے، اور بعد امتحان حضرت رونق کی کرسی پر رونق افروز ہوگئے۔ طالب دوسرے ڈرامانگاروں کی طرح مغرور و خود پسند نہ تھے۔ بڑے خلیق و متواضع اور شریف الطبع آدمی تھے، خود نمائی کی عادت نہ تھی، گھر سے بہت کم نکلتے تھے، اور اگر کبھی نکلتے تھے تو قلعہ کے حصہ میں سمندر کے کنارے پالو وغیرہ پر بغرض تفریح وسیر چلے جاتے تھے، شہر کے آباد حصہ میں یعنی گرانٹ روڈ کتب بازار وغیرہ میں میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا۔ اور نہ کسی کمپنی کے تماشوں میں ان سے ملاقات ہوئی، جس طرح اور ڈرامہ نگار دوسری کمپنیوں میں تماشہ دیکھنے کیلئے فری طور پر جاتے رہتے تھے اس طرح ہم نے طالب کو کبھی نہیں دیکھا۔ قریب قریب زاویہ نشینوں کی زندگی بسر کرتے تھے، خود نمائی ان کا شعار نہ تھا، میں نے ان کو بمبئی کے کسی مشاعرہ میں بھی نہیں دیکھا، ان کو اردو ادب کے رسالوں میں مضامین لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اس شوق کو وہ کلکتہ سے اپنے ساتھ لائے تھے، اور مرتے مرتے جاری رہا، پنجاب کا نامور رسالہ (مخزن) ان کے مضامین سے لبریز ہے۔ میرے خیال میں انہوں نے مضامین کا مخزن کیلئے استمراری التزام رکھا تھا، نوجوانان پنجاب کی نظروں میں ان کی بہت وقعت ہے اور پنجاب میں ان کا بہت اثر ہے۔ دہلی اور لکھنو یہ دو شہر زبان کے ٹکسال سمجھے جاتے ہیں۔ زبان کے اعتبار سے ان اردو آفرین شہروں میں سوائے الفریڈ اور نیو الفریڈ کمپنی کے کسی دوسری کمپنی کا چراغ نہیں جلا، مسٹر بالی والا نہایت ہوشیار اور آزمودہ کار شخص تھے، ان کو اس بات کا تجربہ ہوگیا تھا، کہ ہمارے اردو ڈرامہ کے اسٹائل ان شہروں میں مطبوع خلائق نہ ہوگی، اور وہ اس کا امتحان کر چکے تھے، اسلئے انہوں نے پنجاب کو اپنا مستقر قرار دے لیا تھا، بمبئی سے جب کبھی ان کی کمپنی اٹھی۔ تو اس نے لاہور امرتسر کا رخ کیا، اور ان شہروں میں مسٹر بالی والا نے بہت کامیابی حاصل کی، دہلی اور لکھنو کے نکتہ چین زبان کی ذرا سی کمزوری کیلئے ڈراما کی گوناگوں محاسن کو ملیامیٹ کر دیتے ہیں، اور تماشا ختم ہونے کے بعد اسٹیج سے کوئی مصرعہ یا فقرہ

ذمہ آلود لئے ہوئے باہر نکلتے ہیں خصوصاً اہل لکھنو کی اس قدر سختی میرے نزدیک خلاف انصاف ہے۔ مگر کیا کیا جا سکتا ہے یہ نکتہ جب مالکان کمپنی کی سمجھ میں آگیا۔ وہ نقصان سے محفوظ ہے، چنانچہ الفسٹون کمپنی نے بھی ایک مرتبہ ہڑک کھا کر دوبارہ لکھنو کا رخ کیا!

اگر ڈراما اپنی خصوصیات ادب و زبان میں مکمل ہے تو اہل لکھنو کے لئے سینری پر روپیہ صرف کرنا فضول ہے اور اگر ڈراما کی تصنیف میں کمزوری ہے۔ تو جواہرات کا لباس اور حیرت انگیز سینری سب بیکار ہے۔

لہذا مسٹر بالی والا کو ملک پنجاب راس آگیا تھا اور وہاں ان کے قدرشناس کثرت سے تھے اور کمپنیوں کو تسلیم کرنا پڑیگا۔ کہ ہندوستان کے پنجابی حصہ میں دکٹوریہ کمپنی کی ہر دلعزیزی بہت بڑھی ہوئی تھی، اور ممکن ہے کہ دوسروں کے لئے یہ مقبولیت باعث رشک ہو!

(باقی باقی)

قند پارسی

(از حضرت مولانا اظہر علی صاحب آزاد کاکوروی (ادبی نقاد)

کار اشک است گہے آب و گہے خوں بودن — قطرہ در صورت و در وسعت جیحوں بودن
دل بیار ائے کہ دلدار نجوید جز دل — دل بیار استن آمد دل ما خوں بودن
داد دلدار نشان رہ و ما سرگرداں — دور از قطرۂ اشک ست رہ خوں بودن
نیست دشوار تماشائے حریم لیلیٰ — مشکل آمد ہمہ لیلیٰ ہمہ مجنوں بودن
بودنم آنست کہ باشم و نباشم بوجود — چہ تواں گفت چہ بودن بود و چوں بودن

خاکِ آزاد شد و یار بگوید خوں شو
معجز عشق نگر خاک شدن خوں بودن

اطلاع

خریدار حضرات کو چاہیئے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں ورنہ جواب میں دقت ہوگی۔

بڑے بابو

(افسانہ)

(از مسٹر پریم چند بی، اے)

ذیل کا افسانہ، جو اردو فسانہ نگاری کے سب سے بڑے ماہر مسٹر پریم چند کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے لکھنے والے کی برترین شخصیت کی نسبت سے علیحدہ بجائے خود بھی خاص وقعت کا مستحق ہے ـــــ اردو افسانوں میں سیرت نگاری کا یہ کمال، کہ مختلف شخصیتوں کی دماغی ساخت اور ذہنی پرداخت کا فرق اس طرح قایم ہے کہ ایک ایک ذرہ، اُنکے اختلافی حالات و حیثیات کی جھلک دکھلائے اور جن سیرتوں کو مصنف نے قلمبند کیا ہے وہ اپنے اپنے حال میں، اس طرح جیتی جاگتی، چلتی پھرتی، اور بولتی چالتی نظر آئیں کہ ناظرین کے خیالات کی نظریں انہیں مشکل سے فراموش کر سکیں، نہ ہونے کے برابر ہے ـــ کم از کم ہمیں کوئی مثال ایسی نہیں مل سکی جسے نمونہ کے طور پر ہی پیش کیا جائے۔ البتہ "فسانہ آزاد" کا "خوجی" اس خصوصیت کا بڑی حد تک حامل ہے جس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اس مشہور افسانہ کے پڑھنے والوں کے ذہنی اکتسابات میں جس استوار کشش، اور پائدار یاد کیساتھ خوجی کی سیرت سما جاتی ہے وہ آزاد کو نصیب نہیں۔ حالانکہ "آزاد" افسانہ کی بنیاد ہے ـــــ اردو افسانوں کی سیرتی دنیا میں خوجی کا جو پایہ ہے اور یہ دیکھتے کہ سیرت نگاری کا مخصوص التزام، ہمارے ان کے افسانوں میں، اب تک گلدستہ طاق نسیان "بنا رہا ہے، یقیناً اردو افسانوں کی سب سے بڑی اور مکمل سیرت کہلانے کا مستحق ہے اور ہم انشاءاللہ پھر کبھی اس پر مفصل تبصرہ کریں گے ـــ سردست ذیل کے افسانہ میں جس حد تک یہ خصوصیت جلوہ طراز ہے اسکی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے ـــ "بڑے بابو" کے افراد جہاں تک ہمارا خیال ہے، ہماری ذہنی سطح پر اپنی اپنی یادگار الگ الگ مگر مستقل نقش چھوڑتے نظر آتے ہیں۔ اور یہی سیرت نگاری کا جوہر اصلی ہے ـــــ ہماری یہ رائے صرف زیر نظر حصہ کے مطالعہ کا نتیجہ ہے "تاہم ع قیاس کن ز گلستان من بہار مرا" کے مصداق آیندہ قسط کا بھی اسی سے بہت کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے ـــ آخر میں ہم اپنے محترم افسانہ نگار کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر وہ اس افسانہ کی "انوکھی" سیرتی روش کو مستقل طور پر اپنی افسانہ طرازی کا جوہر امتیازی بنالیں تو یہ اردو ادب میں ایک ناقابلِ فراموشی، بلکہ غیر فانی یادگار ہوگی ـــــ!

اختر

تین سو پینسٹھ دن، کئی گھنٹے اور کئی منٹ کی متواتر، پیہم، مسلسل اور ان تھک دوا دوش کے بعد بالآخر میں منزل مقصود پر دھڑ سے پہنچ گیا۔ بڑے بابو کی زیارت حاصل ہوگئی۔ کرۂ خاکی نے کرۂ آتشیں کا طواف پورا کر لیا۔ اب تو آپ بھی میرے جغرافی تبحر کے قائل ہو گئے ہونگے۔ اسے استعارہ نہ سمجھئے گا۔ بڑے بابو میں مہر نیمروز کی تابش، تجلی اور حرارت تھی۔ اور میں کیا اور میری بساط کیا ایک مشتِ خاک۔ بڑے بابو مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ ہائے وہ تبسم پُر جلال، میرے تن نیم جاں میں رعشہ سا آگیا

جی میں آیا بڑے بابو کے قدموں پر نثار ہو جاؤں میں کافر نہیں، غالب کا مرید نہیں۔ جنت کے وجود پر مجھے یقین کامل ہے، اتنا ہی کامل جتنا اپنے خانۂ تاریک پر، لیکن فرشتے مجھے جنت لے جانے کے لئے آتے تو بھی یقیناً مجھے وہ مسرتِ بیکراں حاصل ہوتی جو اس تبسم پر تو سے ہوئی۔ آنکھوں میں سرسوں پھول گئی۔ سارا دل و دماغ لالہ زار بن گیا۔ تخیل نے مصری اہرام کی تعمیر شروع کر دی۔ سامنے کرسیوں پردوں اور خس کی ٹٹیوں سے سجا سجایا کمرہ تھا۔ دروازہ پر سائلوں کا انبوہ کثیر، اور اپنی جانب ایک کرسی پر شان سے بیٹھے ہوئے قسام ازل کے دنیاوی فرائض ادا کر رہے تھے۔ نذر و نیاز کا طوفانِ بے تمیزی بپا تھا، اور میں شانِ استغنا سے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔

دفعتہً ایک شیرانہ گرج نے میرے زیر تعمیر اہرام کو متزلزل کر دیا۔ "کیا کام ہے؟"

ہائے رے تجاہل، اسپر ساری دنیا کے حسینوں کا تجاہل اور تغافل نثار۔ اس آستانہ دولت پر جبیں سائی کرتے تین سو پینسٹھ دن کئی گھنٹے اور کئی منٹ گذر گئے۔ چوکھٹ کا پتھر زمین دوز ہو گیا۔ عید و بساطی کی دوکان کے آدھے کھلونے اور گوردہن حلوائی کی آدھی دوکان اسی آستانہ پر نذر ہو گئی۔ اور مجھ سے آج سوال ہوتا ہے "کیا کام ہے؟"

اگر نہیں، یہ میری زیادتی ہے، سراسر ظلم، جو فکر عالی اہم ملکی و مالی و تمدنی مسائل میں شبانہ روز منہمک رہتی ہو۔ جو دماغ ڈاکٹوں، سرکلروں، پروانوں، حکمناموں نقشوں وغیرہم سے گرانبار ہو رہا ہو۔ اس کے نزدیک مجھ جیسے خاک کے پتلے کی حقیقت ہی کیا۔ مچھر اپنے کو چاہے ہاتھی سمجھ لے پر بیل کے سینگ کو اس کی کیا خبر۔ میں نے دبی زبان سے کہا، حضور کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا۔"

بڑے بابو پھر گرجے "کیا کام ہے؟"

اب کی بار میرے روئیں کھڑے ہو گئے۔ خدا کے فضل سے لحیم و شحیم آدمی ہوں جن دنوں کالج میں تھا میری شجاعت و بسالت کی دہوم تھی۔ ہاکی ٹیم کا کپتان فٹ بال ٹیم کا نائب کپتان اور کرکیٹ کا جنرل تھا کتنے ہی گوروں کے جسم پر اب بھی میری شجاعت کے داغ باقی ہونگے۔ ممکن ہے دو چار اب بھی بیساکھیاں لئے چلتے یا رینگتے ہوں۔ بمبئی کرانیکل اور ٹائمس میں میرے گیندوں کی دہوم تھی۔ مگر اس وقت بابو صاحب کی گرج سن کر میرے جسم میں رعشہ آگیا۔ کانپتے ہوئے بولا، "حضور کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا۔"

بڑے بابو نے اپنا سلیپر دار پیر میری طرف بڑھا کر کہا "شوق سے لیجئے یہ قدم حاضر ہے۔ جتنے بوسے چاہئے لیجئے بے حساب معاملہ ہے۔ مجھ سے قسم لے لیجئے جو میں شمار کروں۔ جب تک آپ کا منہ نہ تھک جائے لئے جائیے۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر خوش نصیبی کا کیا موقعہ ہوگا۔ اوروں کو جو بات بڑی ریاضت

بڑی چلہ کشی، بڑے زہدو اتقا سے حاصل ہوتی ہے وہ مجھے بیٹھے بٹھائے بغیر بڑ پھٹکری لگائے حاصل ہوگئی۔ واللہ ہوں میں بھی خوش نصیب آپ اپنے دوست احباب، اعزہ واقربا کو بھی لائیں تو اور بھی بہتر۔ میرا اذن عام ہے۔"

اس ستم ظریفی پر بڑے بابو شاید اپنے دل میں ناراض ہوں، ضرور ہونگے۔ اس شومئی تقدیر کا برا ہو جو اس دروازہ کا گداگر بنائے ہوئے ہے جی میں تو آیا کہ حضرت کے بڑھے ہوئے پیر کو کھینچ لوں اور آپ کو زندگی بھر کے لئے سبق دے دوں کہ بد نصیبوں سے دل لگی کرنے کا یہ مزہ ہے۔ مگر بدنصیبی اگر دل پہ جبر نہ کرائے۔ جذبات کا قفل نہ ہو جائے۔ ذلت کا احساس نہ پیدا کرے تو وہ بدنصیبی کیوں کہلائے میں بھی ایک زمانے میں ستم ظریف تھا۔ اس وقت ان بڑے بابوؤں کی میری نگاہ میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ کتنے ہی بڑے بابوؤں کو رلا کر چھوڑ دیا۔ کوئی ایسا پروفیسر نہ تھا جس کا چہرہ میری صورت دیکھتے ہی زرد نہ ہو جاتا ہو۔ ہزار ہزار روپیہ پانے والے پروفیسروں کی مجھ سے کور دہنی تھی۔ ایسے کلرکوں کو میں سمجھتا ہی کیا تھا۔ لیکن اب وہ زمانہ کہاں۔ دل میں پچھتایا کہ ناحق قدبوسی کا لفظ زبان پہ لایا مگر غرض مدعا ضروری تھا میں مصمم ارادہ کرکے آیا تھا کہ اُس در سے آج کچھ لے کے ہی اٹھوں گا۔ میرے صبر اور بڑے بابو کے تجاہل میں ٹگ آف وار تھا۔ دبی زبان سے بولا "حضور گریجویٹ ہوں"

شکر ہے! ہزار شکر ہے!! بڑے بابو ہنسے جیسے ہانڈی ابل پڑی ہو۔ وہ گرج اور وہ کرخت آواز نہ تھی۔ میری جبہ سائی آخر کہاں تک اثر نہ کرتی شاید اثر کو میری دعا سے دشمنی نہیں۔ میرے کان بڑی بیقراری سے کلمات روح افزا سننے کے لئے منتظر تھے۔ مگر آہ جتنی مایوسی ان کانوں کو ہوئی ہے۔ اتنی شاید کوہکن کو بھی نہ ہوئی ہوگی۔ وہ تبسم نہ تھا خندۂ تقدیر تھا۔ حضور نے فرمایا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ ملک اور قوم کے لئے اس سے زیادہ خوشی کا کیا امر ہو سکتا ہے۔ میری دلی تمنا ہے۔ ملک کا ہر ایک نوجوان گریجویٹ ہو جائے۔ گریجویٹ زندگی کے جس شعبہ میں جائے۔ اس شعبہ کو فروغ ہی پہنچائے گا۔ ملکی۔ مالی۔ تمدنی معاشرتی۔ مذہبی غرض ہر ایک قسم کی تحریک کی بقا اور ارتقا گریجویٹوں ہی پر منحصر ہے۔ اگر ملک میں گریجویٹوں کا یہ افسوسناک فقدان نہ ہوتا تو عدم تعاون کی تحریک کیوں اتنی جلد سرد ہو جاتی۔ کیوں بنے ہوئے رنگے سیار۔ جو فروش گندم نما، زر پرست لیڈروں کو ڈاکہ زنی کے ایسے موقعے ملتے۔ تبلیغ کیوں مبلغ علیہ السلام کی علت بنتی۔ گریجویٹ میں حق اور باطل کی تمیز نگاہ کی وسعت اور موازنہ کی قابلیت ہونا امر لازم

ہے۔ میری آنکھیں تو گریجویٹوں کو دیکھ کر نشہ کے درجہ تک محظوظ ہو جاتی ہیں۔ آپ بھی خدا کے فضل سے اپنی قسم کی بہت اچھی مثال ہیں۔ بالکل اپ ٹوڈیٹ یہ شیروانی تو برکت اینڈ کو کے دوکان کی سلی ہوئی ہوگی جوتے بھی ڈاسن کے ہیں۔ کیوں نہ ہو آپ لوگوں نے قوم کے معیار زندگی کو بہت رفیع بنا دیا ہے۔ اور اب وہ بہت جلد منزل مقصود پر پہنچے گی۔ بلیک برڈ بھی ہے۔ ویسٹ اینڈ کی رسٹ واچ بھی ہے بیشک اب قومی بیڑے کو خواجہ خضر کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ اُن کا منت شناس نہ ہوگا"

ہائے تقدیر اور وائے تقدیر! اگر جانتا کہ یہ شیروانی اور فاؤنٹین پن اور رسٹ واچ یوں آماجگاہ ظرافت بنیں گی تو احباب کا شرمندۂ احسان کیوں بنتا۔ نماز بخشوانے آیا تھا، روزے گلے پڑے۔ کتابوں میں پڑھا تھا۔ ہیئت گدائی اعلان ہے اپنی ناکامی کا۔ دعوت ہے اپنی تحقیر کی۔ تجربہ بھی مطلعہ کا شاہد تھا۔ چیتھڑے پوش بھیک منگوں کو کتنی بے دردی سے دھتکارتا ہوں لیکن جب کوئی حضرت صوفی صافی بنے ہوئے گیسوئے دراز شانوں پر بکھیرے، سنہرا عمامہ سر پر شان کجکلاہی سے باندھے، صندلی رنگ کا نیچا کرتہ پہنے کمرہ میں آپہنچتے ہیں تو جبراً اُن کی تعظیم کرنی پڑتی ہے اور اُن کی پاک منشی کے متعلق ہزاروں اشتباہات پیدا ہونے پر بھی چھوٹی سے چھوٹی رقم جو اُن کے نذر کی جاتی ہے۔ وہ ایک دن جن بھکاریوں کو خوان نعمت کے سامان مہیا کر دیتی۔ پرانی مثل ہے بھیس سے ہی بھیکھ ملتی ہے۔ پر آج اس کلیہ کی تکذیب ہو گئی۔ اب اہلیہ مدبرہ کی وہ تنبیہ یاد آئی جو اس نے چلتے وقت کی تھی "کیوں خواہ مخواہ اپنی بے عزتی کرانے جا رہے ہو۔ وہ صاف سمجھیں گے کہ یہ مانگے تانگے کا ٹھاٹھ ہے۔ ایسے رئیس ہوتے تو میرے دروازے پر آتے ہی کیوں" اس وقت میں نے اس تنبیہ کو اہلیہ کی کم نگاہی اور دہقانیت پر محمول کیا تھا۔ پر اب معلوم ہوا کہ گنوارنیں بھی کبھی کبھی سوجھ کی باتیں کہتی ہیں۔ مگر اب دست تاسف ملنا بے سود تھا۔ میں نے عاجزانہ انداز سے کہا "حضور کہیں میری بھی پرورش فرمائیں"

بڑے بابو نے میری طرف اس انداز سے دیکھا گویا میں کوئی عجیب الخلقت وجود ہوں۔ اور نہایت تشفی آمیز لہجہ میں بولے۔ آپ کی پرورش خدا کرے گا وہی سب کا رازق ہے۔ ازل سے شعراء حکما اولیا یہی تلقین کرتے آئے ہیں۔ کہ خدا پر توکل رکھو۔ اور ہم ہیں کہ اُن کی ہدایات کو فراموش کر جاتے ہیں لیکن خیر میں آپ کو صلاح نیک دینے میں بخل نہ کروں گا آپ ایک اخبار نکال دیجئے یقین مانئے اس کیلئے علمیت یا تدبر کی ضرورت نہیں آپ تو خدا کے فضل سے گریجویٹ ہیں۔ حبوب امساک اور ملذذ طلا کے

نسخے لکھئے۔ طب اکبر میں آپ کو ہزاروں نسخے ملیں گے لائبریری جاکر نقل کرلائیے اور اخبار میں نئے عنوان سے شائع کیجئے۔ کوک شاستر کا تو آپ نے مطالعہ کیا ہی ہوگا، اگر نہ کیا ہو تو ایک بار کر جائیے اور اپنے اخبار میں لطف مواصلت کے طریقے ارقام فرمائیے۔ اعضائ شہوانی کے نام جتنے زیادہ آسکیں بہتر ہے۔ پھر دیکھئے کیسے کیسے ڈاکٹر اور پروفیسر اور ڈپٹی کلکٹر آپ کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ اس کا خیال رہے کہ یہ کام حکیمانہ انداز سے کیا جائے تاجرانہ اور حکیمانہ انداز میں تھوڑا سا فرق ہے۔ تاجر محض اپنی دواؤں کی تعریف کرتا ہے۔ حکیم اصطلاحات اور اعضائ مخفی کی تشریح کرکے اپنے مضامین کو علمی رنگ دے دیتا ہے۔ تاجر کی تعریف سے لوگ بدظن ہو جاتے ہیں، حکیم کی تعریف اعتماد انگیز ہوتی ہے۔ اگر اس معاملہ میں کچھ استصواب کی ضرورت ہو تو رسالہ درویش حاضر ہے۔ اگر اس کام میں آپ کو کچھ دقت معلوم ہوتی ہو تو سوامی شردھانند کی خدمت میں جاکر شدھی پر آمادگی ظاہر کیجئے۔ پھر دیکھئے آپ کی کتنی تواضع اور تکریم ہوتی ہے۔ اتنا سمجھائے دیتا ہوں کہ شدھی کے لئے فوراً تیار نہ ہو جائیے گا۔ پہلے دن تو دو چار ہندو دھرم کی کتابیں مانگ لائیے گا۔ ایک ہفتہ کے بعد جاکر کچھ اعتراضات کیجئے گا۔ مگر اعتراضات ایسے ہوں جن کا جواب آسانی سے نہ دیا جاسکے۔ اس سے سوامی جی کو آپ کی تحقیق اور تجسس کا یقین ہو جائے گا۔ بس آپ کی چاندی ہے۔ آپ اس کے بعد اسلام کی مخالفت پر دو ایک مضمون یا سلسلۂ مضامین کسی ہندو رسالے میں لکھ دینگے تو آپ کی زندگی اور معاش کا مسئلہ حل ہو جائے گا

اس سے بھی ایک سہل نسخہ ہے۔ تبلیغی مشن میں شریک ہو جائیے۔ کسی ہندو عورت خصوصاً نوجوان بیوہ پر ڈورے ڈالئے آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ وہ کتنی آسانی سے آپ سے ملتفت ہو جاتی ہے آپ اس کی حیات تاریک کے لئے مشعل ثابت ہونگے۔ وہ بے عذر ہوتی ہے۔ شوق سے اسلام قبول کرے گی۔ بس آپ شہیدوں میں داخل ہوگئے اگر آپ ذرا احتیاط سے کام کرتے رہیں تو آپ کی زندگی بڑی فارغ البالی سے گذرے گی۔ ایک ہی کھیوے میں دین و دنیا دونوں ہی پار۔ جناب آپ لیڈر بن جائیں گے۔ واللہ ایک ہفتہ میں آپ کا شمار معززین میں ہونے لگا۔ دین کے سچے پیرو، ہزارہا سیدھے سادھے مسلمان آپ کو دین کی ڈوبتی ہوئی کشتی کا ناخدا سمجھیں گے۔ پھر خدا کے سوا اور کسی کو خبر نہ ہوگی کہ آپکے ہاتھ کیا آتا ہے اور وہ کہاں جاتا ہے اور خدا افشائے راز نہیں کرتا۔ یہ آپ جانتے ہی ہیں۔ تعجب ہے کہ ان موقعوں پر آپ کی نگاہ کیوں نہیں جاتی۔ میں تو بڈھا ہوگیا اور اب کوئی نیا کام نہیں سیکھ سکتا ورنہ اس وقت لیڈروں کا لیڈر ہوتا۔

(باقی)

حشرِ جذبات

از جناب انڈین شیکسپیر آغا محمد شاہ صاحب حشر کاشمیری

گھر سے جنگل کی طرف جب تیرا دیوانہ چلا
ساتھ میں روتا ہوا ہر اپنا بیگانہ چلا

پاؤں کے چھالوں سے کانٹوں کی بجھائی میں نے پیاس
آج جنگل میں بھی ساقی دورِ پیمانہ چلا

دِل کے آئینے میں تصویریں جڑی ہیں حُسن کی
جِس طرف کو میں چلا ساتھ اک پری خانہ چلا

پی رہے ہیں سب نگاہوں سے محبّت کی شراب
جو تری محفل میں آیا بھر کے پیمانہ چلا

حشرؔ یہ کالی گھٹائیں اور توبہ کا خیال
تم یہیں بیٹھے رہو میں سوئے میخانہ چلا

خُدا

(دنیا کے مشہور فلسفی کاؤنٹ لیو طالستائی کی ایک تصنیف سے)

(مترجمہ جناب صاحبزادہ احمد سعید خانصاحب شوق (علیگ) جائنٹ ایڈیٹر روزنامہ ہمدرد دہلی)

تمہارے فرائض کا مبدا خدا کی ذات ہے، قانون فطرت تمہارے فرائض کا آئینہ ہے، اختراعات وایجادات اور خدا کے قانون کی مطابقت فرض انسانیت ہے۔ اس کے وجود کو ثابت کرنے کی نہ مجھے ضرورت ہے اور نہ میری خواہش اگر اس کے وجود کو ثابت کرنے کی سعی کی جائے تو یہ کفر ہے اور اسکے وجود کا انکار حماقت۔

ہمارا وجود ہی خدا کے وجود کا زبردست ثبوت ہے۔ خدا ہمارے دلوں میں ہے، انسانی ضمیر خدا کا مسکن ہے، اور یہ کائنات جو ہمیں محیط کئے ہوئے ہے اس کے جلوہ کا پرتو ہے۔ خوشی کے راحت فزا لمحے، ہوں یا غم کی تکلیف دہ ساعتیں، ہر حالت میں ہمارا ضمیر اس کی یاد میں محو رہتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اب تک انسان خدا کا انکار نہ کرسکا کسی نہ کسی صورت، یا حیثیت میں اس کے وجود اور عظمت کا ضرور اعتراف کرنا پڑا ہے

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغوں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

تم میں کوئی ایسا نہیں ہوسکتا جو اس کے وجود کا انکار کرسکے۔ کائنات کی ہر ترتیب ہر نظام ہر حرکت کی باقاعدگی اور قانون فطرت کا اصول اس کے جلوے کی مظہر ہیں۔ مگر چند ہستیاں ایسی ہوں کہ وہ خدا کے وجود سے انکار کریں تو ان پر لعن طعن کی بجائے ماتم کرنا چاہئے۔

جو شخص تاروں بھری رات کے دلکش منظر شہر خموشاں کی عبرتناک سکوت میں، یا بستر مرگ کی غم آموز حالت میں خدا کا انکار کرسکتا ہے تو وہ حقیقتاً بے انتہا بدنصیب یا بیحد گستاخ ہے۔

پہلا ملحد یقیناً وہ ہوسکتا ہے جو اپنی معصیت کو انسانوں سے چھپا کر خدا کا انکار کرے تاکہ تنہا اس شاہد حقیقی سے بھی پوشیدہ کرے جس سے وہ کسی حالت میں چھپا نہیں سکتا تھا اور عرق انفعال کے قطروں سے جو اس کی زندگی کو تلخ کردیتے ہیں حاصل کرسکے۔

شاید وہی شخص ظالم ہو سکتا ہے جو اپنے بھائی کی روح کو معصیت کی گندگی میں اس طرح آلودہ کرنا چاہے کہ وحشیانہ قوت کی عبادت کو لازوال صداقت اور فرض منصبی کا قائم مقام بنانے کی کوشش کرے۔ ایسے ظالموں کے وجود کے بعد بھی اس سرائے فانی میں ہمیشہ اس قسم کے انسانوں کا ظہور ہوا ہے۔ جو اپنے فلسفیانہ جنون اور گمراہی کی وجہ سے ملحدانہ اصول کے قائل ہو گئے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد النادر کالمعدوم تھی، اور وہ بھی بعد میں پشیمان نظر آتی تھی۔ بہت زمانہ نہیں گذرا کہ ایک ایسی جماعت دنیا میں آئی جو اپنے غلط اور لغو خیال سے متاثر تھی اور یہ خیال ایک گمراہ اور ظالم فرقہ کے دماغ کا نتیجہ تھا۔ جس نے محض ذاتی مفاد کی خاطر خدا کے وجود کا انکار کیا تھا لیکن یہ بھی وقتی تماشا تھا کیونکہ فوراً ہی ان کی پاکبازی کی ضروریات تقدیس نے انکو مجبور کیا کہ وہ ایک مقدس وجود کے قایل ہوں اور پھر اس کے سوا چارہ نہ دیکھا کہ عقل اور فطرت کی مقدس دیویوں کی پوجا کریں۔

آج ایسے انسان بھی نظر آتے ہیں جو تمام مذاہب کو ناپسند کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی رائے میں عقاید اور احکام میں تحریف کردی گئی ہے۔ ... کی اصلاح و درستی کے لئے کوئی ... لیکن ان میں سے ایک متنفس بھی یہ جرات نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے کو دہریہ کہے۔

مذہبی لوگ خدا کو مختلف حیثیتوں میں تسلیم کرتے ہیں، کسی کو عقبیٰ کا خوف ہے، کوئی دنیوی آرزوؤں کی کامیابی کے لئے اس کی طرف رجوع کرتا ہے حتیٰ کہ ظالم اپنے خیال میں اس کے نام کی آڑ میں سیاہ کاریوں کی وجہ سے اپنی حفاظت چاہتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سورج کی روشنی ابر اور گرد و غبار کی وجہ سے صاف شفاف نہیں ہوتی اور اس کی تابندہ شعاعیں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ ریزی نہیں کرتیں۔ تو کیا اس سے یہ معنی ہوئے کہ ہم سورج اور اس کی شعاعوں کی حیات بخش طاقت کا انکار کردیں۔ جو تمام کائنات کے لئے زندگی کا باعث ہیں۔ مقصد آزادی سے علیحدہ ہو کر بعض اوقات شریر اور مفسد انسان بغاوت اور فتنہ پردازی کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ تو کیا ہم آزادی سے نفرت کریں۔ خود انسانوں کی معصیتوں اور سیاہ کاریوں نے خدائے بزرگ و برتر کے نام مقدس پر تحریفات اور دیگر ایسی ہی دست درازیوں سے تاریکی کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ ورنہ خدا کا یقین کامل ہی انسان کے ضمیر کو ایک لازوال نور سے جگمگا دیتا ہے۔ مظالم کے پردہ کی طرح اکاذیب و تحریفات کا نقاب ہمیشہ حائل نہیں رہ سکتا یہ صورتیں فتنی وگذشتنی ہیں۔ خدا موجود ہے۔ اور مخلوق موجود

مخلوق زمین پر خدا کا عکس ہے۔ جو انسان غلامی، افلاس اور دیگر مصائب کا شکار رہتے ہیں۔ لیکن بتدریج ان کو صفائی حاصل ہوتی ہے اور ان کی طاقت و عظمت ترقی کر جاتی ہے اسی طرح مذہبی توانین میں خدائے بزرگ و برتر کے یقین کی وجہ سے پاکبازی خلوص، راسخ الاعتقادی اور عبودیت کی ایک تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں خدا کے وجود کے متعلق تم سے کوئی تذکرہ نہیں کر رہا ہوں۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ تمہیں اس کی عبادت کرنی چاہیئے۔ تم عبادت کرتے ہو اور تمہیں عبادت کرنی پڑے گی خواہ تم اس کا نام لو یا نہ لو۔ جب تمہیں اپنی زندگی یا دہ زندگیاں جو تمہارے قرب وجوار میں ہیں۔ اُنکے متعلق احساس ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تم ایک خاص احساس بھی پاتے ہو! یہی احساس عبادت کی طرف راہبری کرتا ہے۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عبادت کس طرح کرنی چاہیئے۔ اور ایک غلطی پر متنبہ کر دینا چاہتا ہوں جس کے ہزاروں انسان شکار ہیں اور جس کی تقلید تمہارے دماغوں کو بھی مختل کر دیتی ہے یہی غلطی انتہائی مہلک، خطرناک اور انسانی زندگی کے لیئے برباد کن غلطی ہے۔ یہ غلطی دہریت اور لامذہبیت ہے

جس سرائے فانی میں تمہیں ایک مدت معینہ تک رہنا ہے اس میں اور خدا کے قدرت و ایمان میں جو چیز جدائی پیدا کر دیتی ہے وہ یہی لامذہبیت ہے ایک طرف ایسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ خدا کا وجود برحق ہے اور ہمارا فرض صرف یہ ہے کہ اس پر ایمان رکھیں۔ اور اس کی عبادت کریں۔ خدا اور انسان میں جو رشتہ ہے اُسے نہ کوئی سمجھ سکتا ہے نہ بتا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر خود تمہارے ضمیر کو ہی فیصلہ کرنا چاہیئے۔ غور کرو! کہ تم اس کے متعلق کیا فیصلہ کرو گے۔ لیکن جو کچھ تم فیصلہ کرو اس کے متعلق یہ خیال کرنا غلطی ہے کہ دوسرے بھی اسے تسلیم کر لیں گے۔ اور نہ اس فیصلہ کو دیگر موجودات پر منطبق کرنے کی کوشش کرو! سیاست ایک چیز ہے اور مذہب دوسری چیز ہے ——

(ربانی)

دہلی ۵ نومبر ۲۶ء

عزیزی اختر! ابھی تمہارا شکریہ ادا کرنا محال ہے۔ تمہاری محبت سے متاثر اور تمہارا خیال لئے ہوئے کل صبح یہاں پہنچا۔ رستہ میں تازہ بہارستان کے دیکھنے کا بھی موقعہ ملا۔ خوش ہوا۔ پدماوت پر بہت اچھا مضمون شائع ہو رہا ہے۔ میں ۹ تک یہاں اور رہوں۔ خط لکھنا ہو نواب علی گڈھ تحریر کرنا۔

(نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال)

افکارِ عالیہ

(طرح انجمن معیار الادب لکھنؤ)

(از لسان الاسرار حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب احسنؔ لکھنوی)

ہستیٔ فانی کا اک جلوہ برائے نام تھا
میں چراغِ صبح تھا یا آفتابِ شام تھا

پوچھنے والے! شبِ فرقت کا یہ انجام تھا
اک بھیانک رات تھی، میں تھا، خدا کا نام تھا

منحصر تھی قدردانی پر مرے نغموں کی داد
کچھ نہ سمجھا جو گرفتارِ خیالِ خام تھا

مٹتے مرتے اس نوشتے پر عمل کرتے رہے
خطِ پیشانی کسی محبوب کا پیغام تھا

فطرتاً احکامِ واعظ سے مجھے نفرت نہ تھی
عشق سے فرصت اگر ملتی تو اچھا کام تھا

آشیاں گم کردہ بلبل ہوں مری حالت نہ پوچھ
آنکھ کھلنے سے بھی پہلے میں اسیرِ دام تھا

بے خلل انداز خلوت میں کشاکش نزع کی
روح کو گہوارۂ دل میں بہت آرام تھا

ایک بیہوشی سے وابستہ رہی امید و بیم
چارہ گر خطرہ سمجھتے تھے مجھے آرام تھا

لفظ کے معنی سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی
موت ہے یعنی عشق کا اک دوسرا ہی نام تھا

قطع تھے تارِ نفس کے ساتھ غم کے سلسلے
ایک ہچکی آتے ہی بیمار کو آرام تھا

دیکھ احسنؔ دیدۂ خونبار کے کام آ گیا
وہ جو اک قطرہ لہو دل میں برائے نام تھا



مہاتما گوتم بُدھ کے تبرکات

(از جناب سید حفیظ الدین صاحب ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا)

جن لوگوں نے کلکتہ کے عجائب گھر کی سیر کی ہے انہوں نے ضرور دیکھا ہو گا کہ وہاں ایک جدید کمرے کے وسط میں ایک شیشہ دار بکس کے اندر چند نہایت خوش نما برتن اور پیالے اور کچھ دلکش زیور اور جواہرات اور چند اور نہایت نفیس اشیا رکھی ہوئی ہیں۔ یہ چیزیں مہاتما بدھ جیسے عظیم الشان اور خدا رسیدہ شخص کے آثار یا تبرکات ہیں۔ جس کی تعلیم اور تلقین نے ولادتِ مسیح سے پانچ سو سال قبل ایشیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا اور جس مذہب کی بنیاد اُس نے ڈالی وہ نہ صرف قدیم زمانے میں ایک ہزار سال تک ایشیائی دل و دماغ پر حیرت انگیز گرفت کے ساتھ مکمل قبضہ کئے رہا بلکہ آج بھی ایشیا کی آبادی کا بیشتر حصہ اُسی مذہب کا حلقہ بگوش ہے۔

مہاتما بدھ کے یہ تبرکات ۲۵ سال ہوئے مسٹر کیکسٹن پیپ نے جاگیر بردپور واقع سڑک اوسکا نیپال پر ایک ستوپہ[1] کی کھدائی میں برآمد کئے تھے۔ ان اشیا کی قدامت اور اُن کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما بدھ کے آثار و تبرکات کی نسبت جو ہندوستان کے طول و عرض میں مدفون ہیں اور وقتاً فوقتاً برآمد ہوتے رہتے ہیں کچھ حال بیان کر

[1] ستوپہ مخروطی شکل کا ایک ٹھوس مینار ہوتا ہے جس کے نیچے بدھ مذہب کے پیرو عموماً مہاتما بدھ یا بدھ مذہب کے کسی اور متبرک بزرگ کی سوختہ ہڈیاں وغیرہ دفن کیا کرتے ہیں اور اسے متبرک سمجھ کر اس کی زیارت کو جاتے ہیں۔

دیا جائے۔

سرجان مارشل نے اپنی کتاب "رہنمائے سانچی" میں مہاتما بدھ کے مختصر سے سوانح دیئے ہیں۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ بدھ کی وفات کے بعد جو بحساب ڈاکٹر فلیٹ ۱۴۔ اکتوبر ۴۸۳ قبل مسیح میں واقع ہوئی۔ اس کی نعش کو حسب دستور چتا میں رکھ کر جلادیا گیا۔ اور اس کی راکھ اور سوختہ ہڈیوں پر کوسی نگر کے ملاؤں نے قبضہ کر لیا۔ مگر چند ہی روز بعد سات اور دعویدار پیدا ہو گئے جنہوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں بھی ان آثار یا تبرکات میں سے حصہ ملنا چاہیئے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ملا تبرکات کے تقسیم کرنے پر رضامند نہیں۔ تو انہوں نے کوسی نگر پر فوج کشی کر دی۔ بالآخر ایک برہمن نے بیچ میں پڑکر تبرکات کو آٹھ مساوی حصوں میں تقسیم کرادیا۔ اس کے بعد کسی موریائی قبیلہ کا ایک قاصد بھی تبرکات کا حصہ مانگنے آیا مگر چونکہ وہ تقسیم ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ چتا کے کوئلے ہی جمع کر کے لے گیا۔ اور اہل موریا نے ان کوئلوں پر ہی ایک عظیم الشان ستوپہ تعمیر کرادیا۔ رہے وہ آٹھ حصے سو اُن پر بھی ستوپے تعمیر ہوئے۔ مگر ان میں سے سات ستوپوں کو شہنشاہ اشوک نے کھدوا کر اُن کے تبرکات کو ازسرنو تقسیم کیا۔ اور اپنی سلطنت میں چوراسی ہزار ستوپے بنوا کر ان میں یہ تبرکات دفن کردیئے۔ کہتے ہیں کہ صرف رامگرام کا ستوپہ واقع نیپال ترائی جس کی حفاظت ناگا لوگ کیا کرتے تھے اس تباہی سے بچ کر قدیم حالت میں محفوظ رہا۔ ناگا بڑے جفاکش اور مستعد لوگ تھے۔ اور انہوں نے سخت مخالفت کر کے ان تبرکات کو اشوک کے ہاتھ نہ لگنے دیا۔

مذکورہ بالا واقعات کے بیان سے ہمارا مقصد اس امر کو واضح کرنا ہے کہ یہ غیر اغلب نہیں کہ جو ستوپہ جاگیر بردپور کے قریب برآمد ہوا تھا۔ وہ وہی قدیم ستوپہ ہو جس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ رامگرام کا ستوپہ تھا۔ اور جو شہنشاہ اشوک کی دستبرد سے محفوظ رہا۔ خیر یہ خیال صحیح ہو یا غلط سردست ہمارا مقصد اس پر بحث کرنے کا نہیں۔ اس وقت تو ہم نے ان اشیا کا حال بیان کرنا ہے جو بردپور کے ستوپہ سے برآمد ہوئیں۔

یہ سب تبرکات سنگ صابون کے ایک نہایت بھاری صندوق میں محفوظ تھے۔ جو زمین میں نہایت گہرا گڑا ہوا تھا۔ یہ صندوق چار فٹ چار انچ طویل ۲۔فٹ آٹھ انچ عریض اور ۲ فٹ دو انچ بلند تھا اس عظیم الشان صندوق کی اہمیت کا اندازہ اس کے وزن سے کیا جاسکتا ہے۔ جو ۱۹۔من ۸ سیر ہے۔ صرف اس کا ڈھکنا ۳ من ۱۴ سیر وزنی ہے۔

صندوق میں سنگ صابون کے چند برتن، پیالے

اور ڈبیاں، کچھ سنہری زیورات ۔ منکے ۔ بیش بہا قیمت پتھر اور چند اور چیزیں رکھی ہوئی تھیں برتنوں کے گرداگرد نہایت باریک تحریر میں کچھ عبارت کندہ تھی ۔ جب اس کا بغور مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ پالی زبان میں ہے ۔ ماہران آثار قدیمہ نے بڑی محنت سے اس عبارت کا حسب ذیل ترجمہ کیا ۔

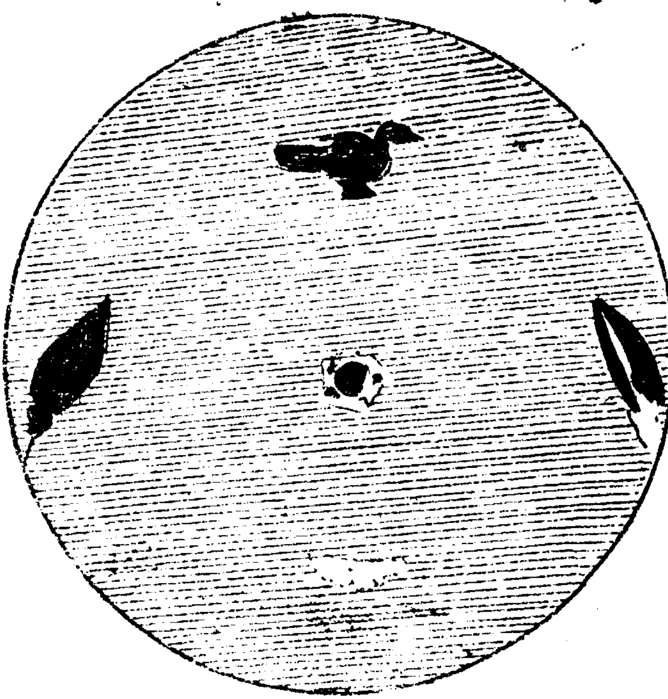
"یہ آثار و تبرکات مہاتما بدھ کے ہیں
جس کا تعلق اہل شاکا سے تھا ۔ ان
تبرکات کو محفوظ کرنے کی غرض سے
یہ برتن سکیہ رتی کے بھائیوں بہنوں
اور اُن کے بیٹوں اور بیویوں نے
ہدیتہً پیش کئے"

ان برتنوں میں علاوہ بیش قیمت پتھروں اور جواہرات کے مہاتما بدھ کی ہڈیاں بھی رکھی ہوئی تھیں ۔ ان ہڈیوں کو سرکار برطانیہ نے بطور تبرک شاہ سیام کو پیش کر دیا ۔ اور اہل سیام نے اس قدیم متبرک یادگار کا نہایت مسرت اور کمال عقیدتمندی کے ساتھ خیر مقدم کیا ۔ رہیں باقی اشیا وہ کلکتہ کے عجائب گھر میں رکھ دی گئیں :-

اس وزنی صندوق اور ان خوبصورت برتنوں کی اہمیت کے لئے تو صرف ایک یہی امر بہت کافی تھا کہ وہ ہزارہا سال تک بدھ کے تبرکات کو لئے رہنے کا شرف حاصل کر چکے تھے لیکن قطع نظر اس امر کے وہ عجیب و غریب اور نادر الوجود جواہرات جو ان برتنوں میں رکھے ہوئے تھے ۔ اپنی صنعتی خوبیوں کے لحاظ سے ہم سے خراج تحسین کے مستحق ہیں ۔ ہڈیوں کے ساتھ ہی برتنوں میں نہایت نفیس موتی اور دوسری بیش بہا چیزیں بھی پڑی تھیں ۔ ان میں سے بعض موتی تو سادے ہیں اور بعض چھوٹے چھوٹے خوبصورت پرندوں اور پھولوں کی شکل میں ہیں ۔ ان سب چیزوں پر سونے میں نہایت نفیس میناکاری اور نقاشی ہوئی ہے ۔ پھولوں کی چمک دمک ایسی عجیب ہے کہ گویا انہیں ابھی چن کر لایا گیا ہے مونگے اور مرجان کے زیورات استادانہ صنعت کا نمونہ ہیں ۔ اور ایسے خوبصورت بنے ہیں کہ موجودہ زمانے کے جوہری بھی اُن کی نفاست میں اضافہ نہیں کر سکتے ۔ بہت سے پھول قیمتی پتھروں کے بنے ہوئے ہیں ۔ اور بعض پھولوں میں تو چھ چھ سات سات پتیاں بھی لگی ہوئی ہیں ۔ جن کے اکثر پتے دندانے دار ہیں ۔ اور بعض پتوں پر خط اور ریشے تک نہایت واضح اور صاف دکھائے ہیں ۔ ان پتوں پر سونے کی گلکاری بھی ہوئی ہے ۔ منکے سرخ و سفید عقیق کے ہیں ۔ ایک چھوٹا سا پرندہ سرخ عقیق کا بنا ہوا ہے اور باوجود

اپنے چھوٹے سے قد و قامت کے ایک جیتا جاگتا
پرند معلوم ہوتا ہے ۔ نہایت حیرت کی بات یہ ہے
کہ ڈھائی تین ہزار سال تک یہ اشیا زمین کے
نیچے دبی پڑی رہیں لیکن اُن کی چمک دمک اور
آب و تاب میں ذرا بھی فرق نہیں آیا ۔

یہ تصویر صرف ایک انچ لمبی ہے ۔ دوسری تصویر قد
میں پہلی تصویر سے بھی چھوٹی ہے ۔ ان تصاویر کی
پستہ قامتی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ امر نہایت ہی قابلِ
غور ہے کہ اس قدیم زمانے کے صناع ان تصاویر کی
تفصیل کو پوری طرح واضح اور تناسب اعضا کو ہر طرح

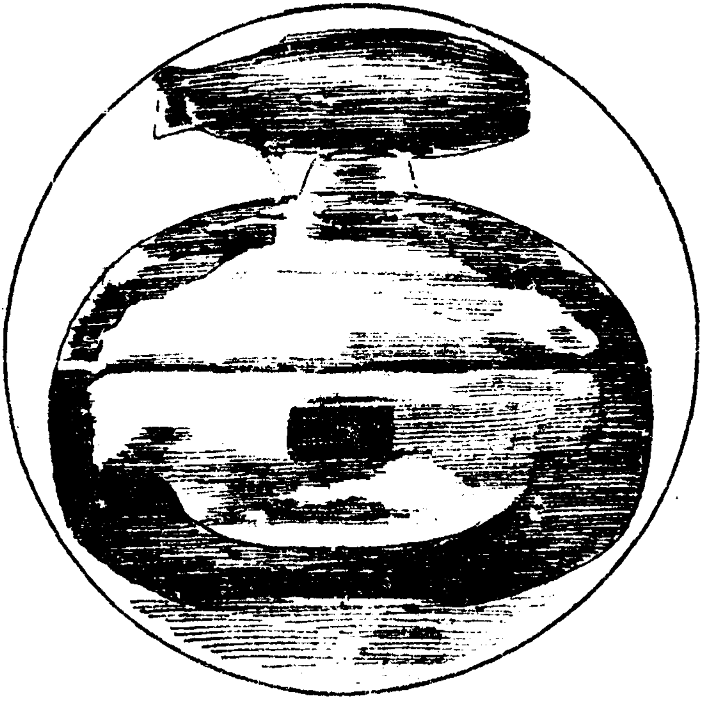


عقیق کا پند اور چند اور جواہرات جو بدھ کے آثار کے ساتھ ستوپ پپرہوا سے برآمد ہوئے یہ چیزیں ڈھائی ہزار سال کی قدیم صنعت کا نمونہ ہیں

صندوق میں سے صرف دو انسانی تصاویر
دستیاب ہوئیں یہ دونوں سونے کے ایک ایک
پترے پر بنی ہوئی ہیں ۔ اور عورتوں کے نہایت
مکمل مجسمے ہیں ۔ ایک تصویر میں جسم کا بالائی حصہ
برہنہ دکھایا گیا ہے لیکن زیرین حصہ ملبوس ہے ۔

بنا سکنے میں ایسے کامیاب ہوئے ہیں ۔ سونے کے دو
پتروں پر دو نہایت دلچسپ نقوش اور بھی ملے ہیں
انہیں سے ایک تو ہاتھی کی تصویر ہے اور دوسری شیر کی
سب سے عجیب چیز مشابہ ایک بلوری پیالہ ہے ۔ جو
صندوق میں سے ہاتھ لگا ۔ اس پیالے پر نہایت

نفیس جلادی ہوئی ہے۔ منہ پر ایک سرپوش بھی ہے۔ جس پر بلوری کی ایک مچھلی بیٹھی ہے اور مچھلی پر سونے کے دندانے دار پھول اور میووں سے پچی کاری ہوئی ہے۔ پھولوں اور میووں کی جسامت کو دیکھ کر قدیم زمانے کی ہنرمندی اور صنعت کا سکہ اُسے دلچسپ تر بنا دیا ہے۔ یہ چیزیں خراسان سے بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اور اس مجموعہ میں غالباً اس لئے شامل کردی گئیں کہ وہ اپنی وضع قطع اور صنعتی خوبیوں کے لحاظ سے بدھ کے تبرکات سے بہت مشابہ ہیں۔ یہ عجیب وغریب چیزیں بیش قیمت



ڈھائی ہزار سال کا قدیم بلوری پیالہ جس کے ڈھکنے پر بلوری کی ایک مچھلی بنی ہوئی ہے بدھ کے آثار کے ساتھ ستوپ پر یدپور سے برآمد ہوا

دلوں پر نقش ہو جاتا ہے کہ باوجود اس قدر چھوٹا ہونے کے وہ شکل وصورت میں ایسے دلفریب اور متناسب الاعضا بنائے جا سکے۔

کارپردازان عجائب گھر نے اس مجموعہ تبرکات میں چند اور عجائب روزگار اشیا کا اضافہ کرکے پتھروں کے نگینے ہیں۔ ایک نگینہ ہلکے پیازی رنگ کے عقیق کا بنا ہوا ہے اس پر حسن ومحبت کی دیوی کی تصویر ہے جس کے دائیں ہاتھ میں عصا ہے اور کمر سے نیچے تک بدن کا حصہ ملبوس ہے۔ نگینے کے باقی حصے پر نہایت عجیب نقوش کندے ہیں۔ اگرچہ تصویر

نہایت چھوٹی ہے۔ لیکن اس کے اعضا کا تناسب نہایت مکمل اور صحیح ہے۔ اور اس کے لباس کے شکن ایسے قدرتی اور اصلی معلوم ہوتے ہیں کہ سخت سے سخت نکتہ چین بھی انہیں دیکھ کر مطمئن ہو جائیگا۔ اور قدیم زمانے کی اس صنعت پر حیرت واستعجاب سے انگشت بدنداں رہ جائیگا۔ دوسرا نگینہ بھی عقیق ہی کا ہے۔ مگر اس کا رنگ گلابی ہے اور ایک بارہ سنگے کی تصویر اس پر بنی ہوئی ہے۔ تیسرے نگینہ پر ایک ہرن کی تصویر ہے جو کسی شکاری سے ڈر کر بھاگا جارہا ہے۔ شکاری کی تصویر بھی نگینے کے ایک کونے میں بنی ہوئی ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک اور ہرن دکھایا ہے۔ بدقسمتی سے یہ نگینہ ایک جانب سے کسی قدر ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن اس نقص سے تصویر کی حقیقی خوبیوں میں کچھ فرق نہیں آیا۔ شکاری کی حرکات وسکنات اور ہرن کا چوکڑی بھرتے ہوئے جانے کا احساس ایسا دل نشین ہے۔ کہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ چوتھا نگینہ سنگ سلیمان کا ہے۔ اس پر ایک ہندی سانڈھ کی تصویر ہے۔ جو اپنی دم کو اوپر اٹھائے ہوئے نوک دم بھاگا جارہا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی نگینے ہیں۔ بعض شکل وصورت میں مدور ہیں۔ کچھ مربع اور باقی بیضوی اور مستطیل شکل کے ہیں۔ یہ تبرکات عہد قدیم کی صناعیوں کا بہترین نمونہ ہیں۔

غزل

(از مولینا مہر محمد خانصاحب شہاب مالیر کوٹلوی)

ایک ہی جلوے میں سب کو مست وحیراں کردیا
مجھ کو نالاں کردیا، دشمن کو خنداں کردیا

کس کی طاقت تھی کہ دیکھے جلوۂ رخ بے نقاب
ہاں مگر اک شوخ نے ہم پر یہ احساں کردیا

حسرتیں سر پیٹتی کی پیٹتی ہی رہ گئیں
دامنِ صد آرزو نے چاک داماں کردیا

میرے اس چھوٹے سے دل کی وسعتیں تو دیکھئے
ایک عالم ہے کہ جس کو اس میں پنہاں کردیا

اس کے اک جلوے کی تابش کیا قیامت تھی شہاب
اک اشارے میں مجھے موسیٰ عمراں کردیا

نوائے مضطر

(از افتخار الشعرا افتخار الملک خان بہادر حضرت مضطر خیر آبادی)

کچھ ایسا درد شورِ قلبِ بلبل سے نکل آیا
کہ وہ خود رنگ بن کر چہرۂ گل سے نکل آیا

حقیقت کا نشاں چشمِ تامل سے نکل آیا
ہمارے خیر و ہستی کا پتہ کل سے نکل آیا

کسی کی بے نیازی پر میں اپنی جان دیتا ہوں
گلے کا واسطہ تیغِ تغافل سے نکل آیا

اذانِ پنج وقتہ پر کبھی منہ سے نہیں بولا
مگر رندوں نے جب فریاد کی غل سے نکل آیا

میں سمجھوں گا کہ میرے داغِ عصیاں دُھل گئے سارے
اگر آنسو تری چشمِ تغافل سے نکل آیا

حقیقی باغباں کو بلبلوں نے دیکھنا چاہا
تو رنگِ حسن چھین کر دامنِ گل سے نکل آیا

بتایا حال یوں کوزے میں دریا کے سمانے کا
کہ ساقی خود مجسم ساغرِ مل سے نکل آیا

اندھیرا گور کا دیکھا تو پھر یاد آ گئے گیسو
میں سمجھا تھا کہ اب میں تیری کاکل سے نکل آیا

قناعت دوسرے کے آسرے کا نام ہے مضطر
خدا ہے جو کوئی حدِ توکل سے نکل آیا

دادِ کلام

از جے پور

عزیزی اختر

ماہِ حال کے پرچہ میں تمہارا ایک بند مجھ کو بے حد پسند آیا ہے۔ اور اس ایک مصرعہ کہ

زہن فطرت سے اک چھوتا خیال باہر نکل پڑا تھا

تو بڑا ہی اچھوتا خیال ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ذہن رسا کو مزید رسائی عطا فرمائے۔ والدعاء

عبد السلام۔ خیال

عورت

(ایک دلچسپ مکالمہ)

(از مولینا فطرتؔ انصاری ندوی)

ذیل کے دلچسپ مضمون کی تقریب پر قلم اٹھاتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں حسب عادت شوخی عنوان کو ہمہ محل نہ جانے اکثر موضوع ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی تقریب بے اختیار اصل مضمون سے زیادہ پھیل جانا چاہتی ہے لیکن اگر توسن قلم کی یہ خوش خرامی گوارا کر لی جائے تو ایک شذرہ کے لئے شاید پورا بہارستان بھی کافی نہ ہو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مضمون بھی انہی میں سے ایک ہے، اور اس قدر قیامت، آفریں کہ اس کے مطالعہ نے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی ہے جسے قلمبند کیا جائے تو غالباً پانسو صفحات پر بھی نہ سمائے۔ لیکن کیا کیجئے کہ عرض تقریب میں "دم درکش" کی قدغن لازمی اور "گھر کے مرجاؤں" کی مجبوری جاری ہے۔ بنا بریں ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس لطیفۂ مباحث سے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھ سکتے ہیں ایسا نہ ہو یہ بھی مرا اف نہ ہو جائے۔ اس مضمون کی ادبی حیثیت ـــــ اسکے لیے ہمارے عزیز لو زندہ رم دوست "فطرت" کا نام لینا کافی ہے جنکی شوخی نگارش اور دلفریبی انداز اس سے پہلے دانہ گندم میں گلفشانی کی بہار دکھا چکی ہے ـــــ اگرچہ کہ ـ

بعد مدت کے ملا وہ ہمیں دہر کا دیکر
یاد حبیب اس ستم ایجاد کی صورت نہ رہی

اختر

دسمبر کا آخری ہفتہ ہے۔ نو بجے (صبح) کا وقت ہے۔ کلکتہ میل نے ابھی آکے لکھنو کے بڑے سٹیشن پر دم لیا ہے۔ مسافر جلدی جلدی اتر چڑھ رہے ہیں مولانا بشیر الدین (جو کانپور سے کلکتہ جا رہے ہیں) ابھی آکے سوار ہوئے ہیں اسباب وسباب قرینہ سے رکھ دیا ہے۔ گاڑی کے چلنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔

سامنے سے مسٹر محمود جو کیننگ کالج لکھنو میں پڑھتے ہیں، اور اسلامی معاشرتی معاملات میں خاص دلچسپی لیتے ہیں) دوڑتے آ رہے ہیں۔ چونکہ وقت بہت کم ہے، ان کو آتا دیکھکر مولانا بشیر کھڑے ہو گئے اور قلی سے اُن کے سامان وغیرہ کے لینے میں اُنکا ہاتھ بٹایا۔ مسٹر محمود قلی کو پیسے دے چکے ہیں اور گاڑی چلدی ہے!

محمود۔ کہئے حضرت کہاں جائیے گا آپ؟

مولانا۔ میں کلکتہ جاؤں گا۔

محمود۔ آپ کا اسم گرامی؟

مولانا۔ مجھے بشیر الدین کہتے ہیں۔ میں کپورتھلہ کالج

میں عربی کا پروفیسر ہوں ان چھٹیوں میں کلکتہ ایک ضروری کام سے جارہا ہوں۔ کوئی چار پانچ روز رہ کر پھر کانپور آجاؤں گا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟

محمود۔ میں بھی کلکتہ جارہا ہوں۔

مولانا۔ خوب، آپ کا اسم شریف؟

محمود۔ مجھے ناصر محمود کہتے ہیں۔ میرے ماموں کلکتہ میں ریلوے پولیس میں سب انسپکٹر ہیں مجھے انہوں نے لکھا تھا کہ چھٹیوں میں یہیں آجانا خدا کارساز ہے مولانا اب یہ سفر آپ کی بدولت نہایت دلچسپی سے کٹے گا — میں عرصہ سے چند امور کے متعلق کسی واقف شریعت سے گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ آج آپ سے میں جی بھر کے اپنے شکوک رفع کرسکوں گا۔ آپ کا ساتھ میرے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

مولانا۔ یہ آپ کی خوش اخلاقی ہے۔ میں آپ کے حسن ظن کا مشکور ہوں۔ بہر حال میں خوش ہونگا اگر میں آپ کا اطمینان کرا سکا تو۔ کیا کوئی خاص مسئلہ ہے جس کے متعلق آپ ذکر کر رہے ہیں۔

محمود۔ ہاں ہے تو ایک اہم مسئلہ، مگر آج کل تو آپ دیکھتے ہیں کہ ہر شخص اپنے آپ کو عالم و فاضل سمجھتا ہے۔ جونہی کچھ شدبد ہوئی بس اب ان کو کسی مجتہد کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ خود براہ راست قرآن و حدیث کے مفسر بن بیٹھے ہیں آزادی رائے چونکہ "ان کا پیدائشی حق ہے" اس لئے وہ اس قابل ہوں یا نہ ہوں، ہر معاملہ میں اپنی رائے کو دخل ضرور دیں گے۔ کہ "ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو، لیکن میری رائے اب بھی یہی ہے"! بس "میری رائے" اور "میرے خیال میں" کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی حربہ نہیں ہوتا

مولانا۔ خوب! مجھے آپ کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکالتے ہوئے نہایت خوشی ہوئی کہ آپ ہر ایک بات کو نہایت سنجیدگی اور دور اندیشی سے دیکھنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔

محمود۔ نہیں مولانا یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے میں تو اس قابل نہیں ہوں —— چاہئے یہ بھی ضرور چاہئے۔ آپ ایسے لوگ ہمت افزائی نہ کریں تو اور کون کرے گا۔

مولانا۔ خیر اسے چھوڑیئے، اب آپ مجھے ذرا اصل بحث سے مطلع کیجئے آپ سے باتیں کرنے میں بہت لطف آئے گا۔ کہئے وہ مسئلہ کون سا ہے؟ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں بہمہ وجوہ آپ کی تسکین کرا دوں گا۔ لیکن اس کا مجھے یقین ہے کہ بحث

نہایت خوشگواری کے ساتھ طے ہوگی۔

محمود۔مولانا، مجھے کچھ عالم نسواں کے متعلق دریافت کرنا ہے۔

مولانا۔عورت کے متعلق؟

محمود۔جی ہاں، عورت کے متعلق آپ دیکھتے ہیں کہ آج کل اخبارات اور ملکی رسائل میں روزانہ طرح طرح کے مضامین شایع ہوتے ہیں۔

مولانا۔اچھا تو آپ غالباً پردہ کی ضرورت کے متعلق میری رائے دریافت کرنا چاہتے ہیں ٹھیک ہے نا؟

محمود۔نہیں مولانا مجھے صرف یہ دریافت کرنا ہے کہ کیا عورت فی نفسہا کوئی بری چیز ہے؟ یا نہیں، مجھے مذہب کے بعض دعویداروں سے اس معاملہ میں گفتگو کرنے کا موقعہ ملا۔

مولانا۔تو ان مذہبی لوگوں نے کیا کہا؟ کہ عورت بذاتہا کوئی بری مخلوق ہے؟

محمود۔جی ہاں! ایک صاحب تو کہنے لگے کہ عورت نہایت بدترین مخلوق ہے؟ اور اس پر جس قدر سختی اور جبر کیا جائے مرد اور عورت دونوں کے لئے مفید ہے۔ گو اُن سے دراصل بحث یہ تھی کہ پردہ کی حدود کیا ہیں؟ مگر اُن کے الفاظ نے میرے روئے سخن کو بالکل بدل دیا۔ اور اصل بحث کو چھوڑ کر میں بھی ان سے اسی میں اُلجھ گیا کہ کیا واقعی عورت کوئی بری مخلوق ہے؟

مولانا۔مجھے معاف کیجئے گا۔یہ عربی دان حضرات سب تو نہیں لیکن اکثر ایسے ہوتے ہیں جو اپنے سوا تمام لوگوں کو جاہل سمجھتے ہیں اور انگریزی خوانوں کو تو وہ مسلمان بھی سمجھ لیں تو یہ اُن کی اعلیٰ درجہ کی سخاوت شمار ہونی چاہئے ---

مولانا۔خوب! یہ سخاوت کی خوب رہی! میرے خیال میں آپ بھی کچھ مبالغہ کر رہے ہیں۔

محمود۔نہیں مولانا بخدا میں سچ عرض کرتا ہوں، یہ لوگ اخلاق اور طریق اصلاح سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔

مولانا۔اور اسی کی وہ لوگ شکایت کرتے ہیں۔کہ انگریزی خواں لوگ عربی خوانوں کو انسان بھی نہیں سمجھتے۔بات یہ ہے کہ غلطیاں دونوں میں ہیں۔اور ہر ایک فریق کو کسی ایک کے متعلق رائے قایم کرتے وقت، اصل بحث سے الگ ہو کر فریق مخالف کے نقائص کو سامنے رکھ لیتا ہے۔اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے جو اس وقت ہو رہا ہے۔

محمود۔اس وقت؟ اُس وقت سے کیا آپ کی یہ مراد ہے کہ میں بھی یک طرفہ رائے قایم کر رہا ہوں؟

مولانا۔معاف رکھئے گا۔میرا مطلب تو یہی ہے۔

محمود:- میں اس ضمنی بحث کو ختم کرنے کے لئے اپنی
غلطی کا اعتراف کئے لیتا ہوں لیکن
ہم لوگ چونکہ مذہبی معلومات اور عربی علوم و خیالات
سے اُن کے خیال میں بھی کما حقہ واقف نہیں
ہوتے لہذا اگر ہم سے کوئی لغزش
ہوجائے، تو غالباً اس سے آپ بھی اتفاق کرینگے
کہ وہ اُن کی لغزش سے کم درجہ کی ہوگی۔
ان لوگوں کو تو اخلاق اور نرمی کا نمونہ ہونا چاہئے
ہم ہیں نہ ہو۔ لیکن ہم کو اس کا علم
ضرور ہے کہ ہمارے اسلاف تحمل و بردباری کا
نمونہ ہوتے تھے، اور اس درجہ سخت گیر نہ تھے کہ
بات بات پر کافر بنائے بغیر نہ رہیں۔

مولانا۔ آپ برا نہ مانیں تو میں کچھ عرض کروں،

محمود۔ ضرور! آخر آپ فرمائیے گا نہیں تو تبادلۂ
خیالات کس طرح ہوگا؟ ضرور فرمائیے

مولانا۔ بات یہ ہے کہ حکومت غیر کی وجہ سے ہم لوگ
اپنی قومی خصوصیات کو رفتہ رفتہ بھول گئے ہیں

محمود۔ دیکھئے مولانا! آپ سیاست کی طرف جانے
لگے، یہ ایک الگ بحث ہے۔ اس کو چھوڑئیے
اس کے متعلق میں اپنے ناچیز خیالات بعد کو عرض
کروں گا۔

مولانا۔ نہیں نہیں میں صرف اس حقیقت کی طرف
اشارہ کرنا چاہتا تھا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔
کہ ہم عام مسلمان اور علمائے کرام یا عربی خوان
لوگ اسلامی شعار کو بھول گئے ہیں؟ اور عربی
خوانوں اور انگریزی خوانوں میں کیوں مشکل سے
بنتی ہے؟ حکومت غیر کو چونکہ ہماری قومی خصوصیات
اور اُن کی ترقی و تنزل سے قدرتاً وہ لگاؤ نہیں
ہے جو اپنی حکومت کو ہو سکتا ہے۔ اس لئے
ہماری تعلیمی تفریق کو وہ اس حد تک محسوس نہیں
کرتی۔ کہ اس کے اتحاد و اختلاط کی طرف کوئی عملی
قدم اٹھانا ضروری سمجھے اس کا نتیجہ یہ
ہے کہ دونوں گروہ اپنے اپنے ماحول میں رہ کر
ایک دوسرے کے حالات سے بالکل اجنبی رہ جاتے
ہیں۔ اور اپنے آپ کو صحیح راستے پر سمجھتے ہیں یہی
وجہ ہے کہ ہر ایک فریق دوسرے کو بے سمجھ
سمجھتا ہے۔

جب تک ان دونوں میں علیحدگی اور بیگانگی
کی بجائے اتحاد اور اتفاق پیدا نہ ہوگا
ہندوستان افسوس ہے کہ اسی ناگوار کشش میں مبتلا
رہے گا۔ ! خیر اس بحث کو جانے دیجئے
کہ مجرم کون ہے اور صائب الرائے کون ہے؟ اصل
بحث پر آئیے۔ ہاں تو عورت کے متعلق اگر کسی مولوی
نے آپ سے یہ کہہ دیا کہ "عورت مبدأ فساد ہے" تو
اس نے غلطی کون سی کی؟ مثل مشہور ہے

"زر- زن - زمین" یعنی دنیا کے تمام تنازعات اور فسادات انہی تین چیزوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ کیا اس سے خدانخواستہ آپ کو انکار ہے؟

محمود - نہیں، اس سے میں انکار کیوں کروں؟ یہ بالکل صحیح ہے لیکن اس سے آپ کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ یہی تین چیزیں ہیں جن پر دارین کی ترقی و بہبود کا انحصار ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی آج دنیا سے نیست و نابود کر دیا جائے تو تمام کائنات ایک ویرانہ نظر آئے انسان کی زندگی اگر بنتی ہے تو انہیں سے بنتی ہے۔ آخرت اور عاقبت سنورتی ہے تو انہی سے۔ دنیا کے کاروبار میں جان پڑتی ہے تو انہیں سے، دین کے فرائض پورے ہو سکتے ہیں تو انہی سے، آسمانی کتابیں انہی تین چیزوں کی نگہداشت و طریق استعمال سے معمور ہیں۔ قوانین دول انہی کے حالات و کیفیات سے لبریز ہیں۔ تاریخ اقوام کے واقعات انہی تین چیزوں کی تفصیلات ہیں۔ آپ ہی فرمائیے آج وہ کونسی خوبی ہے جو ان میں سے کسی ایک کے سہارے حاصل ہو سکتی ہے؟ ترقی اور بہبود کی وہ کونسی معراج ہے جو اس مثلث کو طے کئے بغیر ممکن الحصول ہے؟ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ "زر" مبداء فساد ہے تو مبداء اصلاح بھی ہے۔ "زمین اور ملک اگر باعث تنازع ہے تو سبب آرام بھی ہے، اور اگر ان دو کی طفیل آپ اجازت دیں تو میں عرض کروں کہ عورت اگر بے اعتدالیوں کا پیش خیمہ ہے تو انسانیت اور تہذیب کی جڑ بھی ہے۔ ہر چیز میں حسن بھی ہوتا ہے قبح بھی اور برائی بھلائی کا پہلو الگ الگ حیثیت رکھتا ہے ایک ہی چیز اگر خاص حالات میں برائی کا سبب بنتی ہے تو وہی چیز اُن سے مختلف حالات میں بھلائی اور بہبود کا ذریعہ بھی بنتی ہے اس بنا پر کسی چیز کے متعلق کلیتہً یہ کہہ دینا کہ یہ صرف بری ہے، میرے خیال میں ناواقفیت، بلکہ آپ اجازت دیں تو سخافت کا نتیجہ ہے۔

مولانا - ہاں مجھے اس سے پورا پورا اتفاق ہے۔ کہ کسی چیز کے متعلق آخری رائے قائم کرتے وقت اس کے حسن و قبح - مفاد و مضرت، اور نیکی بدی دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا چاہئے مگر واقعات کو کیا کیجئے گا؟ واقعات یہی بتاتے ہیں کہ ان چیزوں اور عورت سے بالخصوص اکثر برائی ہی کی تحریک ہوتی ہے -! عورت، یہ نہیں کہ اصلاح کا سبب نہیں ہوتی

— ا ہوتی ہے۔ مگر اکثر برائی کا پیش خیمہ ثابت
ہوتی ہے ! مذہبی روایات سے بھی یہی ثابت
ہوتا ہے۔

محمود۔ بہت خوب ! مجھے خوشی ہوئی کہ اور مولویوں
کے متعلق ، میں روایتاً جو کچھ آپ سے کہنا چاہتا
تھا وہ خود آپ نے ہی ظاہر کر دیا۔
اور یہی ایک بات ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتی
بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ مذہبی روایات نے
عورت کے دونو پہلو بیان کئے ہیں۔ اور
یہ خیال قریب قریب غلط ہے کہ مذہب نے عورت
کو مبدا شرارت قرار دیا ہے۔

مولانا۔ نہیں نہیں، مسٹر محمود یہ نہ کہئے مذہب نے
واقعی عورت کو برائیوں اور بے اعتدالیوں کا سبب
ٹھیرایا ہے معاشرتی معاملات میں عورت
اصلاح کا باعث بھی بنتی ہے لیکن جب دونو قسم
کے واقعات کا مقابلہ کیجئے تو ماننا پڑتا ہے کہ اکثر اس
صنف سے نقصان ہی پہنچا ہے !

محمود۔ بس یہی تو ایک بات ہے جس کا میں ثبوت چاہتا
ہوں مولانا ! میں سب سے پہلے اس امر کا
اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے مذہبی روایات میں کافی
درک کیا، ضروری معلومات بھی حاصل نہیں ہیں۔
اور میں جو عرض کروں گا وہ تراجم اور مذہبی کتابوں
سے ہوگا۔ جو عربی نہیں بلکہ غریب اردو اور فارسی
میں لکھی گئی ہیں۔ میں جہاں اپنی علمی کم
بضاعتی کا اعتراف کرتا ہوں، وہاں یہ بھی عرض
کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے جہاں تک
اس مسئلہ پر غور کرنے کا موقعہ ملا ہے، میرے
سامنے دو نو قسم کی مذہبی روایات ہیں۔
میرے پیش نظر اسنادات میں اگر ایک طرف
عورت کا مبدا شرارت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ تو
دوسری طرف عورت ایک مربی ایمان اور مکمل
انسانیت کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ جہاں تک عام
الفاظ اور لہجہ کا تعلق ہے مذہبی روایات کی بنا
پر ان دو ہی پہلوؤں میں سے کسی ایک کے حق
میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ معاف
کیجئے گا۔ آپ میری اس آزادی گفتگو سے
برا تو نہیں مان رہے ؟

مولانا۔ استغفر اللہ برا ماننے کی کونسی وجہ ہو سکتی
ہے ؟ اور پہلے یہ بتائیے کہ آپ مجھ سے
اس قدر بدظن کیوں ہو ہو جاتے ہیں ؟ آپکو
کیا حق ہے کہ آپ سب کو ایک ہی لاٹھی سے
ہانکنا شروع کر دیں ؟ کیا آپ کی یہ بدظنی بلا وجہ اور
بلا ضرورت نہیں ہے ؟

محمود۔ اوفوہ ! مولانا ! میری معذرت سے
اثر لینے میں آپ نے کس قدر مبالغہ کیا۔
میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تعارف چونکہ تازہ ہوا

ـــ میں نے مناسب سمجھا کہ استمزاج کرتا جاؤں
کہ ـــ خدانخواستہ کہیں میری گفتگو آپکے
لئے بار تو ثابت نہیں ہو رہی۔ کیا کروں
مولانا ہیں مجبور ہوں ع

ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

کا مضمون ہے۔ مجھے جن جن صاحب سے تبادلہ خیالات کا موقعہ ملا ہے سب نے یہیں آکر ہتھیار ڈال دیئے، اور پھر ـــ ہاتھا پائی پر اتر آئے ـــ،

مولانا۔ تو بظاہر یہ آپ پر غالب نہیں آسکتا ـــ آپ اس سے بھی بلا وجہ کیوں گھبراتے ہیں آپ ماشاراللہ، نوجوان ہیں اگر خدانخواستہ آپ کے سابقہ تجربہ کی بنا پر یہاں اس کی بھی نوبت آجائے تو گھاٹے میں تو میں ہی رہوں گا ـــ ـــ (قہقہہ) اچھا تو آپ اصل مطلب پر آنے کی کوشش کیجئے ـــ،

محمود۔ میرے خیال ہیں آپ بھی اس سے اتفاق کریں گے کہ پہلے آپ ذرا ان روایات کو پیش کیجئے جن سے آپ کے خیال ہیں عورت کا مبدأ شرارت ہونا ثابت ہوتا ہے ـــ اور اس کے بعد میں اپنی ناچیز معلومات کے مطابق وہ اسناد پیش کرنے کی اجازت چاہوں جو اس کے خلاف ہیں۔ اس طرح ہماری بحث اور گفتگو آسانی سے کسی ایک نتیجہ پر پہنچ سکے گی۔ اور ہم دونو کو رائے قایم کرنے میں سہولت ہوگی۔ کہئے آپ کی کیا رائے ہے؟

مولانا۔ ہاں مجھے اس سے پورا پورا اتفاق ہے۔ ـــ کہ سب سے پہلے ہم کو اس معاملہ کی دونو شکلیں مدنظر رکھ لینی چاہئیں۔ اور یہ فیصلہ کہ کونسی روایات قابل اعتماد ہیں؟ کس طرح ہوگا؟

محمود۔ بلاشبہ روایات میں ہر قسم کی حدیثیں شامل ہوگئی ہیں اور اس کا پتہ چلانا واقعی ایک اہم معاملہ ہے کہ ان غیر محدود روایات میں کون سی صحیح ہے اور کون سی غلط؟ ـــ سو اسکے لئے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ آپ جس روایت یا ثبوت کو ناقابل استشہاد قرار دیں گے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا ـــ،

مولانا۔ اچھی بات ہے ـــ تو لیجئے میں عرض کرتا ہوں۔

تصویر کا ایک رُخ

مولانا۔ لیجئے، پان تو کھائیے ـــ میں عرض کرتا ہوں۔

محمود۔ تسلیمات عرض ہیں۔

مولانا۔ بہت طویل سلسلہ ہے ـــ اور مجھے تمام شواہد شاید یاد بھی نہ ہوں، بہر حال عورت کے متعلق مذہبی کتب اور اسلاف کے اقوال دونو میں

بحث آئی ہے اور سب سے زیادہ جو بات عقلی طور پر اہم ہے وہ یہ ہے کہ مذہب عورت کو ایک مکار مخلوق قرار دیتا ہے۔ شیطان سے زیادہ مکر و فریب کس کو یاد ہونگے۔ قرآن کریم شیطان کے مکر و فریب کو بھی ضعیف بیان کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

"شیطان کا مکر کمزور ہے"

مگر جب عورت کے مکر و فریب کا ذکر آتا ہے تو اس موقعہ پر قرآن شریف کا فیصلہ یہ ہے کہ

"عورتوں کا مکر بہت بڑا مکر ہے۔"

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ کہ

"میرے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں ہے۔ عورت بائیں پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ اس کی اصلاح کرنی چاہو تو ٹیڑھی لکڑی کی طرح ٹوٹ جائے گی لیکن اصلاح قبول نہیں کرے گی۔"

یہ بھی حضور انور کا ارشاد ہے کہ

"عورتیں ناقص العقل ہیں، مذہبی امور میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن میں یہ ناقص ثابت ہوتی ہیں۔ ان سے مشورہ کر سکتے ہو لیکن ان کی رائے پر عمل نہ کرو، خیریت اسی میں ہے کہ ان کی رائے کی خلاف ورزی کی جائے۔"

ایک بزرگ کہتے ہیں۔ کہ

"عورت شیطانی جال ہے دنیا میں سب کی غلامی کرو، مگر عورت اور ہوائے نفس کی اطاعت نہ کرو۔"

ایک فلاسفر کہتے ہیں۔ کہ

"عورتوں سے معاشقہ مذہب کے لئے مضر، عقل کے لئے مضر، جسمانی صحت کے لئے مضر، غرض ہر چیز کے لئے آفت ہی آفت ہے۔ ان سے وابستہ انسان اپنی پونجی کھو بیٹھتا ہے اور دوسرے کے مال پر رال ٹپکانے کا رہ جاتا ہے۔"

ایک بزرگ کا قول ہے۔ کہ

"عورت کے نقائص کوئی کہاں تک گنوائے نجاست میں زیادہ تر اسی کا حصہ، عقل و فہم سے اسی کو عداوت، ضد سے اسی کو الفت، نماز سے اگر کسی وقت مستثنے ہو سکتی ہے تو یہی، روزے سے محروم ہو سکتی ہے تو یہی۔ سلام میں حصہ نہیں تو اسی کا، جمعہ اور جماعت سے محروم ہے تو یہی، سفر بغیر محرم کے نہیں کر سکتی تو یہی۔ کرسی عدالت پر نہیں بیٹھ سکتی تو یہی۔ نبوت سے بے بہرہ ہے تو یہی۔ باقی کونسی چیز رہ گئی ــــ؟"

غالباً مامون کا قول ہے۔ کہ

"اگر شرارت کی چلتی پھرتی تصویر دیکھنی ہو تو عورت کو دیکھو، سب سے بڑی اور موثر شرارت اس میں یہ ہے کہ کتنی ہی کوشش کرو اس میں استغنا ناممکن ہے۔"

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ

"عورت ایک قسم کی قید ہے، خدا جسکو چاہتا ہے اس سے آزاد رکھتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے اس سے پابند کر دیتا ہے"

ایک شاعر فرماتے ہیں کہ

"عورت بھی ہمارے لئے ایک شیطان ہے خدا ہم کو اس کے شر سے بچائے۔ دنیا کے معاشرتی یا مذہبی فسادات عورت ہی کی پیداوار ہوتے ہیں۔"

ایک بزرگ کی رائے ہے کہ

"عورت کی عام خصوصیت یہ ہے کہ یوں چاہے وہ ایک کام کو کبھی نہ کرے لیکن جس چیز سے اسے ایک دفعہ منع کر دو، اس کو وہ ضرور کرے گی"

ایک اور بزرگ کا قول ہے کہ

"تم پر بڑی بڑی مشکلات آئی ہونگی ـــــ مگر میں تم کو چھپی مصیبت سے متنبہ کرتا ہوں چھپی مصیبت عورت ہے خصوصاً جب کہ وہ سونے چاندی کے زیورات اور شاہی طرز کے سنگار سے آراستہ پیراستہ ہو۔ ـــــ عورت غنی کو تھکا دیتی ہے اور فقیر کو مافوق الاستطاعت کاموں پر مجبور کرتی ہے"

ایک دانا کا تجربہ یہ بتاتا ہے۔ کہ

"عورت کے پاس جاؤ تو گالیاں سنو اور ہفتہ عشرہ کیلئے باہر جاؤ تو خیانت امانت کا خطرہ"

میرے خیال میں کافی خیالات آپ سن چکے ـــــ کہئے کچھ اور بھی اضافہ کروں۔

محمود۔ نہیں بہت ہیں ـــــ مولانا! میں عورت کے مذموم پہلو کے متعلق آپ کے حوالجات سن کر اس وجہ سے اور بھی خوش ہوا کہ ان خیالات میں اکثر وجوہ وہی ہیں جو خود میری نظر سے بھی گذر چکے ہیں۔

میں اب یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اور بھی کچھ شواہد آپ پیش کریں گے یا انہیں پر اکتفا کرتے ہیں؟

مولانا۔ نہیں ـــــ اور کیا کہئے گا ـــــ اور بھی بہت سے خیالات ہیں ـــــ مگر جہاں تک میں نے غور کیا ہے، وہ انہیں کے قائمقام ہیں ـــــ کیونکہ نوعیت کے لحاظ سے جتنی شقیں ہو سکتی تھیں، وہ میں نے بیان کر دی ہیں ـــــ غالباً آپ بھی اس سے اتفاق کریں گے کہ اثر جو کچھ ہوتا ہے دلیل کی حیثیت اور مضبوطی کا ہوتا ہے ـــــ کثرت تعداد غالباً دلائل میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اب آپ اس کے خلاف روایات پیش کریں تا کہ دونو پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ہم کسی نتیجہ پر پہنچیں ـــــ"

تصویر کا دوسرا رخ

محمود - جی ہاں، عرض کرتا ہوں -

قرآن شریف نے عورت کو مرد کے لئے ایک ذریعۂ اطمینان بتایا ہے ——— ارشاد ہوتا ہے کہ

"ہم نے آدم ہی سے عورت پیدا کی تاکہ وہ اسکے لئے سکون و آرام کا باعث بنے"

حضور انور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں کہ

"مجھ کو دنیا میں سے تین چیزیں پسند ہیں عورت - خوشبو اور نماز -"

یہ بھی سرور کائنات کا ارشاد ہے - کہ

"مجھے دنیا کی تین چیزوں میں سے تین چیزیں مرغوب ہیں - گھوڑا - عورت اور خوشبو"

یہ بھی حدیث ہے کہ

"لوگ شادی کرتے وقت عام طور پر دو چیزوں کا خیال رکھتے ہیں - حسن و جمال یا مال و دولت، تم ہمیشہ سب سے پہلے مذہب اور اس کے بعد شرافتِ طبع کو ملحوظ رکھو"

یہ بھی حضور کا ارشاد ہے - کہ

"دولتِ ایمان حاصل کرنے کے بعد، انسان کیلئے سب سے بڑی نعمت خوبصورت اور نیک سیرت عورت ہے - کہ اسکی طرف دیکھنے میں لطف اور اسکو کسی بات کا حکم دینے میں لطف، اس سے بات چیت کرنے میں لطف، اور اس کے بھروسہ پر سفر چلے جانے میں اطمینان خاص حاصل ہوتا ہے - اور مرد کو مال یا عزت میں کسی قسم کی کمی کا اندیشہ نہیں رہتا

مسلم بن عبداللہ کہتے ہیں - کہ

"آنکھیں اور ہاتھ انسان کے لئے کس قدر ضروری ہیں لیکن ایک نیک عورت کے فوائد ان دونوں سے زیادہ ہیں"

ایک بزرگ نے کہا ہے - کہ

"انسان کے لئے سب سے زیادہ پرلطف اور مسرت افروز دو چیزیں ہیں - نیک عورت اور لائق فرزند"

ایک فلاسفر کہتے ہیں کہ

"عورت ایک پھول ہے اور مرد بلبل - پھول اور بلبل میں جو تعلق ہے اس سے کون بے خبر ہے"

ایک بزرگ فرماتے ہیں - کہ

"معاشرتی معاملات میں انسان کو اگر کسی سے بہترین امداد مل سکتی ہے تو نیک اور سمجھدار بیوی سے مل سکتی ہے -

اسلاف میں سے ایک بزرگ کی رائے ہے - کہ

"جس شخص کی بیوی قابل اعتماد ہو اس میں سچی دلیری پیدا ہو جاتی ہے"

ایک فلاسفر کا قول ہے کہ

"گھر کے انتظام اور اولاد کی پرورش کیلئے یا شوہر کے آرام کے لئے بیوی جو کام کر سکتی ہے وہ اور

کسی سے نہیں ہو سکتا!!

ایک حکیم کا قول ہے کہ

"نکاح جماعتوں کا شیرازہ تہذیب کی اصل اور تمدن کی بنیاد ہے"

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نظام عالم کے قیام اور تہذیب و تمدن کی تاسیس میں عورت کا کتنا حصہ ہے۔ مولانا مجھے معاف کیجئے گا میں قرآن اور حدیث پر چونکہ پورا پورا عبور نہیں رکھتا ــــ اس لئے میں سردست اس سے زائد حوالجات پیش نہیں کر سکتا۔ یہ بھی جو کچھ میں نے عرض کیا ہے مجھے خطرہ ہے کہ کہیں آپ ان میں سے اکثر کو غلط نہ کہہ دیں۔ لیکن میں صحیح اعتراضات کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ کیونکہ میں اس میدان کا شہسوار نہیں ہوں۔

مولانا۔ نہیں آپ مطمئن رہئے میں کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا جو عام طور پر لوگ ایسے مواقع پر کر لیا کرتے ہیں۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں کسی ناپسندیدہ طریقے سے آپ کو کسی بات کا قائل کروں۔ میں یہ گفتگو اس لئے نہیں کر رہا کہ آپ کو شکست دوں۔ میرا منشائے نظر یہ ہے کہ ہم آپ مل کر کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ سکیں جو واقعیت سے تعلق رکھتا ہو۔ ہاں! اب آپ یہ فرمائیے کہ عورت کے متعلق کچھ اور بھی فرمانا چاہتے ہیں؟

محمود۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ جو روایات یا اقوال میں نے آپ کے سامنے پیش کئے ہیں وہ اس مقصد کیلئے ناکافی ہیں؟

مولانا۔ کافی یا ناکافی کا سوال نہیں ہے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے خیال میں ان تمام نوعیتوں کو ملحوظ رکھ لیا ہے جو عورت کی حمایت کے لئے ناگزیر ہیں؟ یا کوئی بات اور بھی رہ گئی ہے؟

محمود۔ ہاں مولانا! میں آپ کی یاددہانی کے لئے آپ کا مشکور ہوں ــــ ایک بات مجھے اور بھی عرض کرنی ہے آپ نے دوران گفتگو میں یہ بھی کہا تھا کہ

"عورت کرسی عدالت پر نہیں بیٹھ سکتی"

اس ضمن میں مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ میں آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتا ــــ کیونکہ قرون اولیٰ میں بڑے بڑے علماء اسلام نے متعدد مواقع پر خاص خاص خواتین سے بعینہ اسی قسم کے استفادات حاصل کئے ہیں جو ایک مستفتی اور سائل حاصل کر سکتا ہے۔ قانون اسلام کے شرعی اور سیاسی دونو شعبوں میں اکابر سلف نے بعض وقت صحابیات کی نہ صرف علمیت بلکہ صیابت رائے اور استقامت

فیصلہ کو تسلیم کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے لئے اس قسم کے واقعات کی مثالیں پیش کرنا ضروری نہیں۔

مولانا۔ ہاں ہاں میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ متقدمین میں سے بعض جلیل القدر حضرات نے بعض محترم خواتین اسلام کی رائے کو ایک مستقل اور آخری رائے کا درجہ دیا ہے۔ ——،

محمود۔ تو کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ جج یا منصف بننے کے لئے ”قوت فیصلہ“ کے علاوہ کون سی چیز ہے جو کرسی عدالت پر بیٹھنے کے لئے ضروری ہو؟

مولانا۔ ہاں یہی چیز ہے جو خاص طور پر اہم ہے

محمود۔ اس کے علاوہ آپ غالباً اس سے بھی اتفاق کریں گے کہ قرآن و حدیث کے متعدد اور مختلف النوع احکامات میں مطابقت دینا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔

مولانا۔ بالکل ٹھیک ہے۔ ہر شخص یہ کام نہیں کر سکتا۔

محمود۔ آپ یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ صرف عربی داں حضرات کو یہ حق پہنچتا ہے ——؟

مولانا۔ (ایک قہقہہ کے بعد) ہاں میرا مطلب تو یہ نہیں تھا۔ لیکن اگر یہی مطلب ہو تو آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟

محمود۔ بات یہ ہے کہ بعض عربی خواں حضرات نہایت بے تکلفی سے یہ فرما دیا کرتے ہیں کہ شریعت کے احکام میں متفقہانہ رائے زنی صرف عربی دانوں کا کام ہے ——، تو میں سمجھا شاید آپ بھی یہی کہنا چاہتے ہیں ——!

مولانا۔ نہیں نہیں! آپ گھبرائیے نہیں، میں یہ نہیں کہتا اور نہ کوئی اور ذمہ دار شخص یہ کہہ سکتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ آیات قرآن پاک یا احادیث کے مفاہیم۔ ان کے مواقع۔ حالات گردوپیش۔ یہ سب باتیں ملحوظ رکھنی پڑتی ہیں۔ اور یہ سب واقعہ ہے کہ یہ تمام ضروریات ہر شخص کے دماغ میں محفوظ نہیں رہ سکتیں ——!

محمود۔ بہت بہتر، تو فقہ میں حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ کا جو درجہ ہے اس سے آپ سے بڑھ کر کون واقف ہوگا؟

مولانا۔ ہاں کچھ نہ کچھ واقفیت مجھے ضرور ہے مکمل واقفیت کا تو میں دعویٰ نہیں کر سکتا

محمود۔ بس، مجھے صرف اسی قدر کافی ہے —— امام موصوف کا قول ہے کہ

”عورت منصب قضا پر مامور کی جا سکتی ہے“

مولانا۔ بالکل ٹھیک ہے۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔

محمود۔ آپ نے عورت کے خلاف جو اقوال پیش کئے ان میں ایک خاص بات یہ بھی تھی ——

آپ کو یاد ہوگا۔ آپ نے کسی بزرگ کا قول بیان فرمایا تھا کہ

"عورت کرسیٔ عدالت سے محروم ہے"

کہئے اب آپ کی کیا رائے ہے؟

مولانا۔ (گھڑی دیکھ کر) بہت خوب، اچھا تو اب تھوڑی دیر کے لئے آرام کرلیں۔ معاف کیجے گا ۱۲ بج گئے! ہمارے ساتھی بھی دیکھیے "گھڑیاں" بن گئے ہیں ـــ وہ دیکھئے سامنے کی بنچ خالی پڑی ہے آپ اس پر آجائیے۔ لیجے ـــ پان کھائیے ـــ یہ بہت اچھا ہوا کہ تبادلۂ خیالات ہوگیا۔ اب ذرا ان دونوں پہلوؤں پر غور کیجئے ـــ میں بھی دیکھ لوں گا ـــ مجھے امید ہے کہ ہم بہت جلد کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں گے بستر کر لیجئے ـــ اور سو رہئے کیا رائے ہے۔

محمود۔ جی ہاں میں کچھ تکان محسوس کر رہا ہوں ـــ آخر آپ کو آرام بھی کرنا ہے ـــ!

مولانا۔ اور آپ کو؟

محمود۔ جی ہاں، اور ـــ مجھے بھی! السلام علیکم

فیصلہ

مولانا اور محمود دونو، تھوڑی دیر کے لئے لیٹ رہے کلکتہ میل اپنی پوری رفتار کے ساتھ ہزاروں سینکڑوں کو ملاتا پچھاڑتا ہوا ـــ چار پانچ گھنٹوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ـــ اب صبح ہوگئی۔ مولانا بشیرالدین صاحب کی آنکھ کھلی ـــ مسٹر ناصر محمود ابھی سو رہے تھے ـــ،

مولانا۔ محمود صاحب! محمود صاحب!! مسٹر محمود!!! اُٹھئے حضرت! صبح ہوگئی۔ رات بھر میں دیکھئے ریل نے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا؟ ـــ آسن سول کا اسٹیشن آگیا بنگالی مٹھائی والے پلیٹ فارم پر دوڑے دوڑے پھرتے ہیں۔ ـــ اُٹھیے! کہئے "رس گلے" کھائیے گا یا "گلاب جامنیں"؟ اُٹھیے بھی! ذرا تازہ ہو جائیے۔

محمود۔ السلام علیکم! حضرت مزاج گرامی؟ مولانا مجھے تو بنگالیوں کی "گلاب جامنوں" کی نسبت "رس گلے" زیادہ مرغوب ہیں! کوئی چائے والا نہیں ہے؟ ـــ وہ دیکھئے خانساماں بھی آگیا۔ ـــ آپ اس سے چائے لانے کو کہہ دیجئے میں کچھ نمکین، اور مٹھائی لاتا ہوں ـــ،

مولانا۔ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں ـــ وہ آتا ہی ہوگا۔

محمود۔ آپ مطمئن رہئے میں جو کچھ لوں گا سب کا سب یہیں لے آؤں گا۔ کسی قسم کی خیانت نہ کروں گا۔

مولانا۔ بہت اچھا، صاحب! بہت اچھا ـــ!

کرنا تو نہیں چاہئے، مگر اعتبار کر لیتا ہوں - جائیے لے آئیے -

ناصر محمود پلیٹ فارم سے مٹھائی وٹھائی اور الم غلم لے آئے - خانساماں چائے تیار کر کے لایا ـــــ مولانا اور محمود نے ساتھیوں میں سے دو ایک کا شکریہ لے کر کھانا شروع کر دیا - ناشتہ کر چکنے کے بعد ـــــ ناصر محمود خانساماں کو پیسے دینے لگے ـــــ مولانا نے کہا یہ ہرگز نہیں ہوگا ـــــ! مٹھائی کے پیسے کس نے ادا کئے تھے؟

محمود - میں نے ـــــ!

مولانا - تو پھر؟ جیسے آپ نے مجھے ناشتہ میں شریک کیا ہے اُسی طرح اسکے داموں میں بھی تو کیجئے ـــــ!

محمود خاموش ہو گئے - گاڑی چلنے لگی اور دونو اسی بحث میں پڑ گئے جس نے ان کو سلا دیا تھا -

محمود - ہاں، مولانا! میری معروضات کے بعد آپ نے اس امر کے متعلق کیا رائے قایم کی کہ عورت کے متعلق ان نام نہاد مذہبی حلقوں میں جو کچھ سمجھا یا کہا جاتا ہے وہ صحیح ہے یا غلط؟

مولانا - جہاں تک میں نے غور کیا ہے غیر ذمہ دار لوگوں کے علاوہ مذہبی حلقوں میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا ہے کہ "عورت مبدا رفساد ہے" اور جو لوگ یہ کہتے ہیں - اُن میں سے بھی اکثر کا مطلب یہ ہے کہ عورت اکثر معاشرتی بے اعتدالیوں کا سبب بنتی ہے - وہ یہ نہیں کہتے کہ ہر حال میں یا ہمیشہ عورت ہی ذمہ دار ہوتی ہے - بلکہ مرد کی نسبت عورت میں چونکہ جاذبیت زیادہ ہے ـــــ یا عورت اپنے خلقی منصب کے ماتحت اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتی ہے ـــــ، اور قوانین معاشرت کی پروا کرنے میں اکثر بے پروائی کی جاتی ہے - اس لئے عورت مرد کو زبان سے نہیں بلکہ اپنے وجود سے قانون شکنی کی ترغیب دیتی ہے

شریعت اسلام نے پردہ کی ضرورت اور مرد و عورت کے الگ الگ رہنے میں غالباً یہی مصلحت ملحوظ رکھی ہے -

محمود - مولانا! معاف کیجئے گا - میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ عورت ترغیب جرم میں پیش قدمی کرتی ہے - میرے پاس جتنی ضرورت ہو اتنے ہی واقعات اس کے خلاف موجود ہیں - جن سے آپ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ پیش قدمی مرد کی طرف سے ہوئی نہ کہ عورت کی طرف سے -

مولانا - واقعات کی ضرورت جب ہو کہ میں اسے تسلیم نہ کروں - مجھے خود اس سے اتفاق ہے کہ عورت پیش قدمی نہیں کرتی اور کبھی نہیں کرتی ! جو چیز پیش قدمی کرتی ہے جو چیز سب سے پہلے

مرد کے لئے مشیر محرک کا کام دیتی ہے، اور صاف
صاف الفاظ میں جو چیز مرد کو آمادۂ جرم کرتی ہے
اور جس سے وہ معاشرت کے عام قانون کو پامال
کرنے پر مجبور کرتی ہے —— وہ عورت کا کوئی
خاص فعل نہیں، بلکہ اس کا وجود ہے ——
—— ! اور بس۔

محمود۔ تو کیا میں یہ سمجھوں کہ عورت "مجسمۂ شر" ہے

مولانا۔ ہرگز نہیں، میں یہ نہیں کہتا —— میرا
یہ مطلب نہیں ہے —— میں تو عورت کو باعث
رحمت، تکمیل دہندہ ایمان اور سرمایۂ اطمینان سمجھتا
ہوں، لیکن یہ بھی سمجھتا ہوں کہ حالات غیر مناسب
شکل اختیار کرلیں تو یہی عورت مخرب ضبط اور
دشمن قانون ثابت ہوتی ہے —— !

محمود۔ بعض حالات ضرور مستثنیٰ ہو سکتے ہیں۔

مولانا۔ بس تو یہی سمجھئے کہ استثنےٰ ہر قانون میں
ہوتا ہے۔ اور ہمارے آپ کے خیالات ایک
ہی چیز پر متفق ہیں۔ صرف استثنےٰ کا فرق ہے
—— اور وہ ہمارے یا آپکے بس کی چیز نہیں
ہے —— !

محمود۔ مولانا! مجھے افسوس ہے کہ ابھی بہت سے
امور جو اس ضمن میں ضروری تھے، باقی رہ گئے ہیں۔
پردہ، تعلیم، اور اسی قسم کے اور اہم معاملات
پر میں آپکے خیالات معلوم کرنا چاہتا تھا مگر میں
دیکھتا ہوں کہ علیحدگی کا وقت قریب ہے اور ہنوز
اس مسئلہ کا ابتدائی پہلو بھی اختتام تک نہیں
پہنچتا نظر آتا۔

مولانا۔ ابتدائی پہلو تو میرے خیال میں اب ختم ہو
چکا۔ اور کیا باقی ہے؟ میری رائے جیسا کہ آپ
نے سنا یہی ہے کہ برائی اور بھلائی کا پہلو انسان
کیا کائنات کی ہر چیز میں موجود ہے ——
اس لئے یہ ایک واضح بات ہے کہ عورت بری
بھی ہو سکتی ہے اور اچھی بھی۔ اگر اس کے
حالات نے قوانین معاشرت کی ترتیب اور
حفاظت کے ماتحت پرورش پائی ہے تو عورت
ایک سرمایۂ اطمینان ہے۔
اور اگر اس کے حالات صرف جذبات اور
خود غرضیوں —— بلکہ کم اندیشیوں ——
کے سایۂ ضلالت کی پیداوار ہیں، تو عورت یقیناً
ایک مجسمۂ شرارت کا نام ہے —— !
بھئی محمود! اصل یہ ہے کہ عورت ہو یا مرد اصلیت
اور واقعیت کے لحاظ سے ان میں سے کوئی بھی
برا نہیں ہے —— ان دونوں میں جو کچھ تبدیلی
ہوتی ہے ماحول اور سوسائٹی کے برے بھلے اثرات
سے ہوتی ہے —— !

محمود۔ ہاں، اس سے ہر شخص اتفاق کرے گا۔ !

مولانا۔ ضرور اتفاق کرے گا! حضور انور صلی اللہ علیہ

وسلم نے بچوں کے متعلق ایک حکیمانہ قانون بیان فرما دیا ہے ——— اس کو پڑھئے اور پھر واقعات پر نظر کیجئے تو آپ کا دل شریعت کے دور اندیشانہ احکامات کے سامنے خود بخود جھک جائیگا ——— آپ فرماتے ہیں کہ

"بچہ پیدا ہوتا ہے تو بالکل معصوم ہوتا ہے - اس کے ماں باپ اس کو یہودی نصرانی یا مسلم بنا دیتے ہیں ——"

بعینہٖ یہی حالت مرد یا عورت کی ہے ابتدائی حصہ عمر میں جو معصومیت یا سادگی ہر ایک کو نصیب ہوتی ہے حالات گرد و پیش اس کو بدل دیتے ہیں - اس لئے فی نفسہٖ، عورت میں کوئی برائی ہے نہ مرد میں، دونوں کی سوسائٹی جس طرح کی ہوگی وہ اسی طرح کا اثر لیں گے اور اسی کے ماتحت برے یا بھلے کہلائیں گے - اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس بارہ میں سعدی بابا جو کچھ کہہ گئے ہیں وہ عین حقیقت ہے - اور مرد یا عورت کے متعلق انہوں نے جو فیصلہ کیا ہے، میرے خیال میں اس وقت تک تو اس میں ترمیم کی گنجائش نہیں ہے

محمود - مولانا! وہ کیا ہے ——— ؟

مولانا - یہی مشہور شعر جو ہر شخص کی زبان پر جاری ہے

محمود - یعنی ؟

مولانا :- ؎

نہ ہر زن، زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

محمود - جی ہاں، واقعی، خوب فیصلہ ہے ——— اچھا مولانا، خدا حافظ، یہ میرا ایڈریس رکھ لیجئے اور اپنا کارڈ مجھے عنایت کیجئے۔

مولانا - (کارڈ دیکر) اچھا تو اب خط لکھئے گا نہ

محمود - ضرور ——— السلام علیکم

قیامت تھی یہ پیمانہ اگر لبریز ہو جاتا

(از حضرت جگر مراد آبادی)

جنونِ عشق میں احساس اتنا تیز ہو جاتا
جو چھو جاتی ہوا، دل درد سے لبریز ہو جاتا

یہ ساری لذتیں ہیں میرے شوقِ نا مکمل تک
قیامت تھی یہ پیمانہ اگر لبریز ہو جاتا

نہ رکھا دل کو احساسِ گنہ نے مستقل ورنہ
یہی ظلمت کدہ اک دن تجلی خیز ہو جاتا

شفق

(از جناب خواجہ دل محمد صاحب ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج و میونسپل کمشنر لاہور)

آسمانِ شام پر دیکھو شفق پھولی ہوئی
اس زرِ خوں رنگ پر دنیا ہے کیوں بھولی ہوئی

ابر کے ٹکڑے ہوئے ہیں سرخ مانندِ چمن
روئی کے گالوں میں جیسے آتشِ گل پیرہن

آفتابِ شعلہ رو کی شعلہ کاری دیکھیے
جل رہی ہے فیلِ گردوں کی عماری دیکھیے

خمِ فلک کا ٹوٹ کر بہنے لگی عشرت کی مے
سیر ہو کر لطف لے لے بادہ کش گر کوئی ہے

بحرِ زریں میں ہیں کندن کے جزیرے دیکھ لو
ڈھیر ہیں یاقوت کے اور اُن میں ہیرے دیکھ لو

صنعتِ خالق کا ذوقِ اختراعی دیکھیے
سیم سے زر ہو گیا تارِ شعاعی دیکھیے

شامِ دوشیزہ کے یہ سر کے سنہری بال ہیں
یہ دلِ مہ کے پھنسانے کے طلائی جال ہیں

خونِ امیدِ حریصانِ جہاں کہئے اسے
یا مآلِ جوششِ قلبِ تپاں کہئے اسے

عاشقوں کی یہ تمناؤں کے زریں ڈھیر ہیں
اور حریصوں کی نظر میں لعل و زر کے ڈھیر ہیں

میگساروں کے لئے یہ آتشِ سیال ہے
قلبِ شاعر کے پھنسانے کو سنہری جال ہے

فطرتِ عالم کا گویا قلب خوں آشام ہے
دل کی صبحِ زندگی کا لالہ گوں انجام ہے

حدتِ جانسوز سے ہے برگ و سازِ زندگی
آتشِ شعلہ زباں کہتی ہے رازِ زندگی

گل کھلاتا ہے جو سورج شعلۂ بے دود میں
ہے یہ ابراہیم گویا آتشِ نمرود میں

آسماں کی سیر لکھی تھی کہیں تقدیر میں
زعفراں کا کھیت تھا یہ خطۂ کشمیر میں

عکس سے دریا کے اندر آبِ زر بہنے لگا
ہر حبابِ قطرہ وش بن کر گہر بہنے لگا

لگ رہی ہے آگ سی جنگل کے اندر دیکھیے
جھاڑ آتش کا بنا نخلِ ثمرور دیکھیے

پھر بہار آئی چمن میں گل بسنتی ہو گئے
لاجوردی کھیت تھے جو گل بسنتی ہو گئے

برگ و بر ہر پیڑ کا کیوں زرد ایسا پڑ گیا
یا کوئی لمسِ طلاساز انکو زریں کر گیا

سرخ ہے مینار کی چوٹی تو دیکھو دور سے
جلوۂ عرفاں یہاں بھی کم نہیں ہے طور سے

کیفِ انتظار

یونانی اساطیر کا ایک ورق

(مترجمہ جناب کنہیا لال ثاقب بی اے آنرز)

یہ ایک حقیقت ہے کہ زمانے کی تاریخ جہاں عشق و محبت کے افسانوں سے مالا مال ہے وہاں ایسے اوراقِ خونِ جنگ سے بھی زیادہ رنگین ہیں۔

لینڈر، نہایت تنومند، اور شکیل نوجوان تھا وہ ایبی ڈاس کا رہنے والا تھا —— ہاں! یہ وہی بامراد نوجوان تھا جو ہیرو کی —— (تھریس کے ساحل پر الفروڈائٹ کے ایک گرجا میں تمام متبرک فرائض کی مالکہ) —— محبت کا دم بھرتا تھا اور اسی وجہ سے اس کا نام دنیا کے طول و عرض میں اچھی طرح مشہور تھا۔

ان مشتاق نگاہوں کی تعداد کا اندازہ بہت مشکل ہے جو ہیرو کو اپنا "مرکزِ محبت" بنائے ہوئے تھیں۔ اور اس گرمجوشی کے صدقے، ایک "نگاہِ لطف" کی امیدوار تھیں۔

لیکن —— وہ "حسن کی دیوی" —— لینڈر پر مائل ہو چکی تھی!

لینڈر اپنی محبوبہ سے جسمانی طور پر اس قدر دور مقیم تھا۔ کہ دونوں کے درمیان دریا ہیلسپانٹ روز و شب مد و جزر کے مناظر پیش کرتا تھا۔ اور یورپ سے بھیجے ہوئے محبت آمیز تبسم کے، ایشیا تک بحفاظت پہنچنے میں سدِ راہ تھا ——

لیکن —— محبت کا مضبوط ترین ہاتھ کیا نہیں کرسکتا۔ اس کے آگے بحرِ ذخار، "پانی کی ایک لکیر" سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔

چنانچہ ہر روز مغرب کے وقت، شام کی زریں رنگینیوں کے ساتھ —— [illegible] اپنی متجسس نگاہیں —— خیمہ گر [illegible] ان تندیوں پر جمائے ہوئے —— جو ہیرو [illegible] عاشق کے لئے شام ہی روشن کر دیتی تھی لینڈر اپنے مسکن سے نکلتا۔

یہ روشن قندیلیں —— لینڈر کے لہروں کے عین سینے میں چھلانگ مارنے کا اشارہ [illegible]



ہوتیں جن کے صدقے وہ ان بے پناہ موجوں کو شیر نر کی طرح چیرتا ہوا۔ رات بھر ——— "آغوش محبت" کے مزے لوٹتا۔ اور صبح صادق سے پہلے پہلے تازہ دم ہو کر اپنا درسنہری خراج محبت ——— "رخصتی بوسہ" وصول کرتا ہوا ایبی ڈاس کے اس کنارے واپس پہنچ جاتا۔

آخر کار گرمی کا خوشگوار موسم ——— گرمجوشی محبت کا خوش نما عرصہ ——— ختم ہوگیا۔ اور موسم سرما اپنے بادلوں کی فوج کے ہمراہ آوارد ہوا۔ کئی ایک قسم کی طوفانی بلائیں بھی ساتھ آئیں ——— !

لیکن وہ "یار آشنا" ——— ان تمام مصائب کے لئے مشہور تھا۔ ایک شام ——— طوفانی شام کو اس "چراغ طور" پر نگاہ جمائے پانی کے عین درمیان لینڈر دم توڑ بیٹھا۔ ہاتھوں میں سکت نہ رہی۔ طوفان زبردست تھا۔ ہوا کے تھپیڑوں نے وہ "قابل لطف" ——— گل کردی ——— آہ!

وہ پر اضطراب طوفانی رات ہیرو نے نہایت بے چینی سے کاٹی۔ خوف و امید کے دو "متضاد" پہلوؤں نے ——— "کہیں وہ آج پانی میں کود نہ پڑا ہو!" اور "نہیں نہیں! آج وہ روانہ نہیں ہوا ہوگا!" ——— اسے تمام شب بیخ پا بنائے رکھا ——— !

لیکن صبح کی پہلی کرن ——— اس کے لئے موت کا پیغام لائی۔ جونہی گرجا کے مینار کے پاس کھڑے ہو کر اس نے نگاہ دوڑائی پہلی ہی نظر میں لینڈر کی سفید نعش، چٹانوں کے دامن میں دیکھ پائی ——— !

ہیرو نے ایک آہ حسرت آگیں کے ساتھ اپنی متبرک پوشاک چاک کردی۔ اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح پانی میں کود پڑی ——— اور اپنے آغوش محبت میں جان دے دی ——— !

جوگن

(ہندوستانِ قدیم کی ایک موسیقانہ رات کا تصوّر)

(از اختر شیرانی)

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے　　موسیقیِ حزیں کے دریا بہا رہی ہے
غمگیں نوائیوں سے بے خود بنا رہی ہے　　دنیا کے ہر اثر کو دل سے مٹا رہی ہے
سوئی ہوئی فضا کا شانہ ہلا رہی ہے　　ہر جنبشِ زباں سے مُردے جلا رہی ہے
بیدار کر رہی ہے مدہوش گھاٹیوں کو　　خوابیدہ ساحلوں کی نیندیں اُڑا رہی ہے
ہر لرزشِ صبا میں طوفاں امنڈ رہے ہیں　　پنچم میں کیا رسیلی تانیں اُڑا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

اٹھکھیلیوں کا سن ہے ہنس بولنے کے دن ہیں　　لیکن نہ جانے کیوں وہ آنسو بہا رہی ہے
آئینہ رنگ سینہ کچھ کھل رہا ہے جس میں　　دوشیزگی کی گنگا طوفاں اُٹھا رہی ہے
اک گیروانہ ساری میں ہے بدن چھپائے　　یا ہلکی ہلکی بدلی سورج پہ چھا رہی ہے
اک بحرِ یاسمیں پر لہرا رہی ہے ناگن　　یا اس کی زلفِ مشکیں سینہ پہ آ رہی ہے
ہے اک ستار اس کے آغوشِ نازنیں میں　　دو نازک انگلیوں سے جس کو بجا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

سبزہ پہ چاندنی کے بادل برس رہے ہیں　　یا کوئی حورِ جنت آنسو بہا رہی ہے
ہے موجزن فضا میں اک آبشار سیمیں　　یا ملکۂ پرستاں موتی لٹا رہی ہے
اک گردِ مرمریں ہے چھائی ہوئی افق پر　　جس کو ہوائے صحرا کوسوں اُڑا رہی ہے
اک موجِ گوہریں سی ہر پھول پر ہے رقصاں　　نغمہ کی بوئے رنگیں جس میں سما رہی ہے

یا دن کے مقبرہ پر دوشیزۂ شب آ کر — گلہائے نور کی اک چادر چڑھا رہی ہے
دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

فرشِ زمردیں پر کچھ پھول سو رہے ہیں — نغمہ کے پر کی جنبش جن کو جگا رہی ہے
جنگل مہک رہا ہے کلیاں چٹک رہی ہیں — ہر تان میں الٰہی کیا گل کھلا رہی ہے
وادی میں موجزن ہے نغموں کی کیف ریزی — ہر پھول ہر کلی پر مستی سی چھا رہی ہے
اک نہر بہہ رہی ہے تھوڑے سے فاصلہ پر — گاتی ہوئی جو اپنی منزل کو جا رہی ہے
یا ملکۂ سمندر موجوں کے زمزموں میں — تاروں کے دیوتا کو نغمے سنا رہی ہے
دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

جنگل کے جانور کچھ بیٹھے ہیں اس کے آگے — رو رو کے جن کو اپنی بپتا سنا رہی ہے
خونخوار شیر بھی ہیں وحشی غزال بھی ہیں — لیکن وہ سب کے دل پر سکہ جما رہی ہے
کچھ سانپ جھومتے ہیں رہ رہ کے مست ہو کر — اک موجِ وجد ان کی رگ رگ پہ چھا رہی ہے
طاؤس ناچتے ہیں یوں بے قرار ہو کر — گویا ہر ایک پر میں بجلی سما رہی ہے
غمگیں نوائیوں سے ایسا سماں بندھا ہے — رو رو کے جیسے فطرت طوفاں اٹھا رہی ہے
دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

یہ موہنی بنی ہے کس کی لگن میں جوگن؟ — یہ سیلِ درد کس کے غم میں بہا رہی ہے؟
ہاں شاید اس کی ننھی معصوم آتما ہیں — ہر کی پریم اگنی لو کے لگا رہی ہے!
ہر بن میں ہر نگر میں ہر گھر میں ہر ڈگر میں — پھر پھر کے اپنے دل کی چنتا مٹا رہی ہے
یا ہر کی جستجو میں تیرتھ کی آرزو میں — کاشی سے آ رہی ہے متھرا کو جا رہی ہے
یا جگ کی آفتوں سے تنگ آ کے بن میں جا کر — پرماتما کو اپنا دکھڑا سنا رہی ہے
دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

ہر لفظ میں چھپی ہے وحشت کی ایک دنیا — دل کی ہر آرزو کو مجنوں بنا رہی ہے
اک آگ سی بھری ہے غمگین راگنی میں — دیپک سنا سنا کر تن من جلا رہی ہے
روحانیت کے نغمے منہ سے نکل رہے ہیں — مُلکِ ابد کی جانب سب کو بلا رہی ہے

پردہ سا اُٹھ گیا ہے آنکھوں کے سامنے سے   کیا جانے کس جگہ کے جلوے دکھا رہی ہے
کچھ سوز ہے بیاں میں، کچھ درد داستاں میں   شعلے اگل رہی ہے، چھریاں چلا رہی ہے
دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

دنیا سے ہو رہی ہے بیزار میری ہستی   دل ہاتھ سے چلا ہے، جاں لب پہ آ رہی ہے
بتخانہ جبیں میں سجدے مچل رہے ہیں   کافر ادا صنم ہے، کافر بنا رہی ہے
معمورِ غم نوائی ہے، ہر کلی کا دامن   فیاض مطربہ ہے نغمے لٹا رہی ہے
اک صوتِ سرمدی ہے ہر ذرہ کی زباں پر   موسیقی ازل کے نغمے سنا رہی ہے
ساری فضا پہ طاری ہے اک غبار ماتم   گویا تمام وادی آنسو بہا رہی ہے
دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

اب نغمے سو گئے ہیں باجہ بھی تھک چلا ہے   محشر اٹھا چکی ہے فتنے جگا رہی ہے
ایسی دبی صدا ہے گویا عروسِ نغمہ   منہ پھیر کر ہوا سے دامن چھڑا رہی ہے
یا کچھ غنودگی کے عالم میں مست کوئل   دھرتی کی گوپیوں کے دل گدگدا رہی ہے
کچھ کھل گیا ہے جیسے بادل کوئی برس کر   یا شمع جل جلا کر اب جھلملا رہی ہے
لو وہ ستار کو بھی نیند آ گئی بغل میں   لو وہ ستار اٹھا کر جنگل سی جا رہی ہے
دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

میں تو مگر کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں   جیسے وہ ظالم اب تک ویسے ہی گا رہی ہے
اب تک فضا پہ ہے وہ کھویا ہوا سا عالم   اب تک افق پہ یکسر مستی سی چھا رہی ہے
اب تک اٹھا رہا ہے ساز اس کا ابر نغمہ   اب تک زبان اس کی بجلی گرا رہی ہے
پھولوں سے اب تک اُسکے نغمے ٹپک رہے ہیں   پتوں سے اب تک اس کی آواز آ رہی ہے
اب تک میں سر جھکائے حیرت زدہ کھڑا ہوں   اب تک وہی تجلی آنکھوں پہ چھا رہی ہے
دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

دستۂ گل

جناب سید سلطان حیدر صاحب جوش (علیگ) کا خط

اختر شیرانی کے نام

بیل پور۔ پیلی بھیت
۱۵۔ جولائی ۱۹۲۰ء

یاد فرمائیے بے نوایان! السلام علیکم۔

آپ کا گرامی نامہ اردو مرکز کے متعلق مجھے آج ہی ملتا ہے۔ اور آج ہی جواب دیتا ہوں۔ اس لحاظ سے جواب دیتا ہوں کہ الزام تاخیر سے محفوظ رہ سکوں

اس سے پیشتر کہ ان سوالات کا جواب دوں جو آپ نے اس تحریر میں قایم کیے ہیں، یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ ایک ناچیز و گمنام ہستی کے متعلق رائے قایم کرنے میں غیر معمولی۔ بلکہ ایک حد تک ناجائز خوش اعتقادی سے کام لے رہے ہیں۔ میرے مضمون کے بہارستان میں شایع ہونے کے موقعہ پر جو ریمارک آپ نے میرے متعلق دیئے تھے اسی وقت سے مجھے آپکی غلط فہمی کا گمان ہوگیا تھا۔ اور اب وہ یقین کے مرتبہ تک پہنچا جاتا ہے۔ آپ مجھے محض خوش اعتقادی کی غلطی پر خدا جانے کیا کچھ سمجھ رہے ہیں۔ اور میری حقیقت و ابساط کے انکشاف پر مجھے خوف ہے کہ آپ کو حد درجہ مایوسی ہوگی

اب اپنے سوالات کا جواب ملاحظہ فرمائیے!

(۱) اپنی مختصر سوانح عمری لکھیے!

ایک ایسے ذلیل ترین شخص کو پیش نظر کر لیجیے جس نے اپنی عمر عزیز کی تمام گھڑیاں خرافات و معاصی کا انبار لگانے میں صرف کی ہوں اور ہمیشہ حقیقی مقصد حیات کے خلاف عمل کیا ہو۔ بس یہی میری مختصر سوانح عمری ہوگی۔ جناب من! میں اور سوانح عمری!؟ آپ کس وہم میں پڑے ہیں کہاں وقائع عالی اور کہاں متوا تیلی بانہ میں بار ہوں، اور نہ تماشا گاہی۔ پھر یہ "اپنی بیتی" سنانے سے مقصد؟ کیا آپ رات کی تاریکی میں ضیائے آفتاب کے متلاشی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے ملزم قرار پائینگے۔ اگر اب بھی آپ نہیں مانتے تو میری سوانح عمری کا لب لباب سن لیجیے

با نام کنندہ نکو نام چند

(۲) مضمون نگاری کی ابتدا کس سنہ میں ہوئی؟

سنہ اور تاریخ بھول جانا میری طبعی کمزوری ہے اسکول اور کالج کے امتحانوں میں تاریخ کے پرچہ میں سب سے زیادہ وقت مجھے سنہ و تاریخ کے یاد کرنے میں پیش آتی تھی۔ اپنی مضمون نگاری کی ابتدا کا سن یاد رکھنے کی سزا میرے حافظہ سے کس طرح سرزد ہوسکتی ہے؟

(۳) پہلا مضمون کب۔ کس پرچہ میں اور کس عنوان سے شایع ہوا؟

شاید اس کا کچھ تھوڑا بہت جواب دے سکوں، مگر یہ ادھوری تشریح کس کام کی ہوگی۔

(۴) مضمون نگاری کی تحریک کے اسباب کیا تھے؟

یہ خوب یاد ہیں اور تمام عمر یاد رہیں گے۔ مگر کیا یہ ممکن ہے کہ اپنے ان جذبات و محسوسات کو ظاہر کردوں جو آج تک انتہائی کوشش کے ساتھ سینہ میں دفن رکھے گئے ہیں حاشا و کلا۔ ناممکن! میں ان اسباب کو ظاہر نہیں کرسکتا وہ میری ملکیت مسرت انگیز ہیں۔ اور شرکت غیر کی گنجایش اس میں مطلق نہیں۔

(۵) آپ کی مضمون نگاری کا کوئی خاص طریقہ یا اصول ہو تو وہ بھی تحریر فرمائیے۔ یعنی لکھنے سے پہلے اور لکھنے کے دوران میں مضمون لکھنے کے متعلق آپکے خیالات کیا ہوتے ہیں؟

اس کے متعلق البتہ بہت کچھ لکھ سکتا ہوں مگر نہ وقت ہے نہ حاجت، لہذا خموشی معنی دارد کہ درگفتن نمی آید" پر کاربند ہونا بہتر سمجھتا ہوں لکھنے سے پہلے یہ خیال ہوتا ہے کہ "متقاضی حضرات نے ناطقہ بند کر رکھا ہے" اور دوران تحریر میں یہ خیال ہوتا ہے کہ "جس طرح ممکن ہو جلد سے جلد مضمون ختم کرکے ایفائے وعدہ کا مرتبہ حاصل کرلیا جائے" مضمون کے متعلق ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو بے تکا ہو۔

(۶) آپ کے نزدیک آپ کی سب سے بہتر تحریر کون سی ہے؟

میرے نزدیک میری بہترین تحریر ابھی تک میرے دماغ سے نکل کر زیب قرطاس نہیں ہوسکی ہے۔ اس کے لئے دنیا کو میری موت تک انتظار کرنا باقی ہے۔

(۷) اپنی تصویر عنایت ہو!

یہ ممکن ہے مگر جوابات بالا کے بعد شاید آپ بھی اس کو ضروری نہ سمجھیں۔ اور در اصل ایک گمنام ہستی کی تشہیر سے زیادہ اور بھی صورتیں ہیں جن میں اس کو سزا دی جاسکتی ہے۔

(۸) تصویر کا کوئی بلاک نہیں بنوایا گیا۔ اور نہ بننے دیا گیا۔

الحمد للہ! کہ سب امور کا جواب ہو گیا۔ اب
فرمایئے اور کہاں تعمیل ارشاد باقی رہ گئی؟
کرمفرمائے من! میرا مسلک گمنامی ہے نہ کہ
تشہیر۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں خود اپنے عیوب و
ہیچ مدانی کو ایڈورٹائز کروں۔ یا۔ پھر جھوٹ اور
افسانہ نگاری سے اپنے متعلق بھی کام لوں! میں
ان دونوں میں سے کسی ایک کا بھی اہل نہیں پھر
اس مجبوری کو معذوری کیوں نہ سمجھ لیجئے؟
امید ہے آپ مطمئن ہو جائیں گے۔ خدا
کرے۔ ایسا ہی ہو۔
ختم کر چکنے کے بعد پھر خوف پیدا ہوتا ہے کہ آپ
خدانخواستہ اس جواب باصواب سے مکدر نہ ہو جائیں
تاہم آپ کی طباعی و ذہانت سے ایسے فرسودہ عمل
کی امید نہیں ہوتی۔ لہذا؟ —— ہاں
—— لہذا —— امید کرتا ہوں کہ میری تحریر
آپ کو مطمئن کر دے گی۔ اور آپ مجھے اس
معاملہ کے ناقابل سمجھ کر بخش دیں گے۔ اور
نظر انداز کر دیں گے۔ والسلام فقط

مناظر برشگالی

(از جناب محمد زبیر صاحب روحی کانپور)

رنگ و بوئے جانفزا لائی بہار برشگال
آج وقف لغزش مستانہ ہے کالی گھٹا
تیرگی منت پذیر جلوۂ رندانہ ہے
موتیوں کے ہار ابر تیرہ کی گردن میں ہیں
اس قدر صحن چمن میں فیض مستی عام ہے
آج ذوق زہد بھی ہے مے پرستی کی طرف
دیکھ کر سبزے کا خوش منظر یہ ہوتا ہے یقین
ہے ادائے رحمت خالق۔ ادا برسات کی

پھول برساتی ہوئی آئی بہار برشگال
کیا ہوا پر جھومتی چلتی ہے متوالی گھٹا
کالی کالی یہ گھٹا ہے یا کوئی میخانہ ہے
لب پہ اک شور طرب ہے بجلیاں دامن میں ہیں
خندۂ مستانہ سے ہر پھول گویا جام ہے
دل کا ہر ذرہ کھنچا جاتا ہے مستی کی طرف
بال بکھرائے ہوئے بیٹھے ہیں صدہا نازنین
ایک پیغام مسرت ہے ہوا برسات کی

باغ میں بیٹھا ہوا ہے روحی رنگین نگار
کس قدر ہے آج وہ محو تماشائے بہار

کلامِ عاشق

(از جناب استاد الشعراء صاحبزادہ احمد سعید خاں صاحب عاشق ٹونکی)

غمِ فرقت گوارا تھا تجھے یا ناگوارا تھا ۔۔۔ مگر تمہارا رشک سے بہتر کہ چھوڑو غم تمہارا تھا
رہا ہے ضبط ہی سے آج دعویٰ پاکبازی کا ۔۔۔ وگرنہ شوق نے تو کیا نہ کچھ دل کو ابھارا تھا
بس اب بے بس ہوں کیوں اتنی گرائی لیکر سکراتے ہو ۔۔۔ بڑی مشکل سے تنہائی میں جی کو میں نے مارا تھا
تمہیں یہ آگیا باور اسے میں کوستا عل کو ۔۔۔ ارے توبہ کہ دشمن تو مرے پیارے کا پیارا تھا

جو یہ پوچھا مرا مرنا گوارا تھا تو فرمایا
کہ ہاں کہہ تو دیا میں نے گوارا تھا، گوارا تھا

افسانۂ دل

(از جناب چراغ حسن صاحب حسرت ایڈیٹر رسالہ "آفتاب" کلکتہ)

بادلوں کی سرزمیں میں ایک آتش پارہ تھا ۔۔۔ برقِ مضطر کی طرح جو رات دن آوارہ تھا
مضطرب رکھتی تھی اس کی شعلہ سامانی اسے ۔۔۔ بجلیاں دیتی تھیں درسِ خانہ ویرانی اسے
اسکی فطرت دردو مایوسی کی تھی سرمایہ دار ۔۔۔ دور تھا اس کے جہاں سے عالمِ صبر و قرار

گہہ ملک کے سبحۂ زنار کا دانہ بنا ۔۔۔ اور کبھی شمعِ تمنا کا وہ پروانہ بنا
حسن کی پریوں کی گودوں میں مچلتا بھی رہا ۔۔۔ شمع بن کر شوق کی محفل میں جلتا بھی رہا
مدتوں از نار رہا وہ عالمِ تخئیل میں ۔۔۔ اور رہا برسوں فروزاں عرش کی قندیل میں
مدتوں دامن میں رکھا آرزوؤں نے اسے ۔۔۔ دربدر پھرنا سکھایا جستجوؤں نے اسے
خالقِ کونین کا فرماں بجالانا پڑا ۔۔۔ یعنی پستی کی طرف اک دن اسے آنا پڑا

مہرِ الفت کی ضیا سے ماہِ کامل بن گیا
میرے سینے میں اتر آیا مرا دل بن گیا

اُردو دُنیا

ایک افسانہ نگار کی قدر افزائی !

ہم نے اس خبر کو نہایت مسرت سے سنا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے اُن علمی انعامات میں سے جو اُس نے بنظر قدر شناسی مصنفین و مؤلفین کے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ اس مرتبہ پنجاب کے نامور افسانہ نگار مسٹر سدرشن کو اُن کے افسانوں کے ایک مجموعہ "بہارستان" پر ایک انعام ساڑھے سات سو کا ملا ہے۔ ہم مسٹر سدرشن کو اُن کی اس مخصوص قدر افزائی پر مبارکباد دیتے ہیں ——!

خواتین کی عریاں نویسی !

کے عنوان سے آجکل اُردو دنیا میں ایک دلچسپ بحث چھڑی ہوئی ہے۔ کہ ادب و شاعری میں خواتین کی عریاں روش جائز ہو سکتی ہے یا نہیں ؟ اس پر موافق و مخالف دونوں طرح کے خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے لیکن ہمیں تعجب ہے کہ یہ بحث اب تک "مردانہ" حلقوں ہی تک محدود ہے۔ اور نسوانی طبقہ میں سے ایک آواز بھی موافق یا مخالف سامعہ نواز نہیں ہوئی —— جو مرد خواتین کی عریاں نویسی کے مخالف ہیں۔ اُن کے انداز برہمی سے یہ پایا جاتا ہے۔ کہ ان سے بہتر خواتین کا ناصح مشفق کوئی نہیں۔ اور جو لوگ خواتین کے اس "خوبصورت گناہ" کی تائید کر رہے ہیں۔ اُن کے طرز بیان سے یہ جھلکتا ہے کہ ان سے بڑھ کر خواتین کا کوئی ہمدرد نہیں لیکن حقیقی ہمدردی اور ناصحانہ شان کی جھلک کہیں نظر نہیں آتی۔ ورنہ یہ تحریک بے اثر نہ رہتی —— ہم اس معاملہ میں اس وقت تک خاموش رہنا مناسب سمجھتے ہیں۔ جب تک کہ خود "مدعا علیہ" کی کوئی جوابی چیز اس بحث کے لئے صحیح ماحول پیدا نہ کر دے ——!

غالب و ذوق !

موقر "عصر نگار" (بھوپال) کے صفحات پر ایک اور بحث غالب و ذوق کی شاعرانہ حیثیات کے موازنہ پر باصرہ نواز ہو رہی ہے۔ ایک گروہ غالب کی پرواز فکر کی بنا پر اُسے آسمان شاعری تک پہنچاتا ہے۔ اور دوسرا زبان و بیان کی قدرت و مہارت کی بنا پر ذوق کی بلندی مرتبت کا مدعی ہے۔ زرا —— سمجھ کا پھیر ہے۔ ورنہ غالب و ذوق کے فرق مراتب کا فیصلہ اب کسی قسم کی بحث و تمحیص کا محتاج نہیں رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ نہ تو غالب اپنے طلسمی الفاظ و تراکیب اور

پیچیدگیٔ تخئیل کی بنا پر غالب بنے جن کی شکایت کیجاتی ہے۔ اور نہ ہی ذوق کی مہارتِ زبان اور سادگیٔ بیان کی عمومتیں، کسی خاص وقعت کی مستحق ہیں جن کی تعریف میں زمین و آسمان کی قلابے ملائے جارہے ہیں۔ بلکہ یہ سب محض ذوقِ سلیم کا فیضان ہے۔ جس نے غالب کو "مہمل گوئی" کے باوجود غالب تسلیم کرالیا۔ اور ذوق کی بدذوقی پر ہمیشہ کے لئے توثیق کی مہر ثبت کردی۔ جسے مرحوم پروفیسر آزاد کا سحرِ انشاء بھی نہ توڑ سکا —— کیا ہم اس بحث کے حریفوں سے یہ استدعا کرنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں۔ کہ ان کو اس قسم کی بحث آرائیوں سے پہلے اپنے سینہ میں خالص دردِ شعر ہی پیدا کرنا چاہیئے
کب مدِ مقابل آئینہ تھا؟ تم نے اپنی طرف نظر کی؟

ادبستان کی اشاعت!

ملک کے مشہور ادیب مولانا خلیقی دہلوی کے ادبی مضامین کا مجموعہ "ادبستان" جس کی اشاعت کا اشتہار کے طور پر برابر اعلان ہوتا رہا ہے، خوشی کی بات ہے۔ کہ عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں۔ کہ یہ مجموعہ اپنی گوناگون رعنائیوں کے اعتبار سے اُردو ادب میں ایک سنہری اضافہ ہوگا جو لوگ اُس کے انتظار کی تکلیف سے تنگ آکر "گالیوں" پر اُتر آئے ہیں۔ اُن کو ذرا صبر سے کام لینا چاہیئے ——!

اختر

غزل

از یوسف وتغلا بنگلوری۔ شاگرد علامہ مرزا رسوا بی۔ اے لکھنوی (مدظلہ)

آنکھیں ہیں خونفشاں تو جگر خونچکاں ہے اب — مجھ میں وہ تاب وضبط محبت کہاں ہے اب!
پھیری نگاہ کسی نے تو دنیا اُلٹ گئی — گویا نئی زمین ہے نیا آسمان ہے اب!
حسنِ بیاں نے حسن کو بے پردہ کردیا — سمجھا تھا میں رقیب جسے رازداں ہے اب
پھر جلوہ گاہِ حسن میں وہ اہتمامِ عشق! — درپیش مجھ کو معرکۂ امتحان ہے اب!
کس سے کہوں کہ ضبط کا یارا نہیں رہا — کیوں وقفِ آہ و نالہ دلِ ناتواں ہے اب
سنتے ہی میرا نام وہ دیتا ہے گالیاں — وہ قدر ناشناس بہت مہرباں ہے اب

طوفِ حرم میں یوسفِ مستِ شراب ہے
اس بندۂ خدا کی رسائی کہاں ہے اب!

تنبیہ الغافلین

دعوتِ تفکر!

"حسن نظامی پر جو بوچھار محمد علی نے کی ہے۔ وہ تم نے ضرور دیکھی ہوگی۔ میں اگرچہ بالطبع تو تو میں میں کا بڑا مخالف ہوں۔ مگر اس حرکت سے تو میں بھی خوش ہوا۔ خدا معلوم کیوں مجھ کو کبھی اس شخص کے افعال و اقوال میں صداقت نہیں معلوم ہوئی۔ اللہ کرے۔ لوگ سمجھیں کہ یہ اسی قابل تھا ——"

یہ ایک ایسے بزرگ قوم کے خط کا اقتباس ہے۔ جن کی قومی۔ تعلیمی۔ اور علمی خدمات ملک سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں —— کیا ہمارے نادان دوست کچھ دیر کے لئے اس موضوع پر تفکر و تدبر کرینگے کہ ان کی غفلت انہیں حسن نظامی کی معیت میں کہاں لے جا رہی ہے؟ تصوف کے "مقام محمود" تک! یا سراب تصوف کے تحت الثریٰ میں —— ؟؟

مولانا نیاز فتحپوری اور پیمانہ!

"اگرچہ کار رسالہ پیمانہ اپنے نئے دور کے" یاران میکدہ" میں مولانا نیاز فتحپوری ایڈیٹر "نگار" سے جس غیر سنجیدہ برہمی کے انداز میں "آستین کشیدہ" نظر آیا ہے۔ وہ یقیناً کسی "دور رسالہ کی علمی شرافت کے شایان شان نہیں ہوسکتی جناب سیماب اکبرآبادی جہاں تک ہمیں معلوم ہے علمی وادبی متانت سے باخبر شخص ہیں۔ اور جیسا کہ آپ نے پیمانہ کے اسی نمبر میں لکھا ہے پیمانہ کے اس دور میں انکی خاص نگرانی اور اعانت بھی مصروف کار ہے تعجب ہے۔ کہ اسکے باوجود پیمانہ میں ایسی بیہودگیاں نظر آتی ہیں۔ جنہیں متانت صحافت کے نزدیک حرام ہونا چاہئیے"

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

نقاد دہلوی

معلومات

پرندوں کی موسیقی انسانوں میں!

انگریز خاتون اسٹرنس وڈورانڈ۔ جو امریکہ میں مقیم ہے۔ پرندوں کی بھانت بھانت کی آوازوں کو موسیقی میں داخل کرنے اور اسے ترقی دے کر فن کی حد تک پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ بالخصوص بلبل کی شیریں آواز کو انسانی گلے بازی میں داخل کرنا اس کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اس عجیب اور دلچسپ جدت کی ابتدا اس نے جنگل میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا کر کی تھی۔ جہاں وہ کئی ہفتے رہ کر بڑی غور و فکر سے پرندوں کی صدائیں سیکھتی رہی۔ حال ہی میں اس نے شہر میں آکر ایک مدرسہ کھول دیا ہے۔ جس میں وہ انہی آوازوں کی تعلیم دیتی ہے۔ خاتون موصوف کا دعویٰ ہے۔ کہ آوازوں کی یہ اجتہادی شکل آگے چلکر موسیقی کا ایک اہم جزو بن جائے گی۔ اس کے مدرسہ میں کافی سے زیادہ طلبہ داخل ہو چکے ہیں۔ جن میں سے بعض نے ایک جلسہ میں تقریباً تیس قسم کی آوازوں کی نقل کامیابی سے اتاری تھی۔ جس سے حاضرین بہت متاثر ہوئے تھے۔ مدرسہ کی ترقی کے معاملہ میں خاتون موصوف کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ اس کے طلبہ کے لئے خوش آوازی ضروری نہیں ہے۔ اور اس سے بہت زیادہ طلبا اس میں داخل ہیں۔ خاتون موصوف کے سبقوں میں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے۔ وہ سانس روکنے۔ کھینچنے اور گھٹانے بڑھانے کی تعلیم ہے ✦

کیا مناظر قدرت مٹ جائینگے!

بعض انگریز علماء سائنس کا خیال ہے کہ سنہ ۱۹۸۰ء میں دنیا کی آبادی اپنے انتہائی درجہ تک پہنچ جائے گی۔ یہاں تک کہ ہر پانچ کیلومیٹر زمین مربع پر ایک گھر بنایا جائے گا۔ اور دنیا اپنے باشندوں پر تنگ ہو جائے گی۔ اس نظریہ کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے۔ کہ بلجیک اور ہالینڈ کے باشندے اپنے ہاں کی زمین کی نسبت سے اس قدر زیادہ ہو گئے ہیں۔ کہ ان کو زراعت کے لئے بہت کم زمین ملتی ہے۔ اگر کرۂ زمین پر انسانی آبادی اور مکانوں کی کثرت کا یہی عالم رہے گا۔ تو اس میں شک نہیں کہ بالآخر یہ قدرتی مناظر جو ہماری زمین کا اصلی سنگار اور حقیقی زیور ہیں۔ ملیامیٹ ہو جائیں گے۔

جناب کوی ونود ویدیہ بھوشن پنڈت ٹھاکر دت شرما موجد امرت دھارا و مہتمم امرت دھارا کی مفید تصنیف

کام ورتی شاستر حصہ اول

قیمت فی جلد اردو مبلغ پانچ روپیہ صہ

قیمت فی جلد ہندی مبلغ ...

اس میں ۲۲۵ رنگین تصاویر اور بیسیوں ہاف ٹون بلاک تصاویر ہیں

پانچویں بار چھپکر تقریباً نصف بک چکی ہے!

جلد ہی منگوا لیں

ورنہ

چھٹے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا!

کام وکر شاستر کے تمام پرواشیخ رہی ہے اور اس ضروری مضمون کو بالکل غلط پیش کیا جاتا ہے!

پنڈت صاحب نے سینکڑوں کتب کے مطالعہ کے بعد

صحیح طور پر اس علم سے پبلک کو واقف کرنیکے واسطے قلم اٹھائی ہے حصہ اول پانچ بار چھپ چکا ہے حصہ دوم لکھا جا رہا ہے۔ حصہ اول میں مرد و عورت کی جوانی و خوبصورتی کا مکمل بیان ہے اور انکی اقسام پر بحث ہے اور انسانی جسم کے ہر حصے پر مکمل روشنی ڈالی گئی ہے کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے زیادہ تعریف یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں!

چیلنج

ناپسند ہونے پر واپسی کی شرط ہے

یعنی کتاب پہنچنے پر اگر ناپسند ہو تو دس دن کے اندر رجسٹری کر کے واپس کر دیں تصاویر وغیرہ دیکھ کر ہم اسکی قیمت آپ کو منی آرڈر کر دینگے اور کیا چاہئے!

طالب علم درخواست نہ کریں!

امرت دھارا کی سلور جوبلی کے مختصر حالات دیکھنے ہوں تو رپورٹ سلور جوبلی مفت منگوا دیں!

صحت و درازی عمر کے راز یادگار سلور جوبلی صرف ۱ر کے ٹکٹ بھیج کر ہم سے منگوا لیں!

المشتہر مینیجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون لاہور
خط و کتابت و تار کیلئے پتہ: امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاکخانہ امرت دھارا لاہور

ایک روپیہ کی کتابیں تین آنہ میں

رعایتی اعلان یہ کتابیں جو ہر ایک پہلو سے نہایت سبق آموز ہیں اور ملک کے ہر حصہ میں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں صرف تھوڑے عرصہ کیلئے رعایتی قیمت پر دی جاتی ہیں اتنی عظیم الشان رعایت آج تک کسی کتب خانہ کی طرف سے نہیں ہوئی کتب فروشوں کو انتخاب شائع کر منگوا کر لینا چاہیئے۔ ایک روپیہ سے کم کتب کا آرڈر ارسال نہیں کیا جائے گا۔ محصولڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔

نام کتاب	نام کتاب	نام کتاب	نام کتاب	نام کتاب	نام کتاب	نام کتاب	نام کتاب	نام کتاب
مسٹریز آف انڈیا ہر دو حصہ	شیر دل راجکماری	خوبصورت ڈاکو	کامنی	بستان بلبل کے پھول	راجہ ہری چند	دار القضاء ٹھگ		
مسٹریز آف افریقہ	زبردستی کی شادی	انار کلی کلاں	شمسہ ہر دو حصہ	میری اٹھی خراب کی	بکرماجیت اعظم	ٹھگ جنازہ		
مسٹریز آف کشمیر	بہن کا سرمایہ	از محبت	لال کپتان	شکوہ کو لیس	مہارانا جند کور	خوبصورت بلا		
مسٹریز آف کوہاٹ	بھائی نے اڑایا	اسرار حسن	نیم حکیم خطرہ جان	پھر تو آج سے	رانا سانگا	راجہ بھرتری		
مسٹریز آف پنجاب	انتخاب دلہن	انمول ہیرا	جانکاہ	میری زوجہ ہیں	سوامی دیانند سرستی	اسیر حرص		
مسٹریز آف ساگر	مایوس دلہن	یوسف زلیخا ناول	جفائے پدر	آغا بدعالم	راجہ بیربل	ستارہ گردش		
مسٹریز آف انگلینڈ	شوہر کی کہانی	نظارہ عبرت	بنگالے کا چاند	گلدستہ پارسائی	حیات فوڈرمل	کنکھ		
مسٹریز آف کابل	اڑسل کی بیٹی	جوانا مرگ	نقلی بابو	ہفت عجائبات عالم	ملا دو پیازہ	محبت کے پھول		
مسٹریز آف بریلی	عائشہ کی بیماری	میرے خاوند کا راز	بنگالی شہزادی	ناول دلسوز	حالات تان سین	جنتر در پن		
مسٹریز آف دہلی	بیٹی زیب النساء	جمیل و شکیلہ	دادو بیدو کا شوہر	ناول دلنواز	تانتیا بھیل	گلزار لطف		
مسٹریز آف پولیس	خون عاشق	سوہنی مہیوال	شوہر پرستا	گدڑی میں لعل	جلال الدین محمد اکبر	بیتی پریتا استری کا لال		
مسٹریز جنات	ناکام عاشق	بطرز ناول	خودکشی	تاقچات عجیب و غریب	شہنشاہ ہند	دولتمندی کے راز		
مسٹریز الف لیلہ باغ	کامیاب عاشق	ہیرا کھیر بطرز	صبح زندگی	عیار قاعدہ	سکندر اعظم	معلومات نیرالی		
اسرار لندن	نتیجہ عشق	ناول	رسم و رواج	بامشکل کا شوقین	شیخ ابوالفضل	کریم اللغات		
مسٹریز آف دنیا	آئینہ عشق	پریتم تارا	چالاک مرد	گنجینہ سخن	حضرت ابوبکر صدیق	قارون کا خزانہ		
مسٹریز آف سمرقند	گلزار عشق	رنج و ملال	رشک حور	مرنے کے بعد کیا ہوگا	حضرت عثمان رض	بلبلے کی کل		
مسٹریز آف جاپان	ناکام عشق	بارہ مصالح کی چاٹ	قرب محبت	ملک عدم کی خبریں	دوست محمد خان	مرزا حلق		
مسٹریز آف خانگی	شفاء عشق	حسن کرشمہ	نل دمینتی	فاتح بنگال	قطب الدین	مریض الفت		
	قتل عشاق	شہنشاہ جہانگیر	سوت پر فتح	جیو کشمیر	بختیار کاکی	ناول قدرت		
عجیب و غریب ناول	عاشق صادق	انتقام ہر دو حصہ	جوہر زندگانی	ناول	حیات حیدر	عندلی توپ		
گورہ پھر خوان	ناکام محبت	روح لیلے	قتل الگزینڈر	ناول لیلاوتی	حیات ٹیپو سلطان	رئیس ٹھگ		
بیزار خاوند	انجام الفت	تقدیر کا چکر	ممتاز ناول	ہم خرما ہم ثواب	شہنشاہ بابر	دلی کا مظلوم بادشاہ		
ایک انوکھی عورت	وصل ممتاز	دھوکہ یا کمالات	الجنا کماری	گورو گوبند سنگھ جی	حیات اورنگزیب	رنگین سخن		
گستاخ عورت	حسرت وصل	انگلستان	آفت نصیب	گورو نانک دیو جی مہاراج	قزاق کی بیٹی	سفید ڈاکو		
وہ عورت جسنے مرکے دکھایا	راز دل	عمر پاشا مکس	جان اسیر	گورو تیغ بہادر	خاتون اسلام	عبداللہ مہر النساء		
ایک عورت چار خاوند	عورت کا قاتل	جنت الفردوس	نیرنگ دنیا	مہاراجہ رنجیت سنگھ	نواب زیب النساء بیگم	احمد خاں کابلی		
بے صبر عورت	بدقسمت معشوقہ	شادکام	من موہنی	ہری سنگھ نلوہ	نور جہاں جہانگیر	حکیم صاحب		
خوبصورت مالن	انجام محبت	جادوگر	اژدر دھم	مہارانا پرتاپ سنگھ	مہاتما دیکھے درشن	ناول فریاد		
وفادار عورت	خون آرزو	اسرار حرم	مذہبی قربانی	مہاراجہ پرتھوی راج	شکنتلا ناٹک	آسمان کی سیر		
چالاک عورت	کشتہ محبت	سپاہی کی دلہن	مرقع اقوام عالم	سری کرشن جی	بھول بھلیاں	آسمان کے عجائبات		
تعلیم نسواں	جمیل کی معشوقہ	آہ مظلوم	عیار ملزمہ	مہاراجہ سری رام	گلزار ترینہ	گلشن بہار		
فریبی عورت	رشک قمر	گردش تقدیر	شرح حروف	چندر جی	خون دلربا	عقل کی شین		
	شہید ادا	خون مظلوم	شادی غم	مہاتما بدھ	دردیو فا	اردو رسا پنکلو		
	کامل عیار	کنیز فاطمہ	چالاکیوں کا مرقع		حقیقت سندھری	بینڈ یا کمل		

ملنے کا پتا | کے۔ آر۔ مہرہ برادرس بکڈپو شاہ عالمی گیٹ۔ لاہور

نگاہوں کے صدقے ادھر دیکھ لینا

آپ ہمارے کہنے کا یقین نہ کرینگے کیونکہ آجکل کے اشتہار بازوں نے لوگوں کے اعتقاد توڑ دیئے مگر ع نہ ہر زن زن است نہ ہر مرد مرد
سب ہی جھوٹے نہیں ہوتے۔ اور نہ سارے دغاباز ہم آپکو یقین دلاتے ہیں کہ ہم آپ سے جس چیز کی بابت ذکر کرینگے۔ وہ بالکل
صحیح ہوگا۔ لعنت اللہ علی الکاذبین۔ کیونکہ جھوٹے لعنت کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اکسیر بخار

کسی قسم کا بخار ہو نیا یا پرانا گرمی کا یا سردی کا۔ مرد کو یا عورت کو۔ اس کی دس خوراکیں استعمال کرنے سے
انشاءاللہ کافور ہو جاتا ہے۔ قیمت دس خوراک عمر۔

سنون مجرب

اگر جناب کے دانت دکھتے ہوں یا ہلتے ہوں یا خون آتا ہو۔ یا درد کرتے ہوں۔ یا مسوڑے
خراب ہو گئے ہوں سنون مجرب منگا کر استعمال کیجئے۔ انشاءاللہ ایک ہفتہ میں بالکل آرام ہو
جائیگا۔ بغیر تکلیف ملنا دانتوں کو جلا دیتا ہے۔ کیڑا لگنے سے بچاتا ہے۔ قیمت عصہ ایک ہفتہ کیلئے۔

دہانت لیشت

جو برائے رقت منی۔ قلت منی۔ سرعت انزال۔ کثرت احتلام۔ درد کمر۔ ضعف دماغ جو بسبب
کثرت جماع ہو۔ اکسیر ثابت ہوا۔ مجرب ہے پانچ روز میں انشاءاللہ بشرطیہ آرام ہو جاتا ہے۔ قیمت دس خوراک عہ

طلائے رفیق شباب

جو حکمی اثر رکھتا ہے۔ اسکے استعمال کرنے سے آپکی تمام شکایتیں رفع ہو جائیگی مثلاً کمی سستی
لاغری۔ کوتاہی۔ کم حوصلگی یا رگوں میں غلیظ مادہ اتر آیا ہو۔ بشرطیہ آرام کرتا ہے سیکڑوں نے
آدمیوں کا آزمایا ہوا ہے۔ خوبی یہ ہے۔ کہ آبلہ نہیں ڈالتا۔ قیمت صہ تولہ۔ پرچہ ترکیب ہمراہ ہوگا۔

سرمہ بصیرت افزا

اگر آپ عینک کے ایسے عادی ہو گئے ہوں کہ بغیر عینک لگائے بالکل کام نہ کر سکتے
ہوں۔ تو ہمارا سرمہ بصیرت افزا منگا کر استعمال کیجئے۔ انشاءاللہ پھر آپکو چشمہ کی ضرورت
نہ پڑیگی۔ یہ برائے ضعف بصر و سیلان چشم و رمد و دھند و دیگر امراض اکسیر ہے۔ اور جواہرات سے بنایا گیا ہے۔
قیمت عـلـہ روپیہ تولہ۔

ملنے کا پتہ

کرنال مسلم دار الشفاء مالک حکیم نور احمد گلچین

عربی علم تفسیر

جلالین شریف ـــہ
بیضاوی ۔ سورہ بقر ۸ر
سبق الغایات ۱۴ر
فوز الکبیر ۸ر
بیان القرآن اردو عـہ
موضح القرآن ۔ للعہ

انشاء وادب عربی

التعلیقات ۱۴ر
مینا الانشاء ۶ر
سبعہ معلقہ قاسمی ۵ر
۔ مجتبائی ۱۲ر
مقامات حریری
کفایۃ المتحفظ
دیوان متنبی زرد للعہ

عقائد و علم کلام

خیالی حاشیہ شرح عقائد
شرح عقائد نسفی
کتاب المسامرہ ۱۲ر

فرائض

تسہیل الفرائض ۶ر
سراجی ۸ر
شریفیہ شرح سراجی ۱۴ر

صرف ونحو

ابواب الصرف ۸ر
جامع التعلیلات ۸ر
غنیہ شرح مراح
دستور المبتدی ۴ر
صرف میر ۴ر
کتاب الصرف ۱۲ر
علم الصیغہ ۸ر
الفیہ ابن مالک ۱۴ر
تیسیر المبتدی ۶ر
شرح مأتہ عامل ۷ر
۔ نظامی ۱۲ر
شرح ملا جامی للعہ
کافیہ ۹ر
ہدایۃ النحو ۸ر
نحو میر ۴ر

منطق

ایساغوجی ۳ر
بدیع المیزان ۵ر
سلم العلوم عـہ
حمد اللہ
شرح مرقات عربی
شرح تہذیب مع تحفہ شاہجہانی

حدیث و اصول حدیث

ابن ماجہ شریف
بخاری شریف
بلوغ المرام ۸ر
ترمذی شریف مجتبائی
صحیح مسلم شریف
مؤطا امام محمد ے ر
مشکوۃ شریف
نسائی شریف
نخبۃ الفکر ۱۰ر

فقہ و اصول فقہ

درمختار کامل سرد جلد
رسائل الارکان
شرح وقایہ عـہ
قدوری مجتبائی
کبیری شرح منیہ
منیۃ المصلی ۱۲ر
نور الایضاح
اصول الشاشی ۱۲ر
کشف المبہم
نور الانوار

شاہ عبدالرحیم صاحب

ارشاد رحیمیہ ۴ر
انفاس رحیمیہ ۴ر

شاہ عبدالعزیز صاحب

احسن الحسنات ۱۰ر
مجموعہ فتاویٰ شاہ عبدالعزیز

شاہ محمد اسمٰعیل صاحب

تقویۃ الایمان
صراط مستقیم فارسی ۱۲ر
رسالہ اصول فقہ ۲ر

شاہ ولی اللہ صاحب

انفاس العارفین فارسی
انصاف مع اردو ترجمہ کشاف ۹ر
چہل حدیث ۴ر
شرح رباعیتین
عقد الجید ۸ر
کلمات طیبات
القول الجمیل ۷ر
مجموعہ رسائل خمسہ ۶ر

مولانا خلیل احمد صاحب

اتمام النعم ۲ر
تنشیط الآذان ۴ر
المہند علی المفند ۶ر

مولانا مرتضیٰ حسن صاحب

رد قادیانی و بریلوی کے رسائل

مولانا محمد قاسم صاحب

دلیل المحکم ۲ر
اجوبہ کاملہ ۲ر
آب حیات عـہ
اسرار قرآنی
انتصار الاسلام ۴ر
قبلہ نما ۶ر
تقریر دلپذیر
تحذیر الناس ۳ر

مولانا رشید احمد صاحب

امداد السلوک ۵ر
اوثق العریٰ
رد الطغیان ۱۰ر
زبدۃ المناسک ۵ر
سبیل الرشاد ۲ر
ہدایۃ المعتدی ۳ر

مولانا محمود حسن صاحب

ادلہ کاملہ ۲ر
جہد المقل
الابواب والتراجم ۱۲ر
مقدمہ ترجمہ قرآن ۶ر

مولانا اشرف علی صاحب

اصلاح الرسوم ۶ر
اعمال قرآنی سہ حصہ ۵ر
آداب معاشرت ۴ر
الاقتصاد ۴ر
بہشتی زیور مکمل مع گوہر
نشر الطیب

مولانا اصغر حسین صاحب

الجواب المتین ۵ر
حیات خضر ۴ر
الصالحات ۶ر
فتاویٰ محمدی ۱۰ر
القول المتین ۳ر
گلزار سنت ۷ر

مولانا سید انور شاہ صاحب

عقیدۃ الاسلام
فصل الخطاب ۱۲ر

مولانا شبیر احمد صاحب

الاسلام ۶ر
العقل والنقل ۱۰ر
ہدیہ سنیہ ۲ر
الشہاب ۶ر

مولانا کفایت اللہ صاحب

تعلیمات اسلام مکمل مع دو قاعدے
حصہ چہارم تک ۱۴ر

مولانا عاشق الٰہی صاحب

فیوض یزدانی
انوار سبحانی
تذکرۃ الرشید ہر دو حصہ
تبلیغ دین ۱۵ر
الصلوٰۃ ۲ر

مرزا اسد اللہ خاں غالب

دیوان غالب مختلف اقسام کے مع شروح ۶ر سے ے تک
نکات غالب

مولانا حالی

حیات جاوید للعہ
یادگار غالب ے ر
حیات سعدی

مولانا شبلی مرحوم

سیرۃ النبی قسم اول
الفاروق
ایضاً
سوانح مولانا روم
ایضاً
سیرۃ النعمان
الغزالی
المامون
موازنہ انیس و دبیر
شعر العجم مکمل پانچ حصے
مجموعہ کلام شبلی ۱۲ر

ڈاکٹر سر اقبال صاحب

اسرار خودی و رموز بیخودی یکجا ے ر
پیام مشرق
شکوہ ۲ر
جواب شکوہ ۴ر
بانگ درا مکمل مجموعہ نظم اردو للعہ

خواجہ حسن نظامی صاحب

سفرنامہ ممالک اسلامیہ
اتالیق خطوط نویسی ۱۲ر
بیوی کی تعلیم

علامہ راشد الخیری صاحب

انگوٹھی کا راز ۸ر
صبح زندگی
شام زندگی
شب زندگی
سراب مغرب ۸ر
نوحہ زندگی ۱۲ر
تائید غیبی
عروس کربلا
سنجوگ ۱۰ر

ملنے کا پتہ: سید ناظر حسن انصار بک ایجنسی مظفر نگر (یو۔پی)

کوڑیوں کے مول انمول موتی

بجلی کا ئیڈ یعنی بجلی کا مستری

اگر آپ گھر بیٹھے ہی بجلی کا مستری بنکر ہزاروں روپے پیدا کر کے آسودہ اور خوشی سے زندگی کے دن گزارنا چاہتے ہو تو آپ ہماری پاس نادر و نایاب کتاب بجلی گائڈ منگوا کر پڑھیں اس کے پڑھنے سے آپ بجلی پیدا کرنا۔ بجلی کو مکان میں فٹ کرنا۔ مکانوں میں روشنی کرنا۔ انگیٹھی جلا کر سردی کے دن کاٹنا۔ چولہے جلانا۔ دور باورچی خانہ کی ضروریات کو پورا کرنا۔ گھر میں پنکھا لگا کر گرمی کے دن آرام سے کاٹنا وغیرہ وغیرہ باتوں کا سکھلانا۔ اکسیومیلیٹر سے بجلی تیار کرنا۔ اکسیومیلیٹر چارج کرکے اس سے بیٹری وغیرہ بھرنا۔ بجلی کی بتی جلانا اور اس کے نقائص دور کرنے کے طریقہ جات درج کرکے کتاب کو گویا دریا بنا دیا ہے اس کتاب کے پڑھنے سے ہر ایک آدمی بجلی کا مستری بنکر بجلی کے کئی قسم کے نقائص دور کر سکتا ہے۔ اصلی قیمت (عہ) رعایتی (عہ) ہندی (عہ) گورمکھی (عہ)

مسٹریز آف پیرس

ایک دلچسپ اور مشہور فرانسیسی ناول کا ترجمہ

جس میں شہر پیرس کے ادنیٰ طبقہ کی اندرونی حالت۔ امراء کے پست کن حالات، سوشل خرابیوں اور تمدنی برائیوں کی صحیح کیفیت اور اس حقیقت کے بہتر رنگ دیئے ہیں۔ کہ پڑھ کر دل میں انتقام آ جاتا ہے۔

ناول نہیں دلچسپ اداؤں کی ہے تصویر
رنگ اس میں کسی شوخ طبیعت کا بھرا ہے

باوجود ان صفات کے قیمت کچھ بھی نہیں صرف رعایتی (عہ)

جاسوسی کے ناول

- وفادار جاسوس
- شاہی جاسوس
- طلسمی جال
- جاسوسی کہانیاں
- خوفناک ڈاکو
- خوفناک بھوت
- بہادر مشرا عورتیں
- بے خوف رانی
- چالاک عورت ہر دو حصہ
- بنگالی دیوی
- چاندی کی چوری
- قاتل کی غلطی
- ہیرے کی انگوٹھی
- خوبصورت یہودن
- خونی چور
- خوفناک جاسوس
- طلسمی رومال
- جنسی چور
- بہادر رہزن

- اندر جال
- گرد محتاں
- چیندیاں
- خوفناک ہوائی سیر
- جاسوسی جال
- اسرار ایران
- الکس پال جسموں والا آدمی

مسٹر رینالڈز کے مشہور و معروف ناول

- خوفناک انتقام
- طرحدار معشوقہ
- بادفا عاشق
- خانہ بدوش لڑکا
- نوجوان ایڈیٹر
- عاشق دلہن
- قمار باز
- بت شکست
- جانباز سپاہی
- پر اسرار ریڈی
- شہید محبت

شہنشاہ تجارت

رجسٹرڈ — نئی ایڈیشن — نئی ایڈیشن

یعنی روپیہ کمانے کی کنجی

یہ فن تجارت کے متعلق ایک بے بہا اور نایاب کتاب ہے جس میں تجارت کی کامیابی کے گر بتائے گئے ہیں اور تمام ہندوستان کے مشہور کارخانوں، آڑھتیوں اور کمیشن ایجنٹوں، دلالوں، دکانداروں، تاجروں کے نام معہ مفصل پتہ درج ہیں نیز یہ بھی نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے کہ تجارت کی ہر ایک اشیاء کس شہر میں پیدا ہوتی ہیں۔ پہلی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی ہے یہ دوسری ایڈیشن ہے بہت سی نئی معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتاب کا حجم بڑھ گیا ہے مگر قیمت وہی ہے۔ یہ فن تجارت کے متعلق ایک عجیب کتاب ہے جس میں تجارت کے بیش بہا رازوں کا انکشاف، کفایت شعاری، طریق تجارت کے اصول وغیرہ بتائے گئے ہیں۔ مختلف اقسام کی تجارتی حرفتیں، دستکاری ضروریات بھی درج کی گئی ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کون کونسی اشیاء ہندوستان کے کس شہروں میں پیدا یا فروخت ہوتی ہیں۔ ہندوستان کے ہر ایک بڑے شہر کی تجارت کا نقشہ بھی دیا گیا ہے۔ جس کی قیمت (للعہ) رعایتی (عہ)

کروڑپتی بنانے والی کتابیں

- اردو تجارتی کتاب ہر سہ حصص
- تین گھر بیاہی
- رنگ سازی کی کتاب
- جلد سازی
- شیشہ گری
- حلوائی
- رسوئیا یا بھوجن پکاش
- باورچی یا اسلامی ہوٹل
- خانساماں یا مکمل
- کوکری بک
- فوٹوگرافی
- مجموعہ لوازمات
- ہر قسم کے معجون
- علم کیمیا دیدک
- عطر سازی اور گندھی

- رسالہ کلید ساری
- بجری
- بیٹری دلنفکشزی
- مکمل فوٹوگرافی
- صابون گری مکمل

ناول عبدالحلیم شرر

- دلکش ہر سہ حصص
- شہید وفا
- ملک العزیز ورجنا
- حسن انجلینا
- فردوس بریں
- حسن بن صباح
- منصور موہنا
- بدرالنساء اور رنگی
- مصیبت
- فلورا فلورنڈا

زمینداروں، کاشتکاروں، کسانوں کے لئے بیش بہا تحفہ یعنی آئینہ کاشتکار

یہ کتاب کسانوں وغیرہ کیلئے بے نظیر کتاب ہے اس میں زمین کے متعلق ہر ایک بات واضح طور پر درج کر دی گئی ہے۔ زمین کھیتی میں ہر ایک فصل مثلاً جوار، گیہوں، چاول، چنا، مونگ، ماش وغیرہ۔ سبزیاں، ترکاریاں وغیرہ کی کاشت کا پورا بیان درج ہے اور اس میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ کس زمین میں کتنا دانہ ڈالنا چاہئے۔ ان خوبیوں کے باوجود کتاب کی قیمت صرف (عہ) رکھی ہے کہ ہر ایک آدمی منگوا کر فائدہ اٹھا سکے۔ اصلی قیمت (عہ)

حکمت کے متعلق کتابیں

- علاج بواسیر
- علاج استورات
- علاج مارگزیدہ
- علاج جنون
- تریاق اعظم
- آئینہ تشخیص ہر دو حصہ
- رسالہ معالجات
- رسالہ نقوی
- تحفہ حکمت یا فرمان
- اولاد دینے والا
- کامل حکیم یا وید
- طب اکبر
- حکیم بیان خصوصیات
- عجیب بیان
- آئینہ طب مکمل
- تحفہ لقمان
- مجربات لنکوری
- حکیم حاذق
- گنج حکمت
- جراحی ہر دو حصہ
- بیان ہر دو حصہ
- مخزن اکسیر ہر دو حصہ
- طب متعلقہ عدالت
- حفظ صحت حیوانات
- علم الکیمیا ہر دو حصہ
- سدا جوانی
- علاج بے دوا
- تریاق دین دیدک
- رسالہ کشتہ جات
- نجات طبی کامل
- آئینہ امراض
- رسالہ سل دق
- ڈاکٹر مجرب ہر دو حصہ
- علاج بذریعہ پانی
- علاج اطفال

جادوگر بننے کے آسان طریقے

- ہاتھ کی صفائی
- افریقہ کا جادو
- چین دیس کا جادو
- ہر دو حصہ کمالات
- کشمیر کا جادو
- مخزن مسمریزم
- بنگال کا جادو
- تسخیر ہمزاد
- فارس کا جادو
- ہپناٹزم
- جنات جادو
- جوہر آدم
- مقفل کارخانہ
- مصر کا جادو
- کھیل مداریان
- طلسمات سکندری
- عمل کہانی ہر دو حصہ
- رسالہ علم غیب
- زندہ کرامات کامل
- بھانمتی کا پٹارہ
- جادو تسخیر

ملنے کا پتا۔ منیجر ایم ڈی تجارتی کتبخانہ شاہ عالمی دروازہ لاہور

الجمیل

ہمارے مقدس رہنمایان جو آسودۂ خاک ہو چکے ہیں انکی یادگار

تاریخی ۔ مذہبی ۔ تبلیغی ۔ اصلاحی ۔ ماہوار ۔ رسالہ

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار

اس پُرآشوب زمانہ میں مسلمانانِ ہند کیلئے جسقدر تبلیغی اور اصلاحی اشاعتوں کی ضرورت ہے ۔ اہلِ بصیرت سے کوئی شخص بے خبر نہیں ۔ اس قسم کی اہم ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے باوجود بے بضاعتی کے خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے ہم نے ایک تاریخی، مذہبی نیز تبلیغی اور اقتصادی رسالہ شائع کرنیکا ارادہ کر لیا ہے ۔ جو ماہ جنوری [illegible] کی پہلی تاریخ سے زیرِ ادارت مولوی **وحید احمد صاحب** مدنی شائع ہوگا ۔ امید کامل ہے اہلِ ہمت حضرات دینی اور قومی فریضہ سمجھکر اس کی امداد اور ہماری حوصلہ افزائی میں نمایاں حصہ لینگے ۔ ہماری غرض محض تاریخی اقتدار اسلاف کے طریقوں کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرنا اور اُنکے قدم بقدم چلنے کی ترغیب دینا نیز فلاح اور بہبودی کے راستے اور اقتصادی مفاد کو قوم پر ظاہر کر دینا ہے ۔ طلبائے علوم عربیہ اس کیطرف خاص توجہ فرمائیں ۔ اسلئے کہ [illegible] اسمیں عربی ادبیت اور تراجم کا ایک خاص حصہ بھی ہوا کریگا ۔

پرچے کا سائز ۲۶×۲۰/۸ تعداد صفحات کم از کم ۳۲ ہونگے قیمت سالانہ عام ششماہی [illegible] قیمت فی پرچہ [illegible] رہے گی ۔

نوٹ ۔ خریداروں کی تعداد کم از کم پانچسو ہو جانے کے بعد پہلا پرچہ شائع ہوگا ۔

المشتہر

(مولوی) **سید ناصر حسن مالک انصار بک ایجنسی و رسالہ الجمیل مظفر نگر** (یو۔ پی)

اقرار نامہ

ہم اقرار کرتے ہیں۔ کہ مندرجہ ذیل مشتہر کردہ ادویہ میں سے کوئی دوا استعمال کرنے کے بعد جو صاحب اپنے ایمان و دھرم سے تحریر فرمائینگے کہ بموجب ترکیب دوا استعمال کی گئی مگر فائدہ نہ ہوا۔ تو ہم انکی رقم معہ محصول ڈاک واپس کر دینگے۔

نوٹ:۔ خریدار اصحاب کو چاہیئے۔ کہ فرمائش کے ہمراہ قیمت روانہ کریں۔ ورنہ پارسل بصیغہ وی پی بھیجا جاوے گا۔ ۲۔ محصولڈاک ذمہ خریدار ہوگا۔ مگر جو صاحب قیمت پیشگی روانہ کرینگے انکو معاف۔ ۳۔ چھپی ترکیب استعمال دوا کے ہمراہ ہوگا۔ ۴۔ بعض کوتاہ اندیش آرڈر دیکر وی پی واپس کر دیا کرتے ہیں جس سے کارخانہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسلئے اِرسال سے انکے واسطے یہ انتظام کیا گیا ہے۔ کہ ان کا نام نامی معہ پورے پتہ کے اشتہارات کے ساتھ اول تو اخبارات میں شائع کرایا جائے دوسرے اگر ضرورت ہو۔ تو باقاعدہ چارہ جوئی کیجاوے۔

فقیری طلائے مراد

جن صاحب کو وقت پر مایوس ہونا پڑتا ہو یعنی معشوق کے محبت کے ارادہ سے جاتے ہوں۔ اور کسی سبب سے بوجہ ناکامی اسکی نظروں میں ذلیل و خوار ہوکر واپس ہوتے ہوں۔ تو وہ اس طلاء کو استعمال کریں۔ اس کے لگانے سے صرف چند دن میں قوت باہ کا زور ہو جاتا ہے۔ اسکے علاوہ ممسک و ملذذ اس درجہ کا ہے۔ کہ قیمت فی ڈبیہ پانچ روپیہ۔ محصولڈاک ۵ر

فقیری طلائے اعجاز

اسکے چند روز کے استعمال سے آپکی وہ تمام شکائتیں جنکے بتلانے اور تحریر کرنے سے آپ شرماتے ہیں سستی۔ کمزوری۔ لاغری۔ ناہمواری رگوں میں خراب رطوبت کا بھر جانا وغیرہ وغیرہ دُور ہوکر قوت و تیزی طبیعت میں امید و امنگ پیدا ہو جائیگی۔ پھر لطف یہ کہ آبدچالہ وغیرہ کچھ نہیں پڑے گا۔ باوجود اسقدر خوبیوں کے قیمت بہت کم ہے یعنی فی شیشی صرف ۲ دو روپے آٹھ آنہ محصولڈاک ۵ر۔

فقیری محبوب مردی

مردانہ طاقت زائل شدہ کو واپس لانیوالی۔ مایوسوں کو امید دِلانے والی ہمت کو مرد اور مرد کو جوانمرد بنانیوالی اگر کوئی دوا ہو سکتی ہے۔ تو یہ ہے۔ اگر طلائے اعجاز کے ہمراہ اسکا بھی استعمال کیا جاوے۔ تو سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے یہ قیمت ۱۶ گولی دو روپے آٹھ آنے محصول ڈاک ۵ر۔ **نوٹ** جو صاحب دونو دوائیں ایک ساتھ طلب کرینگے ان سے صرف چار روپے آٹھ آنہ لئے جاوینگے۔

فقیری خاک

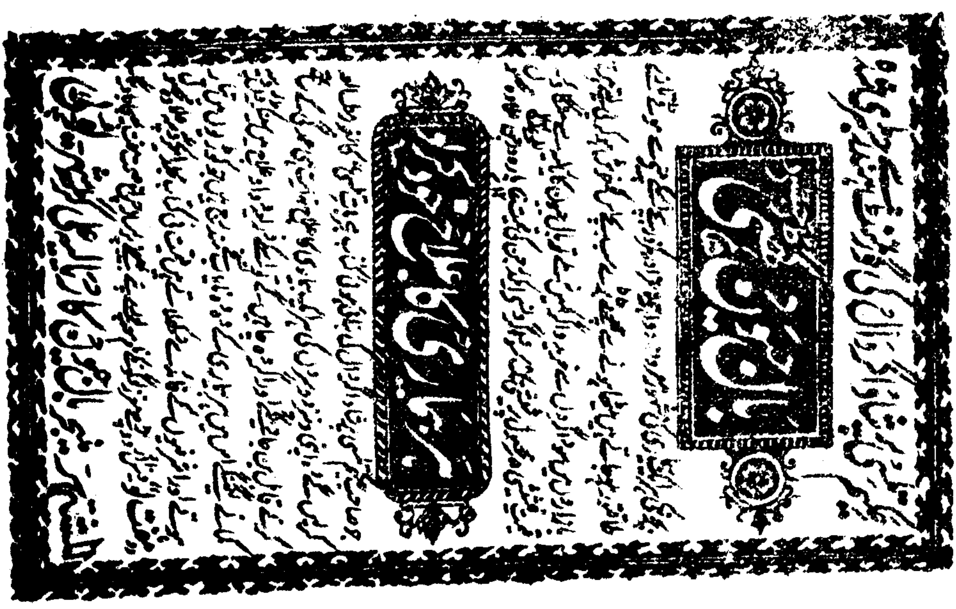
نیا یا پرانا کیسا ہی سوزاک ہو اس خاک کے صرف ۲ یوم کے استعمال سے آرام ہو جاتا ہے۔ اور سوزش تو پہلی ہی خوراک میں کم ہو جاتی۔ قیمت فی

فقیری اکسیر معدہ

چونکہ جملہ امراض جسم انسان میں معدہ کی خرابی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسلئے جب تک معدہ کی اصلاح نہ کیجائے تندرستی غیر ممکن ہے۔ لہٰذا جو صاحب ہمیشہ تندرست رہنا چاہیں۔ وہ اکسیر کا استعمال رکھیں۔ اسکے استعمال سے درد پیٹ ضعف معدہ و فتور ہضم۔ کمی اشتہا کھٹی ڈکار آنا طبیعت کا مالش کرنا مثانہ کی گرمی کا کم ہونا۔ بواسیر۔ اسہال پیچش ہضم غذا وقت بدن کا گرم ہونا۔ پیشاب کا بار بار آنا ضعف دماغ ضعف بصر وغیرہ امراض دور ہو کر بھوک بڑھتی اور غذا خوب ہضم ہوتی ہے قیمت صرف ایک روپیہ فی بکس محصولڈاک ۵ر

ملنے کا پتہ

مینجر کارخانہ فقیری حب پارہ امروہہ (یو۔پی)



خریداران نٹر پنچ کو انعام

۱۹۲۷ء کے سال کی پوری خریداری جسٹرڈ کرنے والے احباب کو بطور انعام کے ایک ضخیم ناول کتابی صورت میں

صوفی نما ٹھگ مکمل

اچھی لکھائی اور چھپائی سے مزین کیا گیا پیش کیا جائیگا یہ وہی ناول ہے جسکو دو سال سے ہمارے ناظرین نٹر پنچ کے صفحوں میں ملاحظہ فرما رہے ہیں جس میں نواب کی سادہ لوحی بیگم صاحبہ کی عیاری۔ خرانٹ بوڑھی دایہ کی چالبازی ایماندار ملازموں کی جانسوزی، صوفی نما ٹھگ کی مکاری۔ پولس کی ہوشیاری محکمہ خفیہ کی سراغرسانی قابل دید ہے ــــــ

المشتہر منیجر نٹر پنچ شوستری امام بارہ۔
جونا ناگیارہ۔ بمبئی ۹

اگر آپ ادبی دلفریب دلچسپ افسانوں نتیجہ خیز کہانیوں اور وجد آفرین نثر و نظم کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو آپ رسالہ

دلکش لاہور

ملاحظہ فرمائیں جو کہ جنوری ۱۹۲۷ء سے ۸۰ صفحات حجم ۲۰×۳۰/۸ کی تقطیع پر دلفریب رنگین تصاویر سے مزین ہو کر بڑی آب و تاب سے شایع ہوا ہے۔

قیمت سالانہ تین روپے۔ نمونہ ۵ کے ٹکٹ بھیجکر طلب فرماویں

منیجر رسالہ دلکش لاہور

فرانس کے ایک ڈاکٹر کی حیرت انگیز ایجاد

حسن یوسف

رجسٹرڈ رجسٹرڈ

گورے اور خوبصورت ہونیکی شرطیہ اکسیر لاثانی دوا

جسکے صرف چند روز بلا ناغہ ملکر نہانے سے کالا اور کملایا ہوا بدنما کرخت چہرہ اور جسم مخمل کی مانند ملائم اور گلاب کے پھول کیطرح خوبصورت اور سرخ ہو جاتا ہے جسکا ہر ایک قطرہ چیچک وغیرہ کے بدنما سیاہ داغوں کی نشیب میں اپنا گھر بنالیگا جس سے گویا نہ کسی قسم کے چیچک کا داغ رہیگا۔ نہ چھائیں نہ کیل ہونگے۔ نہ کاٹے۔ جھریاں دور ہو جائینگی اور مہاسے فی الفور کافور۔ اور اگر چہرہ کا رنگ ۱۶ برس کی حسین کے برابر پیارا معلوم نہ ہو۔ تو دام حبہ نہ لینگے۔ خوشبو اس قدر اعلیٰ کہ جبتک دوبارہ غسل نہ کیا جائے۔ دماغ معطر رہے۔ اور کل جلدی عوارض مثلاً پسینہ کی بدبو۔ بغلگند۔ داد۔ خارش۔ پھوڑا پھنسی وغیرہ کیلئے ازحد مفید ہے قیمت فی شیشی دو روپے تین شیشی (۵ھ)

حسن یوسف سوپ (رجسٹرڈ) قیمت فی بکس ایک روپیہ آٹھ آنے (۱۸ھ)
فی ٹکیہ آٹھ آنے ــــ (۸ھ)

لو آج پیش کش ہے یہ ایجاد کام کی۔ حاجت نہ استرے کی نہ منت حجام کی

شرطیہ عمر بھر نہیں اُگتے۔

بال

قیمت فی شیشی ایک روپیہ

یہ ایک قسم کا روغن ہے۔ جو بالوں کو جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے۔ لطف یہ کہ بے ضرر ہے جسکو دیکھکر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اور اس بے نظیر جوہر کو صرف تین چار مرتبہ استعمال کرنے سے بغیر کسی تکلیف کے نازک سے نازک جگہ کے بال اگنے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بند ہو جاتے ہیں۔ اور رنگ جلد نہایت عمدہ ریشم کیطرح نرم ملائم خوبصورت ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ نہایت اعلیٰ خوشبودار بلا تکلیف بال دور کرنے کی دوا ہے۔ ایکدفعہ آزمائش شرط ہے۔

ملنے کا پتہ:ــــ قیمت فی شیشی عہ

دفتر حسن یوسف جسٹرڈ لوہاری گیٹ لاہور

قواعد

۱۔ بہارستان" ہر ماہ انگریزی کی یکم تاریخ کو شائع ہوتا ہے:۔

۲۔ سالانہ چندہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے، نمونہ آٹھ آنے، (علاوہ محصول ڈاک)
غیر ممالک سے چندہ آٹھ روپیہ پیشگی آنے پر رسالہ جاری کیا جاتا ہے۔

۳۔ جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ آنا ضروری ہے۔

۴۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر (جو لفافے کے پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے) ضرور لکھئے

۵۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۵ تاریخ سے پہلے پہنچ جانی
چاہئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

۶۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا پورا پتہ لکھیں۔

۷۔ کوئی ایسا اشتہار جو خلاف تہذیب ہو درج نہیں کیا جاتا۔

۸۔ نرخ نامہ اشتہارات حسب ذیل ہے۔

پیمانہ صفحہ	ایک اشاعت	تین اشاعتیں	چھ اشاعتیں	بارہ اشاعتیں
[illegible]	۶	۱۶	۳۰	۵۵
نصف صفحہ	۴	۸	۱۶	۳۰
سرورق	۱۵	۴۰	۷۰	۱۳۵

منشی محمد صادق منیجر رسالہ "بہارستان" مزنگ لاہور

نے باہتمام منشی نظام الدین گیلانی [illegible] میں چھپوا کر شائع کیا

بنام شاہد نازک خیالاں
عزیز خاطر آشفتہ حالاں

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ماہوار مجموعہ

بہارستان

ادارہ

مدیر
اختر شیرانی

معاون
رفیعی اجمیری

مقامِ اشاعت
دفتر رسالہ بہارستان مزنگ لاہور

فروری ۳۷ء

۶/

آج بھولے کا یاد کیا پرسوں نہ

بشرطیکہ آپ اکسیر دماغ استعمال کریں

اکسیر دماغ دنیا بھر میں صرف ایک دوا ہے جو دماغ کو قوت دینے اور حافظہ کو بڑھانے کی

یکتا دعوے دار ہے

اگر بچے تعلیم سے اس لئے جی چراتے ہیں کہ اُن کا دماغ کمزور ہے، تعلیم پر طبیعت نہیں جمتی، پڑھا لکھا یاد نہیں رہتا، سر خالی معلوم ہوتا ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے چکر آتے ہیں، تو

والدین کا فرض ہے!

کہ وہ اپنے بچوں کو اکسیر دماغ استعمال کرائیں اور پھر دیکھیں کہ

خدا نے اس دوا کو دماغ کی نشوونما کیلئے کیا کیا تاثیریں دے رکھی ہیں

قیمت
چھوٹی آزمائشی شیشی جس میں پندرہ روز کی دوا ہوتی ہے صرف دو روپے
بڑی شیشی جس میں ایک مہینے کی دوا ہوتی ہے صرف تین روپے

المشتہر

حکیم محمد مسعود مستند پنجاب یونیورسٹی بیڈن روڈ محبوب بلڈنگ لاہور

بہارستان اردو

جلد ۲ - نمبر ۲

اردو اسٹیج کے متعلق قیمتی معلومات

ہندی اور اردو گانوں پر ایک اہم محاکمہ

ایک دلچسپ اور مفید مضمون

بوسہ ؟

ایک لطیف مضمون

زندہ بدست مردہ

جدت کے باب میں ایک نامور ظرافت نگار کا جدت آمیز مضمون

تصاویر

۱- مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی

۲- دعائے معصوم

فہرست مضامین بابت ماہ فروری ۱۹۲۶ء

بہارِستانِ سبھا

خدا کا شکر ہے کہ بہارستان کی گلہ طرازیاں خالی نہ گئیں، اور مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب دہلوی بی۔ اے علیگ کو سبھا کی شرکت پر آمادہ ہی ہونا پڑا ع

دیر آمدی اے نگار سرمست

یوں تو آپ کا دلچسپ مضمون "زندہ بدست مردہ" آپکی اتنے عرصے کی خاموشی کا کافی معاوضہ ہے، لیکن ہمیں اس سے زیادہ کی امید رکھنا چاہیے ع

ہل من مزید جوشش نداز ایاغ ما

صاحبزادہ احمد سعید خاں صاحب شوقؔ علیگ بھی جو روزنامہ "ہمدرد" دہلی میں جا کر "تغافل کیشی" سیکھ گئے ہیں اب مہربان ہوتے جاتے ہیں۔ "بوسہ" آپ کی تازہ ترین "عنایت" ہے۔ اور ہرچند کہ آپ اسے "ایک پیغام" کی حیثیت دینے پر مصر ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ خدا جانے کس قدر "خوشامدوں" کے بعد ہمیں یہ "بوسہ" نصیب ہوا ہے ع

از بخت شکر دارم و از روزگار ہم!

صاحبزادہ صاحب کو، توسن قلم کی بدلگامی پر چیں بجبیں نہ ہونا چاہیئے ورنہ ہمیں ے

بوسۂ بے ادبم آنقدر آورد ہجوم کہ لب لعل ترا فرصت دشنام نداد

کی سزا پر عمل کرنا پڑے گا ——!

ہمیں یہ سنکر نہایت صدمہ ہوا کہ ہماری "سبھا" کے معزز رکن اور اردو کے نامور ادیب مولانا خلیقی دہلوی کی والدہ ماجدہ ہمیشہ کیلئے اس دنیا سے انتقال فرما گئیں ہمیں اس حادثہ میں مولانائے موصوف سے دلی ہمدردی ہے خدا آپکو اور دوسرے متعلقین کو صبر عطا فرمائے اور مرحومہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے ——!

قبلہ مولانا احسن لکھنوی کا اہم مضمون "اردو سٹیج کے متعلق قیمتی معلومات" اس نمبر میں ختم ہوتا ہے اگلے نمبر میں ہم مولانا کے دو دلچسپ خط شایع کرینگے جنمیں ضمناً ڈرامہ کے متعلق اکثر ضروری مسائل بھی آگئے ہیں علاوہ بریں ہم مولانا سے کوئی مستقل مضمون لکھوانے کی بھی امید کرتے ہیں جو قریبی اشاعت میں پیش کیا جائیگا ——!

جناب عبد الغنی دہلوی بی۔ اے (آنرز) کی آمد ہمارے عزیز دوست سلیم الحق صاحب حقی دہلوی بی اے (علیگ) کی زحمت کا نتیجہ ہے لیکن حقی صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ صرف جانشینی سے کام نہیں چلتا ے

ہم جیسے مر رہے ہیں وہ کچھ بات ہی ہے اور — عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

کہئے اب مضمون کب تک پہنچتا ہے؟ — اخترؔ شیرانی

اُردو دنیا

آہ مولانا شررؔ مرحوم

ادبستانِ اردو میں محشر اندوہ بپا ہے سیرت نگاری کا گھر بے چراغ ہوگیا — عروسِ زبان اپنے لٹ جانیوالے سہاگ کی ماتم گسار ہے اور افسانہ کی نازکخیالیاں فریاد کررہی ہیں کہ آج اردو دنیا سے انکا سب سے بڑا سرپرست اٹھ گیا۔

بہارستانِ علم کی وہ بلبل ہزار داستان جس کے منقارِ قلم سے ہزاروں رنگ کے دلنشیں نغمے برستے تھے آج ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ اور افسوس پھر کبھی نہ چہکیگی گلستانِ ادب کی وہ طوطیٔ شیریں زبان جس کے گوناگوں ترانوں سے کل تک ادبی فضائیں گونج رہی تھیں آج ایک آخری نیند سو گئی اور واحسرتا کہ اب کبھی بیدار نہ ہوگی — ! اگر موت العالِم موت العالَم کا قول سچ کہ تو مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھنوی کی وفات صرف اُنہی کی وفات نہیں کہلائی جاسکتی بلکہ حقیقت آشنا دماغوں کے نزدیک ایک دنیا کی موت ہے۔ ادب کی موت ہے، زبان کی موت ہے، اور علم وفضل کی موت ہے — ایسی موت کہ جس کا معاوضہ ہمیں بیسیوں زندگیوں سے بھی نہ ملے گا۔ اور اس قدر اندوہناک کہ شاید اردو دنیا اسکے لئے برسوں تک اشکبار رہیگی — !

مولانائے مرحوم نے اپنے شہرہ آفاق تاریخی ناولوں، مستند سیرتوں اور علمی وادبی مضامین کے ذریعہ اردو زبان کی مسلمانوں کی، اور اسلامی عصبیت کی جو سنہری خدمات انجام دی ہیں، وہ ناقابلِ فراموشی ہیں، زندۂ جاوید ہیں، اور اُنکے بقائے دوام کیلئے سرمایۂ ناز ہیں — !

مختصر حالات

مولانا شررؔ ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے ۵ برس کے سن میں بسم اللہ ہوئی آپکے والد حکیم تفضل حسین جو عربی کے اعلیٰ تعلیمیافتہ اور فارسی کے یکتائے عصر تھے) اودھ کے مشہور بادشاہ سلطان العالم واجد علیشاہ کے دامن ملازمت سے وابستہ تھے جن دنوں حضرتِ سلطان العالم مٹیا برج کے ''فرنگی محلوں'' میں اپنی کھوئی ہوئی حکومت کا ماتم کررہے تھے، دوسرے وفاشعار وابستگانِ درگاہ کی طرح حکیم صاحب بھی اپنے بادشاہ کا ساتھ دے رہے تھے۔ جب مولانا کی عمر ۹ برس کی ہوئی تو حکیم صاحب اپنے ہمراہ کلکتہ لے گئے جہاں آپ نے حافظ الٰہی بخش سے قرآن مجید ختم کیا۔ بعد ازاں اپنے والد سے کچھ ابتدائی کتابیں ملا باقر صاحب سے صرف ونحو، اور مولوی سید علی حیدر طبا طبائی سے بعض منطق وفلسفہ کی کتابیں پڑھیں۔ اِنہی ایام میں انگریزی بھی سیکھ لی اور حکیم محمد مسیح صاحب سے طب پڑھی۔ کچھ عرصہ تک مطب بھی کیا۔ قیام کلکتہ

کے دوران میں اکثر لکھنؤ آنا ہوتا تھا۔ علم کا شوق نچلا نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں مولوی محمد یحییٰ صاحب اور مولوی عبدالباری مرحوم سے متوسطات معقول ختم کیں۔

۱۸۷۶ء میں آپ کے والد نے آپکو لکھنؤ بھیج دیا۔ یہاں آکر مولانا نے جناب مولانا عبدالحی صاحب مغفور سے تمام کتب درسیہ تمام کیں اور مفتی میر عباس صاحب سے عربی علم ادب کی تحصیل کی۔ ۱۸۷۹ء میں مولانا کا شوق علم آپکو دہلی کھینچ کر لے گیا۔ اور اس عہد کے نامور محدث جناب مولوی نذیر حسین صاحب سے صحاح ستہ موطا امام مالک اور تفسیر جلالین ختم کرکے لکھنؤ واپس آئے۔

۱۸۸۱ء میں مولانا اودھ اخبار میں اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اسی زمانہ میں محشر کے نام سے آپنے ایک ہفتہ وار رسالہ بھی نکالا جس میں بہت نازک لطیف اور شاعرانہ رنگ کے مضامین شایع ہوتے رہے۔ اودھ اخبار کی ادارت سے قطع تعلق کرنے کے بعد آپ نے ایک دلچسپ ناول لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ جنوری ۱۸۸۷ء میں آپ نے اپنا مشہور رسالہ دلگداز جاری کیا (جس کا آخری پرچہ جو مولانا کی ادارت میں شایع ہوا ہے) اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ ۱۸۹۱ء میں آپ حیدرآباد تشریف لے گئے نواب وقار الامرا بہادر معین المہام مال نے اپنے خزانہ پائگاہ سے دو سو روپیہ ماہوار کی تنخواہ مقرر کی۔ قیام حیدرآباد کے زمانہ میں آپ نے تاریخ سندھ لکھی جس کے مسودہ کو دیکھ کر نواب وقار الامرا نے ۵ ہزار روپیہ انعام کے طور پر خزانہ ریاست سے دلوائے ۱۸۹۳ء میں آپ نواب وقار الامرا کے صاحبزادہ نواب ولی الدین خاں کے ہمراہ انگلستان تشریف لے گئے قریباً ڈیڑھ سال یہاں قیام رہا (اس عہد کی ایک تصویر پیش کی جاتی ہے) اس زمانہ میں آپ نے فرنچ زبان سیکھی اور اتنی مہارت پیدا کرلی کہ اس کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرسکیں۔ واپسی انگلستان کے چھ ماہ بعد نواب وقار الامرا سے باضابطہ اجازت حاصل کرکے پھر لکھنؤ چلے آئے اور علمی خدمت میں مشغول ہوگئے۔

۱۹۰۸ء میں آپ پھر حیدرآباد تشریف لے گئے اور وہاں مددگار ناظم تعلیمات مقرر ہوئے ۱۹۰۹ء میں بعض سیاسی وجوہ کی بناپر مشہور ادیب جناب مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم کے ساتھ (جو آپکے عزیز بھی ہوتے تھے) اپنی خدمت سے سبکدوش ہوگئے۔ اور پھر لکھنؤ پہنچکر اپنی علمی مصروفیتوں میں محو ہوگئے۔

۱۹-دسمبر ۱۹۲۶ء کو مولانا پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور تین دن کی علالت کے بعد ۲-دسمبر ۱۹۲۶ء بروز جمعہ بوقت صبح [illegible] سال کی عمر میں ہمیشہ کیلئے اس دنیا سے سدھار گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ عجیب بات ہے کہ مولانا کی تاریخ ولادت و وفات بالکل ایک ہیں یہاں تک کہ وقت میں بھی ذرا فرق نہیں۔ یعنی [illegible] جمادی الآخر ۱۲۷۵ھ یوم جمعہ بوقت صبح پیدا ہوئے اور [illegible] جمادی الآخر سنہ بروز جمعہ بوقت صبح انتقال فرماگئے۔

تصنیفات

مولانا کی مستقل تصنیفات کی تعداد تقریباً ۷۰ کے لگ بھگ پہنچتی ہے۔اور انہیں مساوی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) حصے میں آپکے تاریخی ناول ہیں۔جن میں حسن انجلینا، منصور موہنا، ملک العزیز ورجنا، فردوس بریں ماہ ملک، ایام عرب، مفتوح فاتح فلپانا۔ انفانسو ملک میں اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ مقبول ہو چکے ہیں۔اور جن پر سردست تبصرہ کرنے کا موقعہ نہیں۔ناولوں کے اس سلسلہ کی آخری کڑی "بینا بازار" ہے جو افسوس ہے کہ اب تک ہماری نظر سے نہیں گزر سکی ——!

(۲) سرے حصہ میں مولانا کی خیالی یادگاریں ہیں۔ جنہیں پھر تین حصوں پر مرتب کرنا ہوگا۔(الف) یہ فرضی ناول ہیں اور ان کی تعداد چار پانچ سے زیادہ نہیں۔ ان میں حسن کا ڈاکو اور اسرار دربار حرامپور سب سے بہتر اور غیب دان دلہن اور "دلچسپ" نہایت دلچسپ ہیں۔ (ب) یہ حصہ ڈراموں کا ہے اور بہت مختصر ہے۔ان میں شہید وفا فائق تر ہے۔اور ذرا سے تغیر کے بعد اردو سٹیج پر ہنگامہ حشر برپا کر سکتا ہے۔(ج) یہ مولانا کی نظمیں ہیں جن میں سادگی، اور درد کے سوا کوئی خاص بات —— نہیں۔

(۳) سرے حصہ میں مولانا کی عالمانہ استعداد کے جوہر نمایاں ہیں اور پچھلے خالص "ادبی" سرمایہ کے مقابلہ میں اسے خالص علمی خزانہ کہنا موزوں ہوگا۔ان کو بھی ہم تین حصوں پر تقسیم کرتے ہیں۔(الف) تاریخیں —— یہ تین چار سے زیادہ نہیں۔اور ان میں تاریخ سندھ اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔(ب) سوانحعمریاں ہیں جن میں مخدرات اور صد پارۂ دل اپنی متنوع رنگینیوں کے اعتبار سے۔اور حسن بن صباح، شیریں ملکہ عجم، افسانۂ قیس قرۃ العین، جنید بغدادی اور ابو بکر شبلی، اپنی انفرادی شان میں جاذب توجہ ہیں۔(ج) یہ مولانا کے لیکچر ہیں ان میں سر سید کی دینی برکتیں، ہندوستان کی موسیقی اور ہندوؤں کا تعلق اردو سے، نہایت اہم اور یادگار چیزیں ہیں ——!

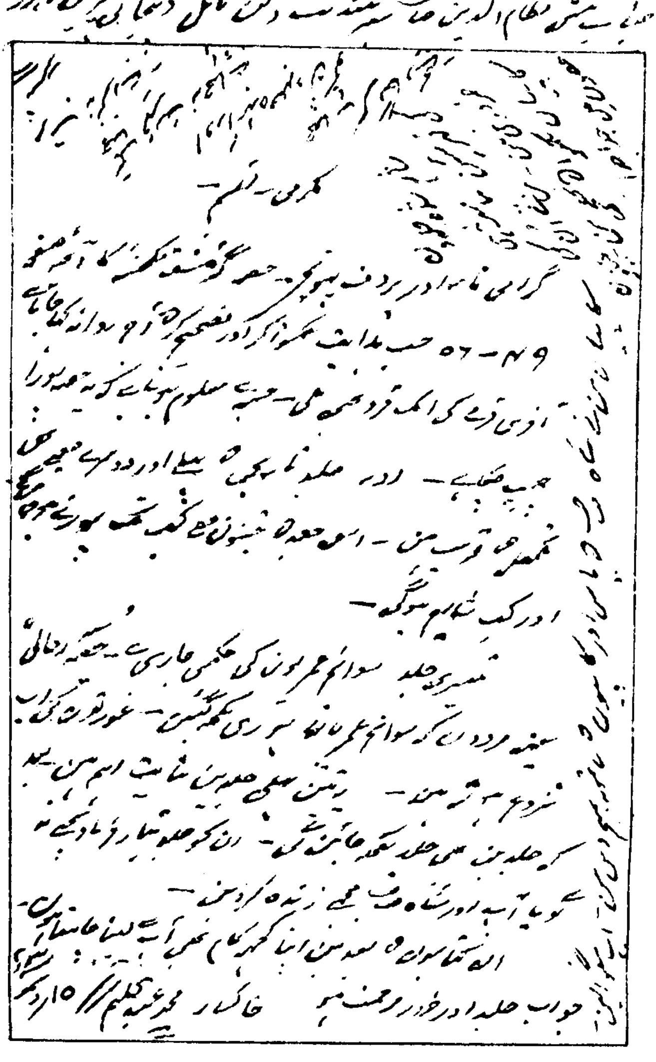
تصنیفات کا ایک نیا شعبہ

مذکورہ بالا تصنیفات تو وہ ہیں جو عام مطبوعات کی صورت میں ناظرین تک پہنچ گئی ہیں اور پہنچتی رہیں گی۔اب ہم مولانا کے علم و ادب کے ایک اچھوتے حصہ کے بارہ میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں جس سے شاید ناظرین بھی اچھی طرح باخبر نہیں ہیں۔ یہ حصہ مولانا کے ان سینکڑوں مختلف مضامین کا ہے جو آج تک مولانا کے مشہور رسالہ دلگداز میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ "دلگداز" کی جلدیں جن لوگوں کی نظر سے گذری ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ مولانا کے علم و ادب کا ایک بحر ناپیدا کنار ہے۔اور اگر اسے مستقل مجلدات کی صورت میں سمیٹا جائے تو اس سے مولانا کی تمام تصنیفات سے زیادہ مجموعہ مہیا ہو سکتا ہے جو ایک ضروری انسائیکلوپیڈیا سے کچھ کم اہم نہ ہوگا۔جیسا کہ ہم پہلے مختصراً اشارہ کر چکے ہیں۔

لاہور کے اہل دل بزرگ مولانا سید مبارک علی شاہ گیلانی نے اس ضروری حصہ اور معیب سلسلہ کی طرف مولانا کو توجہ دلائی اور مولانا سے اس دفتر پریشان کی شیرازہ بندی کی اجازت حاصل کرلی اور مولانا نے خود اسے مرتب کرکے شاہ صاحب کے سپرد کردیا چنانچہ اس سلسلہ کی بہت سی جلدیں "مضامین شرر" کے نام سے شائع ہوچکی ہیں ہمارا خیال ہے کہ شاہ صاحب کا یہ کارنامہ مولانا کے شیدائیان تحریر اور انکے جذبات استفادہ و ارادت پر سب سے بڑا احسان ہوگا۔ ہم اس بارے میں فی الحال مفصل عرض کرنے کی گنجائش نہیں پاتے۔ ورنہ مولانا کے علمی کارناموں کا (جواب تک دلگداز کی فرسودہ جلدوں کے آغوش میں محو خواب تھے۔ اور جنکی بیداری درحقیقت مولانائے مرحوم کی بقائے دوام کی حقیقی بیداری ثابت ہوگی) بخوبی تعارف کرایا جاتا ——— !

آخر میں ہم مولانائے مرحوم کے جوانسال صاحبزادہ مولوی صدیق حسن صاحب انکے بھائی بہنوں ان کی محترم والدہ انکے ماموں مولوی سراج الحق صاحب منیجر دلگداز اور انکے خاندان کے تمام اعزا سے اس اندوہناک حادثہ میں دلی ہمدردی کرتے ہیں۔ اور خدائے تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مولانائے مرحوم کو اپنی مبارک رحمت کے سایہ میں جگہ دے اور انکی تربت پر اپنی مقدس برکت کا نور برسائے اگرچہ کہ:-

شہر خاموشاں میں مل سکتا نہیں مسکن مرا!
کاملان دہر کے سینوں میں ہے مدفن مرا!



ہم مولانا سید مبارک علی شاہ صاحب گیلانی کے ممنون ہیں، کہ آپ نے مولانائے مرحوم کے تین مختلف بلاک ہمیں عنایت فرمائے، جو اس اشاعت میں شایع ہوتے ہیں۔ نیز مولانا کا ایک دستی خط جسکا عکس ناظرین کی دلچسپی کی خاطر پیش کیا جاتا ہے۔

مولانا شاد عظیم آبادی بھی!

(کلکتہ) عزیزی اختر۔ میں ۲۶ دسمبر سے ۱۱ جنوری تک عظیم آباد میں تھا۔ پرسوں یہاں آیا، وہاں اب کی اندازے سے زیادہ رہ گیا۔ خان بہادر شاد سخت علیل تھے۔ انہیں چھوڑنا ممکن نہ تھا۔ آخر ۸۔ جنوری کو رات کے ۱۱ بجے انھوں نے قضا کی، اور ہندوستان سے ایک فلسفی و معلم اخلاق و صاحبِ مذہب و معلم مذاقِ صحیح شاعر اٹھ گیا۔ مرتے وقت اپنا یہ شعر اُنکی زبان پر تھا ؎

آخر ہے زیست ضبط میں دم بھی ہے جان بھی
مردانہ باش، ختم ہے اب امتحان بھی

نہ ہے نام اللہ کا!

یہاں آکر بہارستان کا تازہ نمبر ملا۔ ذرا حواس درست ہوں تو دل لگا کر اسے پڑھوں اور کچھ کچھ لکھوں۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔ والسلام مع الاکرام

(نواب نصیر حسین خاں صاحب) خیال (عظیم آبادی)

اردو دنیا کے لئے یہ دوسرا نقصانِ عظیم ہے جسکی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی ——— مولانا شاد مرحوم کا کلام ہمارے تعارف کا محتاج نہیں آپ اُن نامور اور باکمال اساتذہ میں سے تھے جنہیں موت نے ایک ایک کرکے ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا ہے۔ مولانا شاد کو اردو کی طرح فارسی عربی اور ہندی نظم پر بھی یکساں قدرت حاصل تھی اور اس زمانہ میں ایسے باکمال بزرگ کا دم بہت غنیمت تھا۔ افسوس کہ یہ بھی نہ رہے۔

مولانائے مرحوم شاعری اور زباندانی کے اعتبار سے ملک میں ایک مخصوص اور بلند پایہ رکھتے تھے۔ ۱۹۱۲ء سے گورنمنٹ نے آپ کا ایک علمی وظیفہ بھی مقرر کیا تھا جو ہر چند کہ آپ کی ضروریات کے لئے کافی نہ تھا، مگر برابر ملتا تھا۔ مزید قدر افزائی کے خیال سے خان بہادر کا خطاب بھی مرحمت ہوا تھا۔

———— !

دعا ہے کہ خدا تعالیٰ مرحوم کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور اعزا و اقربا کو صبر جمیل عطا فرمائے ؎

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کیلئے کس کس کا ماتم کیجئے؟

ہمیں یہ معلوم کرکے دلی مسرت ہوئی کہ اردو کا قدیم رسالہ "مخزن" از سرِ نو جناب ابو الاثر حفیظ جالندھری کی ادارت میں جاری ہونے والا ہے۔ ہم اس کی کامیابی کی دعا کرتے ہیں۔

اختر شیرانی

دعائے معصوم

(پرارتھنا)

ہم پر دیا کرو بھگوان!

ہے ایشور بھگوان، ہے ایشور جگوان، ہے ایشور بھگوان
سو سو بار پکاریں پھر بھی پیاسی رہ رہ جائے زبان
تمری سب سے عالی شان!
ہم پر دیا کرو بھگوان!

ہم ہیں تمرے باگ کی چڑیاں بھور بھجن کے گیت سنائیں
تمرے دوارے سیس نوا کر پوجا کے کچھ پھول چڑھائیں
اپنا ہی ہے تن یہی دان!
ہم پر دیا کرو بھگوان!

ہم ہیں تمرے دیس کی گڑیاں کھیل ہے یہ سارا سنسار
تم ہو ہمرے کھیلن ہار کیسا ہے یہ سندر کار
پر ہم ہیں ابھی انجان
ہم پر دیا کرو بھگوان!

من کے مندر میں بست ہی یوں تمرا چھوٹا روپ سروپ
جیوں اکاش پہ تارے چمکیں اور دھرتی پر چھلکے دھوپ
اور نہیں ہے کوئی گیان!
ہم پر دیا کرو بھگوان!

سارے سنسار کے اندر چودس چھایا ہے تمرا نام
کوئی کہے ایشور، کوئی باپ کہے، کوئی بولے رام
کوئی پکارے یا رحمٰن!
ہم پر دیا کرو بھگوان!

ہمرے ہردے میں ہے بیکل تمری موہنی پریت کی آگ
ہمرے نین سے برست ہی تمرے درشن کی پیاس کی آگ
اور اختر کو تمرا دھیان!
ہم پر دیا کرو بھگوان!

ہم پر دیا کرو بھگوان!

اختر شیرانی

بہارستان

جلد ۲ فروری ۱۹۲۷ء نمبر ۲

نامۂ احسن

ناٹک ساگر پر ایک اجمالی تبصرہ

اُردو سٹیج کے متعلق قیمتی معلومات

ہمارے بعض نئے پُرانے ڈرامے اور ڈرامہ نگار

ہندی اور اُردو گانوں پر ایک اہم محاکمہ

(لسان الاسرار علامہ سید مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی کا گرامی نامہ)
اختر شیرانی کے نام

(مسلسل)

ایک عرصہ سے جناب طالب کو ضعف بصر کی شکایت تھی، آخر میں تو وہ کام کرنے کے قابل نہ رہے اور ۱۲ء میں مسٹر بالی والا نے حضرت طالب کو ایک نئی فٹ مانٹ دی۔ شہر بمبئی کے دولتمندوں نے اپنا ایثار دکھایا ایک معتدبہ آمدنی میں مسٹر بالی والا نے اپنے شاندار عطیہ کا اضافہ کرکے بعد ختم تماشا اسٹیج دی اور کہا کہ منشی صاحب

مجبوری ناٹک کی دنیا سے ریٹائر ہوتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کے بعد لیل و نہار کا تماشا عالم وجود میں آیا جسکی بابت مصنفین ناٹک ساگر تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

"اُن کا ڈرامہ لیل و نہار جس کا پلاٹ لٹن کے ناول ڈے اینڈ مارننگ" سے ماخوذ ہے لٹریچر کا سرمایۂ افتخار ہے۔ اور محاسن ادبی سے لامال ہے۔ اور اس ڈرامہ میں سب کے سب گانے اُردو میں ہیں۔ یہ ڈراما اس قابل ہے کہ کسی بہترین مغربی ڈراما کے مقابل میں پیش کیا جائے"

پنڈت برج موہن صاحب کیفی دہلوی بھی اس

اردو اور ہندی گانے

خیال میں مصنفین ناٹک ساگر کے ہم آہنگ ہیں۔ اُن کے نزدیک بھی اُردو زبان میں گانا لکھنا بہترین صفتِ ڈراما ہے حالانکہ اس جدت خیال پر کوئی معقول استدلال نہیں کیا ہے ہم اس دعویٰ بے دلیل کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں جب تک یہ ثابت نہ کردیا جائے کہ ہندی میں گانا لکھنا کس وجہ سے معیوب و متروک ہے ڈراما کے متعلق جس قدر مدح سرائی کی گئی ہے اس کی تردید کا ہم کو حق نہیں۔ کیونکہ یہ ذاتی جوشِ عقیدت ہے لیکن اس خط کشیدہ عبارت کے ایک جزو پر ہم کچھ لکھیں گے اس سے پہلے کہ ہم اس حصۂ عبارت پر اظہار رائے کریں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لیل و نہار کا وہ گانا ایک بار ناظرین کے سامنے پیش کردیں۔ جو مصنفین ناٹک ساگر کے نزدیک مایۂ ناز ہے۔

گانا حمد باری "لیل و نہار"

تیری عالی شان، لایزالی شان واہ واہ دیکھی بھالی شان
کیا ہی نرالی شان جادو والی شان پیاری پیاری ڈالی ڈالی شان
سارے جہاں میں کون و مکاں میں جلوہ تیرا چھایا ہے
سارے جہاں میں عیاں کہیں اہاہاہا نہاں کہیں کہاں
نہیں تیری،"

اس گانے کا مذاق جدید دیکھ کر مجھے ایک نقل یاد آگئی۔ وزیر الممالک نواب سعادت علی خاں معہ انشا اللہ انشا ایک روز کشتی پر دریا کی سیر کررہے تھے لب دریا ایک عالی شان مکان کی دیوار پر لکھا تھا "حویلی علی نقی خاں بہادر کی" بادشاہ کو مذاق سوجھا انشا سے کہا بھئی کیا تاریخ کہی ہے۔ انشا ظرافت کا خزانہ تھے سمجھ گئے کہ ازراہ ظرافت فقرہ کو مصرعہ بنا کر مصرعہ تاریخ خواہ مخواہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تو ہاں میں ہاں ملانے کے نوکر ہی تھے عرض کیا واقعی غریب پرور کیا خوب تاریخ کہی ہے۔ اور دیکھئے تین مصرعے امتدادِ زمانہ سے محو ہو گئے ہیں۔ مگر کچھ کچھ پڑھے جاتے ہیں نواب نے کہا اگر پڑھے جاتے ہیں تو پڑھو۔ ہم بھی سنیں انشا نے اتنی دیر میں ظرافت کا مصالا تیار کرکے عرض کیا۔

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی — نہ تال کی نہ سم کی نہ سر کی
تاریخ کہی ہے کسی لڑکی — حویلی علی نقی خاں بہادر کی

کیا عجب ہے کہ یہ گانا بھی اسی صنعت میں ہو۔ جو ڈرامسٹ زبان ہندی سے ناواقف ہیں وہ اکثر اس قسم کی صنعت یعنی گڑبڑین، یا صنعت "کھچڑی" یا صنعت "ربڑیشن" میں گانے لکھتے ہیں۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی زبان پر قدرت نہ ہونے کے سبب ناپا ٹوئیاں مارتے ہی ایک لفظ ہندی کا مل گیا تو دوسرا فارسی تیسرا عربی سب ملا جلا کر ایک معجون مرکب تیار ہوتی ہے۔ اور اس کا نام گانا ہوتا ہے۔ اصلی چیز جس کا جو گلبند شاعر کو بنانا پڑتا ہے اُس کے الفاظ کا وزن مجبور کرتا ہے کہ اسی وزن کا لفظ تلاش کیا جائے۔ ہموزن لفظ ان ڈرامانویسوں کو آسانی اور عجلت سے مل جاتے ہیں جن کے پاس الفاظ کا ذخیرہ زیادہ ہوتا ہے اور جو لوگ تہی دست و کم پایہ ہیں اُنکے پاس ذخیرۂ الفاظ کثیر نہیں ہوتا۔ وہ مجبور ہو کر دوسری زبان کا لفظ تلاش کرتے ہیں۔ اگر لفظ ہموزن نہ ہو باعتبار فن موسیقی (آکار) درست نہیں ہوتی اور گویے صاحب کہہ دیتے ہیں کہ ہماری دی ہوئی چیز کی میزان پر منشی صاحب کا گانا ٹھیک نہیں اترتا۔ حالانکہ ناواقف فن موسیقی جتنے ڈرامسٹ ہیں وہ افاعیل کے وزن پر الفاظ کا توازن کر کے گانا لکھتے ہیں۔ اور اپنے نزدیک سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض باحسن وجوہ پورا کر دیا۔ مگر باعتبار فن موسیقی وہ پورا نہیں ہوتا۔ یہ بڑی طویل بحث ہے۔ اس حمد گانے میں "ڈالی ڈالی شان" کے فقرے پر بلاغت قربان ہو رہی ہے۔ پھر مصنفین ناٹک ساگر فرماتے ہیں کہ "احسن ساز باندان ہندی کا عصا ٹیکتا ہوا آیا" اس فقرے کا جواب میرے پاس نہیں ہے آپ کا یہ خیال عجیب ہے کہ اردو کا گانا ہندی کا دستگیر نہ ہو۔ اسی طرح ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ خدا کی بندگی عربی کی منت پذیر نہ ہو۔ اس اعتبار پر وہ ہمیشہ نماز صبح کی نیت اس طرح کرتے ہیں کہ نماز پڑہتا ہوں میں صبح کی ٹو رکعت۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔

ہمارے نزدیک اردو، فارسی، عربی، ہندی ہر زبان کے الفاظ کو ناٹک کے گانوں میں داخل ہونے کا حق ہے۔ اور جب بمقتضائے ضرورت ان زبانوں میں گانے ملیں گے۔ میں نے ملائی اور کنڑی زبان میں بھی گانے لکھے ہیں، لکھے کیا ہیں لکھوائے ہیں برما کے سفر سے واپس آنے کے بعد کینسل ہو گئے۔ لیکن ہمیشہ سے اُردو ڈراما میں ہندی زبان کا اعتدال قایم رکھ کر گانے بنائے گئے ہیں اور بنائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص دریافت کرے کہ وہ اعتدال کیا ہے تو اس کی تعریف الفاظ میں نہیں ہو سکتی بلکہ مذاق سلیم اس کا فیصلہ کریگا۔ ایک زمانہ تھا کہ راجہ اندر اپنے تخت پر تانیں لگاتے تھے مہاراج کسی دیو کو حکم فرماتے تھے تو وہ بھی لحن داؤدی میں ہوتا تھا ع

اے دیو کر قصد بیداد کا

ع

اے لال دیو اس طرف جلد آ

وغیرہ، میں نے اس خلاف فطرت اصول کی اصلاح کی تاہم پوری اصلاح غیر ممکن معلوم ہوئی۔ کیونکہ پیشہ ور کمپنیاں پبلک کے مذاق کے تابع ہوتی ہیں موسیقی کا حصہ کم کرنے سے نقصان کا احتمال پیدا ہوا۔ اور گانوں کے لئے موقع تلاش کرنا پڑا جو خلاف فطرت بھی نہ ہو اور حالت اعتدال سے متجاوز بھی نہ ہو۔ میں اپنے مبحث سے ذرا علیحدہ ہو گیا۔ بہرکیف گانے بنانے کے لئے بھاشا زبان نہایت موزوں و دلفریب ہے اور ہندی بھاشا اس صنف میں اردو کا اک جزو لطیف ہے اس زبان کی لذت تماشا دیکھنے والوں کو اسٹیج پر پہنچا دیتی ہے۔ پھر بعض اس قسم کے سبجکٹ ہیں جو ہندی دلکشی کے محتاج ہیں۔ اس میں محل و موقع کو بہت دخل ہے۔

خدا کی حمد کا خیال۔ ہندی استوتی یا بھجنوں سے لیا گیا ہے۔ نعت رسول و منقبت امیر المومنین میں بڑے بڑے کوی راجوں اور کبیشروں کے شلوک موجود ہیں۔ مذاق سلیم پھڑک اٹھتا ہے جب ڈراپ سین اٹھتے ہی موسیقی کے ارتباط سے بھاشا زبان میں توحید کا شعلہ ارباب معرفت کے دلوں میں گداز پیدا کرتا ہوا اسٹیج کے در و دیوار کو ضیا بار بنا دیتا ہے۔ ہر ذی روح کی زبان پر وحدانیت کا اقرار اور ہر مادہ میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ استعمال الشئی علی محلہ ناگزیر نہ قابل قبول مقولہ ہے۔

یہ ہی وہ زبان ہے جو حمد محمود کے لئے سرتاج السنہ شرقیہ ہے۔ جس نے صوفی منشاں صافی طینت کی سفید ڈاڑھیوں پر آنسوؤں کا چشمہ رواں کر دیا۔

(بھول بھلیاں)

پیارا نام نرنجن رکھ تو پت سلطان جگت کرتار سکل راجن کت برتن دین
ہمری گت سنوارت تو ہی کرپا ندھان دکھ ہرن نام تیرو جگت ناتھ دکھ بھنجن

پیارا

ربوبیت کی لہریں مطرب کے تار سے اٹھتی ہوئی سامع کے رگ دل پر مضراب زن ہیں۔ کچھ جادو کچھ اثر اس زبان میں ضرور ہے یقینی ہے ورنہ ہندستان کا رہنے والا ریشائیل شاعر رسول ہاشمی کی شان میں یہ نہ کہتا ــــ

پیا تم مدینے بلیہو کہ ناہیں
یثرب کا چھیلا سانورو من بھایو لاگو جی

عبودیت کا فرض ہندی عنصر میں ادا ہوتا ہے یہ الفاظ متشکل ہیں ذی روح ہیں مضطرب ہیں۔ اب وہ گانا بھی لکھ دوں جس میں فارسی ترکیبوں کا عنصر بھی شریک ہے۔ اس مرکب زبان کی شعلہ آہنگی سامع کو رقص میں لاتی ہے۔

دل ناداں کو ہم سمجھائے جائیں گے

عشق ہیں جن کے جان چلی ہے، نہ وہ اہل ستم بلوائے آئینگے
سے

نہ کہا ذبح گیا چھوڑ کے بسمل قاتل
دہن زخم پکار اکیا قاتل قاتل
کسی زخم جگر کے یہ چرکے دکھائے جائینگے

دیگر

پیار موہینا نباہنا ہوگا، غم جو ہوگا اٹھانا ہوگا
بھر بھر کے جام شراب محبت پینا ہوگا پلانا ہوگا

یہ لازمی و متعدی کے تکرار دو رنگ جانتے ہیں۔ خدا جسکو جدت آفریں دماغ دیتا ہے وہی دنیا پر فتح پاتے ہیں تال کے ہر ضرب پر اسٹیج میں لکڑیوں کا کھٹا کا اور گردنوں کا ڈورا چلنے لگتا ہے کامیابیوں کے وہ وہ سین دیکھے ہیں کہ دل بھر گیا آخر مدح و قدح سے مستغنی ہو کر گوشۂ عافیت اختیار کر لیا۔

یہاں اردو ہی اردو یعنی گانے نمبر ۹ میں ایک لفظ بھی ہندی نہیں اس سے یہ مقصود نہ تھوڑا ہی ہے کہ ہمیشہ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ بلکہ محل و موقعہ دیکھنا ایکٹر کی حالت دیکھنا گانے والی کا درجہ دیکھنا چاہیے اردو اور ہندی کا سوال غلط ہے اور ابھی خدا جانے کب تک غلط رہے گا۔ تاثیر کے آب حیات میں سموئے ہوئے الفاظ جذبات دل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ گانا بنانا ایک خاص علم ہے اور اس کیلئے مذاق صحیح کی ضرورت ہی مذاق صحیح عطائے وہبی ہے۔ اکتسابی نہیں ہے سے

افلاک نگہبان عشق تو نمی باشند
ایں بادۂ زور آور بینائے دگر دارد

حسین میر دن اپنے حسن کی تعریف اپنی سہیلی کی زبان سے سن کر بظاہر چڑھتی ہے اور دل میں خوش ہوتی ہے کیونکہ عورتوں کو اپنی تعریف فطرتاً پسند ہے ذرا گانے کا تخیل اور الفاظ کی شوخی ملاحظہ ہو

نینا رسیلی چتون متواری   کرپتلی لچک چھب پیاری
بالی عمریا چال نیاری   گوری کلیاں ناجک بیاں

۱۹۰۵ء میں چند گانے بمبئی کے مشہور جرائد میں چھپوا کر میں نے چیلنج دیا تھا کہ اگر ان کا جواب کوئی لکھ دے تو فی گانا سو روپیہ انعام ع

آخر کہ خبر شد جرش باز نیامد

عبدالکریم کا ملک ایکٹر اپنے مالک کی عشقبازی سے تنگ آگیا۔ عشقباز نواب استیلاء عشق سے مجنونانہ حرکتیں کرتا ہے اور اس کے دربار کے دولہ جنگ وغیرہ بھی مجبوری سے اس کے ہم آہنگ ہیں۔ قریب قریب ہر شخص دیوانہ ہو رہا ہے۔

گانا عبدالکریم بھول بھلیاں

سب گھر پاگل، سب گھر پاگل سب گھر دیوانہ
اندر پاگل باہر پاگل کس کا غم کھانا
نوکر پاگل، چاکر پاگل چھوڑو یارانہ سب میں عبدالکریم دانا

یا خدا کیا ہوا غضب — یا خدا پاگل ہیں سب کے سب
کیا ہوگا میرے مولا — ہے خون ہمارا کھولا
پاگل ہیں جنگ اور دولا — چھوٹا پیٹ کھانا
آگ لگاؤ تم۔ در در پھرنا ہی معلوم
سب میں عبدالکریم دانا

اردو ہے بالکل اردو ہی مگر کوئی دھوکا نہ کھائے ع
نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن

گانے کا جو گلبند کرنے میں موسیقی اصول کے موافق آکاروں کی ضرورت ہوتی ہے الفاظ میں مطابقت لازم ہے ورنہ گانا اپنے معیار پر درست نہیں بیٹھتا یہ ایک طولانی مبحث ہے بہر حال طبقات انسانی کے لحاظ سے زبان جدا جدا ہے۔ قمار خانہ والوں کی زبان، شرابیوں کی زبان، نبرد آزما بہادروں کی زبان، مکار دغا بازوں کی زبان مظلومان ستم کش کی زبان، غربت نصیبان آوارہ وطن کی زبان، اپنے لئے الفاظ خود بخود تجویز کرتی ہے۔ ہر طبقہ کے اصطلاحات و محاورات جدا جدا ہیں۔ اور گانے کی زبان ان خصوصیات کی پابند ہے۔ جناب طالبؔ کی بابت اتنا اور کہنا ہے کہ اُن کی فہرست تصنیفات میں "نازاں" کا نام محمد کاظم برلاس افسوس مراد آبادی کی حق تلفی نہ کرنا چاہیئے۔ "ہریشچندر" کو بھی میں آسانی سے اُن کی تصنیف قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں لیکن اس کمی سے اُنکے کمال میں کمی نہیں ہوگی بقول جناب کیفی اُن کو مکمل ڈراما نویس تسلیم کرا دینے کیلئے اُن کا "لیل و نہار" کافی ہے۔ وہ مر گئے اور بہت راز اپنے ساتھ ہی لے گئے۔

امتحاں کر کے جفاؤں کا وہ فرماتے ہیں
میرے صدقے میں تمہیں اتنی وفائیں آئیں

پنڈت نرائن پرشاد بیتاب

اُن کے اردو ڈراما محاسنِ زبان اردو سے محروم ہیں۔ یہ میدانِ علم و فضل کے شہسوار نہیں ہیں۔ اردو ادب کا مذاق صحیح اُن لوگوں کا حصہ ہے جو ملکی زبانوں سے باخبر ہیں کیونکہ اردو کو چار چاند لگانے والے ہندوستان کے وہ ادبا ہیں جن کا سینہ علوم مشرقیہ سے لبریز تھا۔ زبان اردو کے مشاہیر دور متوسط میں سید احمد خاں مولوی نذیر احمد صاحب، مرزا غالب، مولانا شبلی، مولانا حالی، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ کہے جاتے ہیں۔ اور یہ سب جوہر علم سے آراستہ و پیراستہ تھے اردو کا وہ دور گیا کہ گھر کے اندر کی باتوں پر فخر کر کے ہر شخص کہہ دیتا تھا کہ اردو تو ہمارے گھر کی لونڈی ہے۔ اب اردو حاصل کرنے کے لئے ارباب سواد کا غلام بننا پڑتا ہے میں نہایت افسوس کے ساتھ اظہار رائے پر مجبور ہوں کیونکہ تنقید نقاد کے لئے دلیل معلومات ہے۔ ۳۵ سال سے دہلی میں میری آمد و رفت ہے میں نے پنڈت صاحب کو کسی معرکہ آرا مشاعرہ میں بلکہ کسی معمولی مشاعرہ

میں بھی نہ دیکھا۔ اور نہ گروہ شعراء سے اُن کا نام نامی سننے میں آیا۔ البتہ وہ زمانہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری کمپنی کے اشتہار پنڈت صاحب کے زیر اہتمام چھپتے تھے۔ اور پنڈت صاحب کسی مطبع کے ملازم تھے۔ دفعتہً سننے میں آیا کہ پنڈت صاحب نے میدان ڈرامہ نگاری میں قدم رکھا اور غالباً اُنکا پہلا ڈرامہ "قتل نظیر" تھا۔ یہ خبر ذرا حیرت انگیز تھی کیونکہ پنڈت صاحب تاریکی سے دفعتہً روشنی میں آگئے تھے۔

لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اُن کی ترقی و شہرت کی ابتدا اس ڈرامہ سے ہوئی ہو، لیکن اس سے پہلے پنڈت صاحب کی سوانحمری شہرت شاعری کے اعتبار پر ایک ورق سادہ ہے۔ میرے نزدیک اس ڈرامہ کی شہرت کا راز عریاں ہے۔ نظیر دہلی کی ایک طوائف تھی اور ہیرو پنجاب کا ایک امیر زادہ تھا، یہ سچا واقعہ دہلی کے اسٹیج پر رونما تھا کہ دفعتہً بذریعہ ڈراما کارگاہ تمثیل پر آگیا۔ اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں، کہ اس واقعہ سے جذبات عام کو کیسا تعلق تھا۔ پلاٹ کی ترتیب میں روزنامچہ پولیس سے کافی مدد ملی۔ جو پلاٹ خاص و عام کی زبان پر گردش کر رہا تھا جلوہ گاہ قوت باصرہ ہوکر مہیج جذبات حسن و عشق ہوا۔ جو کچھ ہوا اچھا ہوا اور اچھی سوجھی اسی سوجھ بوجھ کی طفیل پنڈت صاحب داخل فہرست ڈراما نگاراں ہوئے۔

اسی شہرت کی بنیاد پر پنڈت صاحب اول اول پارسی ناٹک منڈلی میں روشناس خلق ہوئے پارسی ناٹک منڈلی کے مالک فرام جی اپو ڈرامہ اور متعلقات ڈرامہ سے بالکل بے خبر تھے۔ اور کسی قسم کا حس نہ رکھتے تھے۔ وہ کیونکر کمپنی کے مالک بن گئے۔ یہ قصہ طویل اور غیر متعلق ہے۔ اتفاقات زمانہ سے ہماری کمپنی کا ایک ایکٹر امرت لال کیشو ناراض ہوکر نکلا۔ مس گوہر سے اس کا تعلق تھا دونوں پارسی ناٹک منڈلی میں نوکر ہوگئے۔ امرت لال کیشو میرا شاگرد تھا۔ اردو ادب کا دلدادہ نہایت ذکی، حدید الذہن تھا۔ مصنفین ناٹک ساگر نے اس کو جبلی کمپنی کا نام آور ایکٹر اور سید عباس علی مرحوم کا ہمعصر لکھا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ امرت کو کبھی عباس علی کیساتھ جبلی میں ملازمت کا موقع نہیں ملا۔ اس معنی سے وہ عباس علی کا ہمعصر ہوسکتا ہے۔ کہ جب میر عباس علی نیو الفریڈ کمپنی میں ملازم تھے اس وقت نیو الفریڈ کمپنی میں امرت بھی موجود تھا۔ امرت نے کبھی جبلی کو خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ فرام جی اپو نے کمپنی کے پورے اختیارات امرت لال کے ہاتھ میں دے دیئے اس وقت سے ڈرامہ کی مخلوق قوت مشترکہ کے ذریعہ عالم تخلیق میں آئی۔ اور "امرت" نام کا ایک ڈرامہ اپنے محسن امرت کا نام لیتا ہوا اسٹیج پر نمودار ہوا۔ زمانہ نے ایک

اور کروٹ لی۔ اور پنڈت صاحب پر کاوس جی نے نظر انتخاب ڈالی مگر یہ وقت وہ تھا کہ امرت کیشو دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور میں نے کاوس جی کی کمپنی چھوڑ کر نیو الفریڈ میں بازگشت کی تھی اور میکبتھ کا تماشا نا تمام چھوڑ آیا تھا۔ پنڈت صاحب کو یہ تماشا مکمل کرنے کو دیا گیا۔ مگر کسی وجہ سے میکبتھ کی تکمیل نہ ممکن ہوئی۔ اور غالباً پنڈت صاحب کے قلم سے کاوس جی کی کمپنی میں پہلا تماشہ اردو "گورکھ دھندا" نکلا جس کا عدم وجود آج برابر ہے گورکھ دھندے کی اردو پر ہم جستہ جستہ کچھ لکھیں گے مذکور گورکھ دھندے" کے نکلتے ہی مالک کمپنی کی امیدیں قطع ہو گئیں۔ اور ان کو معلوم ہو گیا کہ پنڈت صاحب کی جیب اردو ادب کے جواہرات سے خالی ہے اس ہوشمند و مدبر مالک نے پنڈت صاحب کو ایسے راہ پر لگا دیا جسکے پیچ و خم سے بحیثیت اک پنڈت بیتاب صاحب پورے طور پر واقف تھے۔ یعنی ہندی ڈراما میں بیتاب صاحب دوسروں کے خضر راہ بن گئے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ ہندی ڈراما میں بیتاب صاحب کے کمال کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ لیکن باوجود اس کمال و شہرت کے انکے ہندی ڈراما کو جس چیز نے نقصان پہنچایا وہ تعصب مذہبی ہے۔

پنڈت صاحب پکے آریہ ہیں اور مذہبی نقطہ خیال سے ان کے دھارمک پلے معرض اعتراض ہیں ہیں۔ بقول مصنفین ناٹک ساگر پنڈت جی دھارمک پلے نکالنے کے بعد بڑی کشمکش میں پڑ گئے۔ ہر شہر میں ان کے ہندی ڈراما کو ترمیم کرنے کی ضرورت واقع ہوئی۔ شہر اور اقوام کے لحاظ سے ان کا تماشہ مذہبی جنگ کا الٹیمیٹم ہوتا تھا۔ باوجود ترمیم پھر بھی خطرہ باقی رہتا تھا۔ میرے نزدیک اگر کاوس جی کی موت کا سبب یہ تماشا قرار دیا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔

لاہور کے واقعات جن لوگوں کو معلوم ہیں وہ میرے اس خیال کی تصدیق کریں گے ڈراما کے تمثیل کی جان لیوا ممانعت غریب مالک کی موت کا بہانہ ہو گئی۔ کاوس جی فطرتاً ایک ضدی آدمی اور اولوالعزم شخص تھے۔ انہوں نے آنکھیں بند کرکے اپنے مقدمے پر روپیہ صرف کرنا شروع کیا اور ادہر ہزارہا روپیہ سینری پر صرف ہو چکا۔ مگر مقدمہ کی کامیابی میں اتنا وقت گذرتا رہا کہ ضعف مرض کاوس جی پر غالب ہوتا رہا۔ اور اندر اندر یہ تکلیف وہ عارضہ اپنا کام کرتا رہا۔ اور وہ اس ناقابل برداشت صدمہ سے جان بر نہ ہو سکے

ہندوستان کے جرائد اس دار و گیر سے مملو ہیں اور رسالہ "تحریک" کے انتقاد نے تو مصنف کے غرور کا سر نیچا کر دیا۔

کورو پانڈوں کا دسہرن پلاٹ نارائن بھٹ

کا چبایا ہوا نوالا تھا۔ اہل الرائے تو اس ڈراما کی
کامیابی کا راز ہندو مسلمان کی مجارٹی بتاتے
ہیں۔ اور یہ قرین قیاس ہے مسلمان ہندو اوسط ان
تھرڈ ہونے کی وجہ سے اسٹیج اس ڈراما کے لئے
ہندو پبلک سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ بہرصورت پنڈت
صاحب نے یہ مذہبی کھلونا مذہبی عقیدتمندوں
کے ہاتھ میں دے کر ان کا دل بہلا دیا۔ اور وہ اردو
ڈراما کی کاوشوں سے سبکدوش ہو گئے ع
فارغ البال ہوئے خوب فراغت پائی
ڈرامہ نگاروں کو لازم ہے کہ وہ اسٹیج کو ذاتیات
کا اکھاڑہ نہ بنائیں۔

اب میں پھر محسوس کرتا ہوں کہ مذہبی کارناموں
سے اکتا کر پبلک کی آنکھیں اردو ڈراما کی خوبیوں
کو تلاش کر رہی ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کی ہندو
قوم کو بھی اردو لٹریچر سے قدرتی محبت ہے اور
وہ محبت دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ خوش نصیب
اردو کی ترقی میں قدرت کا ہاتھ شریک ہے مقام
تعجب ہے کہ ہندوستان کے مایۂ ناز ہندو جنکو
میں بہترین افراد ادبا سے سمجھتا ہوں یعنی پنڈت
برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی ناٹک ساگر پر مقدمہ
لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "لیل و نہار" کے سب گانے
اردو میں۔ معلوم ہوا کہ اردو کے گانے انکے نزدیک
اہمیت رکھتے ہیں۔ گو ہم اس مسئلہ میں ہمخیال نہیں

مگر اردو کی ہر دلعزیزی اس درجہ تک پہنچ گئی ہے
خدا نظر بد سے بچائے۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے
کہ جناب کیفی پنڈت صاحب کی بابت تحریر فرماتے
ہیں کہ "وہ بیتاب جلال و شکوہ کو ہاتھ سے جانے نہیں
دیتے" "مجھے افسوس ہے کہ اپنے ہمعصروں کے متعلق
جو رائے تمام تر میرے سینہ میں محفوظ تھی مجھے آج بے
نقاب کرنا پڑی۔ خدا علیم ہے کہ میں اپنی وجاہت
ظاہر کرنے کے لئے ایسا نہیں کرتا مگر مجبور ہوں
کہ وقت و زمانہ مقتضی ہے کہ میں پردہ اٹھاؤں
اور مجبوری سے ایسا کرتا ہوں۔

(گورکھ دھندا)

ایک سہیلی ہیروئن کو آرائش پر مائل کرتی ہے اور
ہیروئن جواب دیتی ہے ع
ذرا سی ذرا سرمہ یونہی کچھ کر کرا لوں گی
قطع نظر ذم کے۔ یہ اردو بجائے خود اظہار جلال و شکوہ
کرتی ہے۔ اردو کا دعویٰ اور بغیر عمق علم ع
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
ایک دوسرے ڈرامہ میں دربار آراستہ ہے
اور دربار کی شان و شوکت پر شاعرانہ نغمہ سنجیاں
ہو رہی ہیں ایک درباری کی زبان سے ۔
پڑا ہے ناچ کا واللہ کانچ پر بھی اثر
شراب جام میں تھرکے ہے جام ہاتھوں میں
اللھم اھدنا الصراط المستقیم شکوہ و جلال

وہم و ابتذال کے مترادف الفاظ نہیں ہیں۔

بات یہ ہے کہ پنڈت صاحب کو پارسی ناٹک منڈلی میں اُسوقت ڈرامہ لکھنے کا موقع ملا جب کہ اتفاقات سے اسٹیج صنف نازک کی کرشمہ سازیوں سے بیشک فرانس ہو رہا تھا۔ اس وقت کا ایک سین آج بھی میری آنکھوں کے سامنے جلوہ افروز ہے

مس گوہر کا گانا

کہوں کاسے شرم کی یہ بات مشکل سی کٹتی ہے رات

اُس کے پوشش تو جرعہ کشانِ بادۂ شباب کے لئے محرک جذبات نفسانی تھے۔ اور حسن گلو سوز گلہ سازی کی چوٹ کھاتے ہوئے شکار درجہ خاص کے صوفوں پر مرغ بسمل کی طرح کروٹیں بدل رہے تھے۔

گدرا گیا گورا گات

جب اس ٹکڑے کی نوبت آئی تو سامعین سر بزم کے معمول کی طرح بیہوش تھے۔ آگے سے ڈریس کا کٹ خاص طور پر حسن صبیح کی عریانی کا حیا سوز منظر پیش کر رہا تھا تقریباً پچیس برس کا ذکر ہے کہ جب حسن کی دوکان پر بڑے بڑے اور موٹے حرفوں کا سائن بورڈ مشتاقوں کی نظروں کو اپنی نوک دار سطح پر جذب کر رہا تھا پانچ مرتبہ ونس مور کی نوبت آئی اور اگر ہندوستان کی مشہور پری جمال ایکٹرس زحمت تکرار گوارا کرتی تو حشر تک ونس مور کا سلسلہ قائم رہتا۔ نقادوں کے نزدیک اس منظر کو ڈرامسٹ کی نوک قلم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ حسن کی الکٹرک سٹی اپنا کام کرگئی۔ وائے بر حال اُن ڈرامہ نگاروں کے جن کے اسٹیج پر عورت کا آنا داخل کفر تھا۔

ذاتیات ڈرامانویس اپنے چال چلن کیوجہ سے بدنام ہیں۔ اُن کی شخصیت میں کوئی ایسا وزن نہیں ہے جو افعالِ قبیح کا کفارہ کرسکے ڈرامہ نگاروں میں ایک اور طبقہ ہے جس نے اپنی عمر کا ابتدائی حصہ ادنیٰ پیشوں میں صرف کیا اور آخر میں ڈراما کی دنیا میں خروج کیا۔ وہ غیر معتمد اور مشتبہ لوگ ہیں۔ جو مال مسروقہ کی حیثیت بگاڑ کر خود مالک بن بیٹھے۔ بڑے بڑے فلاسفروں کا قول ہے کہ شاعر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ شاعری کی رو رکنے والی چیز نہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی شاعری کا سرچشمہ پھوٹ نکلتا ہے۔ انحطاطِ عمر کے بعد ایسے جوہروں کا اُبھرنا ممتنع الوقوع ہے موسیقی اور شاعری یعنی ترنم آواز اور وزن شعر تعلیم قدرت ہے اگر عالم طفلی سے اس کا اثر محسوس نہ ہو تو عالم انحطاط میں یہ ترقی معکوس کہی جائے گی۔ شعرا کے تذکروں میں اور ماہران فن موسیقی کی تاریخوں میں یہ خصوصیات خاص طور پر لکھی گئی ہیں۔ اس لئے ہم بھی ان لوگوں کو ڈراما نویسوں کی صف میں لانا نہیں چاہتے۔ حالانکہ ہماری ہر دلعزیزی کو اس قسم کی منافرت سے بہت نقصان پہنچا ہے مگر ہم نے کبھی اسکی پروا نہ کی زمانہ اس مصرعہ کا مقتضی

ہے ع

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو

لیکن یہ انسان کی کمزوری ہے کہ اپنی تعریف کیلئے بے جوہروں کی تعریف کرنے لگے۔ ہمارا قلم ایسے افراد کی مدح سرائی میں شکستہ ہے۔ ارباب کمال کا حق غصب کرکے غیر مستحقین کو دینا یہ شان ایثار نہیں اس کمزوری سے خدا محفوظ رکھے۔ یہی باعث ہے کہ احسن ناکارہ وہیچمدان کو مغرور بنا کر لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ میرے عزت افزا تعداد میں بہت کم ہیں اور وزن میں بہت زیادہ ہیں ؎

سراسر ننگ ہے تحسین جوہر ناشناس احسن
بہت نکلے ہمارے قدرداں ہر چند کم نکلے

جناب مخلص حیدر آبادی

میں حضرت مخلص سے واقف ہوں۔ اُن کی تصنیفات سے قیمتی آنسو اُنکے کمال کی جید دستاویز ہے۔

افسوں بنارسی

پارسی ناٹک منڈلی کے قدیم ڈراما نگار تھے اُن کا پیشہ زردوزی تھا اور اس پیشہ کی غرض سے بمبئی میں تشریف لائے تھے۔ عرصہ تک زردوزی کرتے رہے کچھ لکھے پڑھے تھے کسی ذریعہ سے پارسی کمپنی میں پہنچے اور ملازم ہوگئے

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے

انہوں نے کام کرنے کے لئے دور اچھا پایا۔ بمبئی کے دولتمند رنگیلے جن کا کام شام سے کھیت باڑی افارس روڈ گرگاؤں کے چکر لگانا۔ رنڈیوں کے مکان پر دنگہ فساد کرنا کیسٹا نمبرون اور برانڈی کے کاگ اڑانا تھا ان کو اس سے کیا غرض تھی کہ تماشا کیا ہے اور کس کا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایک منظر ایسا چاہتے تھے جو کیف بادۂ ناب کو پرپرواز لگا کر آسمان ہفتم پر پہنچادے۔ شاعری موسیقی محاسن ڈراما سے وہ بے خبر تھے۔ یہ ذکر تقریباً تیس سال قبل کا ہے اب بمبئی میں تعلیم وتہذیب کا دور دورہ ہے لیکن اب بھی کبھی کبھی بزرگوں کی سنت موکدہ قایم رکھنے کے لئے کوچہ جاناں میں طوفان بدتمیزی نازل ہوتا رہتا ہے۔ کوئی ننھی جان منی جان کا دیوانہ ہے تو کوئی کسی کی شمع حسن کا پروانہ ہے شاعر نے کیا ہذیاں بکا ہے اور ایکٹر نے کیا جھک مارا ہے اس اہمیت سے اُنکی قوت ممیزہ مستغنی تھی۔ ایسے وقت میں حضرت افسوں کوس من الملک بجا رہے تھے۔ جب دنیا نے ڈرامہ کا ایک دوسرا منظر پیش کیا تو اُن کی تصنیفات کی سرد بازاری ہوگئی۔ اُن کا بھی انہماک جاتا رہا رخصت لیکر وطن گئے اور پھر واپس نہ ہوئے اُن کے بعد پنڈت بیتاب صاحب نے اُنکے منصب پر قبضہ کیا۔

منشی بیکل صاحب

غالباً ضلع علی گڈھ کے رہنے والے تھے دلہہ اس

کنبو کے اشتراک عمل سے مس گوہر کی کمپنی میں "نئی روشنی" کا تماشا لکھا۔ عامیانہ باتیں زیادہ تھیں۔ حالانکہ مس گوہر نے اُس کی کامیابی میں جان توڑ کر کوشش کی مگر نتیجہ اچھا نہ نکلا۔

اس کے بعد چند ماہ نیو الفریڈ کمپنی میں بھی ملازم رہے۔ مجھ سے غالباً ۱۹۱۵ء میں لکھنؤ میں ملاقات ہوئی پھر معلوم ہوا کہ انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آدمی خوش گپ تھے۔ علمی سواد سے معرّا تھے۔ مشاقی سے لوگوں پر اظہار قابلیت کرنا چاہتے تھے کم سواد لوگ اُن کی آمد سے مرعوب ہو جاتے تھے

منشی عبداللطیف صاحب شاد

ان کا وطن بمبئی میں ہیں جوہر انسانیت سے آراستہ و پیراستہ بمبئی کی اقوام میں علمی قابلیت کا ایسا شخص دوسرا میری نظر سے نہیں گذرا۔ مذاق انگریزیت اور معلومات سیاسیات کا یہاں ذکر نہیں ہے۔ تہذیب قدیم کے اسکول کے تعلیم یافتہ ہیں۔ بقدر ضرورت عربی اور کافی طور پر فارسی کی استعداد ہے۔ فن کے ماہر ہیں۔ مرد میدان ہیں۔ شاعری کا شوق ایام صبا سے ہی منشی امیر احمد صاحب مینائی کے شاگرد رشید ہیں ایک غزل میں فرماتے ہیں ع

ہوں میں شاگرد امیر احمد مینائی کا

باوجود علم و فضل نہایت خلیق و متواضع شخص ہیں۔ متانت و سنجیدگی کی یہ حالت ہے کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اتنے معلومات کے آدمی ہیں بے ضرورت لن ترانی اُن کا شیوہ نہیں میرے حال پر عنایت فرماتے رہتے ہیں۔ اکثر تشریف لاتے تھے صحبتِ علم گرم رہتی تھی۔ اظہار درد دل کرتے تھے۔ اور زمانہ کی نا قدریوں کا شکوہ کرتے رہتے تھے اُنکی خاموشی و نیک نفسی سے فائدہ اٹھا کر لوگ اُن پر بیجا اعتراض کرتے تھے۔ دل ہی دل میں غصہ کھا کر رہ جاتے تھے ناٹک کی لائن میں جب کام کیا تو ارباب نظر اور اہل الرائے کو تسلیم کرنا پڑا کہ یہ تخیل کسی عمیق معلومات والے کا ہے۔ اُنکے ڈراما زبان اور فن کے اعتبار سے قابل اعتماد اور لائق مدح ہیں۔ اور مقبول ڈراموں میں "سرفروش" "جنون وفا" کا شمار ہوتا ہے۔

مصنف غافل مسافر

غافل مسافر کے مصنف حیدر آبادی صاحب بھی قابل ذکر ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت انکا تخلص یاد نہیں۔ ہندوستان کا اسٹیج اُن سے روشناس ہے۔ نہایت سلیم الطبع اور سنجیدہ شخص ہیں خلیق و مرنج مرنجاں راقم پر بہت عنایت فرماتے تھے اور اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔

عباس علی صاحب

کامیاب ڈراماسٹ ہیں صورت آشنا ہوں انگریزیت کے دلدادہ ہیں اُنکے کلام کے محاسن و

معائب کی بابت میں کوئی رائے نہیں رکھتا اور نہ میں نے اُنکے ڈرامہ کی سیر کی ہے۔ میرا خیال نقادی، شاید اُن کو خوش کرنے سے قاصر ہے۔

نازاں دہلوی ڈرامہ نگاروں میں نام آور شخص ہیں۔ اُن کا کمال اعتبار شہرت میری مدح سرائی سے بے نیاز ہے میرے عنایت فرما ہیں اور ایک کامیاب ڈرامانٹسٹ ہیں۔

مصنفین ناٹک ساگر بعض گمنام تماشوں کے مصنفین کا نام دریافت کرتے ہیں اُن کے استفسار کا جواب ہم اپنے معلومات کے موافق دیتے ہیں۔

نام تماشہ	نام مصنف
ظلم وحشی	اشون بنارسی
تبدیل قسمت	"
بکاولی	طالب بنارسی
کنک تارا	احسن
زنجیر گوہر	عباس علی
دو رنگی دنیا بزبان گجراتی	بہمن جی کابراجی
انسار آف منگریلیا	افسون مرادآبادی
امرت	مشترک العمل
تیغ جنگ	چوں چوں کا مربہ کوئی پنجابی ایکٹر صاحب

نوائے مضطر

(از افتخار الملک اعتبار الشعرا خان بہادر حضرت مضطر خیرآبادی)

تو اگر بعد فنا ہاتھ لگا لے مجھکو — ساری دنیا ابھی کاندھے پہ اُٹھالے مجھکو
دور کی طرز ادا مار نہ ڈالے مجھکو — جلوۂ یار وہیں پاس بلالے مجھکو
آپ تو کر گئے فرقت کے حوالے مجھکو — دل بھی پہلو میں نہ چھوڑا جو سنبھالے مجھکو
اے فغاں رسم محبت کا بھی کچھ پاس رہے — کہیں بدنام نہ کردیں مرے نالے مجھکو
ساز ہستی ہوں صدا سنکے تڑپ جائیگا — چھیڑ تو دیکھ ذرا چھیڑنے والے مجھکو
اے فنا رنگ محبت تو ہے مجھ میں بھی نہاں — تیرے دھوکے میں کوئی پس نہ ڈالے مجھکو

مضطراب رنج جدائی نہیں اُٹھتے مجھ سے
اس سے بہتر ہے کہ اللہ اٹھالے مجھکو

حشرِ جذبات

(از جناب آغا محمد شاہ صاحب حشر کاشمیری)

قربان ہر ستم پہ ہی سو لذتِ کرم
عذرِ جفا نہ کر نگہِ التجا کے ساتھ

جوشِ نمودِ جلوۂ گل لائی ہے بہار
طوفانِ رنگ و بو بھی ہی ابرو ہوا کیساتھ

ناکامیٔ محبت و محرومیٔ وصال
پیدا ہوئی ہیں قسمتِ اہلِ وفا کیساتھ

صرفِ کرم تھی وہ نگہ ناز بزم میں
میں بھی نہ کہہ سکا غمِ دل التجا کیساتھ

لڑتے ہیں اختلافِ عقاید پہ حشر کیوں
یہ تو ہے اک معاملہ دل کا خدا کیساتھ

آگرہ - ۳۰ - نومبر

مکرم من!

تسلیم۔ عنایت نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا دلی شکریہ! اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا بدل گئی لیکن میں نہ بدلا۔ آہ ؎

بے گانہ ہوئی دنیا رسم و رہِ الفت سے
اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

خط کیا لکھوں، چاند کے چاند آپ سے ملاقات ہو ہی جاتی ہے میں ہرگز آپ سے خفا نہیں ؎

نارسائی سے دم رُکے تو رُکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

کلام کیا بھیجوں؟

جو لکھا پڑھا تھا نظام نے اسے آہ دل سے بھلا دیا

شاہ دلگیر

تحقیق قصہ پدمنی

(مسلسل)

(از جناب مولانا محمد احتشام الدین صاحب دہلوی ایم اے (علیگ)

جیساکہ پہلے اعلان کیا گیا تھا نئی جلد میں اس مضمون کا مسلسل جاری رکھنا مدنظر نہ تھا اور اسلئے فیصلہ کیا گیا کہ اسے کتابی صورت میں پیش کیا جائیگا لیکن اکثر ناظرین کا زبردست تقاضا ہو کہ کتابی صورت میں شایع کرنے سے پہلے اسے سالہ میں ہی تمامتر شایع کردیا جائے۔ خود فاضل مضمون نگار کی بھی یہی رائے ہے۔ اسلئے یہ سلسلہ پھر شروع کیا جاتا ہو۔۔۔۔ ناظرین کو یاد رکھنا چاہئے کہ پچھلی قسطوں میں مختلف دلائل و شواہد سے (جن میں ۱۔ مثنوی پدماوت کی عدم تاریخی حیثیت ۲۔ رتن سین نام کسی راجہ کا نہ ہونا ۳۔ قلعہ کنبھلمیر کا عہد مصنف کی تازہ چیز ہونا ۴۔ ڈولیوں کے مشہور واقعہ کا شیرشاہ سے انتساب اور اسلئے اس کا خود مصنف مثنوی کے عہد میں وقوع ہونا نیز ۵۔ امیر خسرو کے بیانات مخصوص حیثیت رکھتے ہیں) اس واقعہ کی افسانوی حالت کو بے نقاب کیا جاچکا ہے اور اب۔۔۔! اختر

رتن سین نام کے علاوہ بھی عجب کیا ہے جو فرشتہ کی ماںقبل حکایت پدمنی کا ماخذ بھی مثنوی پدماوت کی زبانی نقل و حکایت ہو ایک کتابی حکایت کی زبانی نقل و روایت میں اصل سے جو فرق قدرتاً ہو جانا چاہئے وہ فرشتہ کی روایت میں موجود ہے اور یہی اسکی پہچان ہے کہ فرشتہ نے اصل مثنوی سے نہیں بلکہ اس کی زبانی روایت سے یہ حکایت اپنی تاریخ میں درج کی ہے مثنوی کے بیان سے بعض اختلافات فرشتہ نے دیدہ دانستہ بھی کئے ہیں۔ اور اصل بیان کو اپنی تاریخی تحقیق کی روشنی میں ترمیم و اصلاح کرکے درج کیا ہے۔ مثلاً مثنوی دو بار میں فتح چتوڑ کی تکمیل بیان کرتی ہو۔ فرشتہ جس کو معتبر تاریخ سے ایک ہی حملہ میں چتوڑ کا فتح ہو جانا تحقیق ہو ایک ہی بار میں فتح ہوجانا لکھتا ہے۔ مثنوی میں چتوڑ کا حملہ حصول پدمنی کے لئے عمل میں آنا لکھا ہو فرشتہ (جس کو معتبر تاریخ سے تصدیق ہے کہ پدمنی کا عشق نہیں بلکہ علاء الملک کوتوال دہلی کا مشورہ حملہ چتوڑ کا محرک اور بانی ہوا تھا) فتح کے عرصہ بعد جب کہ راجہ حالت قید میں تھا پدمنی کے حسن و جمال کی کیفیت سے بادشاہ کا خبردار ہونا بیان کرتا ہے۔ مثنوی میں راجہ دہلی سے فرار ہوکر واپس چتوڑ پہنچتا ہے۔ مگر فرشتہ جس کو تحقیق علم ہے کہ چتوڑ علاء الدین کے تحت و تسلط میں مضبوط تھا راجہ کا چتوڑ واپس پہنچنا خارج از امکان دغلطی سمجھ کر اسکی اصلاح کر

دیتا ہے اور راجہ کو کوہستانات محکم میں واپس پہنچا تا ہے
مثنوی کے بموجب پدمنی دوسرے حملہ میں فتح چتوڑ سے
قدرے پیشتر راجہ کی نعش کے ساتھ ستی ہو جاتی ہے
فرشتہ جسکو سوائے ایک ہی حملہ اور فتح چتوڑ کے کسی
دوسری چڑھائی کا علم و یقین نہیں یہاں خاموش ہو
جاتا ہے اور پدمنی کے انجام سے کچھ خبر نہیں دیتا -
احتمال اور قیاس پر چھوڑ دیتا ہے - مثنوی میں گورا
بادل چتوڑ کے دو سو سا جوان ڈولیوں میں سپاہی بھیجنے
کی تدبیر کے موجد بیان کئے گئے ہیں - فرشتہ اس ایجاد
کا سہرا راجہ کی بیٹی کے سر باندھتا ہے - یہ وہ زیادتی
ہے جس کا میواڑ کی دیسی حکایت میں بھی پتہ نہیں -
فرشتہ میں کہاں سے آئی - اگر فرشتہ نے مثنوی کے براہ
راست ذاتی مطالعہ کے بعد یہ حکایت نقل کی ہوتی تو
اس میں راجہ کی بیٹی کا ذکر نہ تھا - فرشتہ میں بھی نہ ہونا
چاہئے تھا - اس سے ظاہر ہے کہ قصہ کی زبانی روایت
فرشتہ نے نقل کی - اور اس زبانی روایت میں راجہ کی بیٹی
کا مذکور بطور حاشیۂ زبان خلق نے ایزاد کر دیا تھا - یہ
ایزاد محض بے بنیاد نہ تھی - حکایت مثنوی کی شہرت کے
ایام میں راسین[ل] کے واقعہ سے چتوڑ کی بیٹی عقلمندی میں
ضرب المثل ہو رہی تھی - عوام کے بیانات میں راجہ کو چھڑا
لانے کی تدبیر خوب کی ایجاد اسی سے منسوب ہو گئی - اور
اس طرح پدمنی کی عام روایت سے نقل کرتے ہیں فرشتہ
کے بیان میں راجہ کی بیٹی کا جادہ گر ہو جانا قیاس کیا جاسکتا ہے
چونکہ مثنوی اور میواڑ کی دیسی حکایت دونوں میں گورا بادل
سے راجہ کی تدبیر رہائی کی ایجاد و اختراع بالاتفاق منسوب
کی گئی ہے - فرشتہ اپنے بیان کا تنہا ذمہ دار ہے آخر ہی
صورت یہ ہو سکتی ہے کہ فرشتہ کو مثنوی اور میواڑ کی
موجودہ دیسی روایت دونوں سے مختلف کسی تیسری
روایت کا براہ راست پہنچنا تسلیم کیا جائے - اس روایت
کے بموجب یہ بیان ہی جو تمام قصہ کی بنیاد ہے غلط ہو
جاتا ہے کہ بادشاہ نے پدمنی کی خاطر چتوڑ پر چڑھائی کی تھی
اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ پدمنی کا خیال اور اس کا سوال
فتح چتوڑ سے ایک مدت کے بعد ظہور میں آیا - اور وہ بھی
اس طرح کہ "بسمع بادشاہ رسانید کہ در زنان راجہ زنے
است پدمنی نام سہی قدسیہ فام بجمیع صفات محبوبی متصف[ع]"
اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ پدمنی کا سرے سے کوئی
وجود ہی نہ ہو - بلکہ راجہ کو بادشاہ کی قید سے رہائی دلانے
کیلئے جو حیلہ تراشا گیا اُسی کا ایک فرضی جز پدمنی بھی
ہو اور چتوڑیوں کا پورا منصوبہ اس طرح ہو کہ : بادشاہ
حسن پرست واقع ہوا ہے اُسکو شوق دلایا جائے کہ

ل راسین مالوہ کی رانی درگاوتی چتوڑ کی بیٹی تھی راجہ اور تمام سرداروں کی رائے کے برخلاف کہ سلطان بہادر گجراتی کی اطاعت کو قبول کر کے راج
کو بچا لیا جائے" اس نے یہ رائے دی تھی کہ باجگذار بن کر رہنے سے بہتر ہے کہ عورتیں جوہر کریں اور مرد لڑ کر مر جائیں - چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا -
اس عظیم الشان واقعہ نے چتوڑ کی بیٹی کو رائے زنی میں ضرور ضرب المثل کر دیا ہوگا -

کہ پدمنی جس کی تعریف کتابوں میں مرقوم اور جس کے عنقا اوصاف کی زبانوں پر دہوم ہے، راجہ چیتوڑ کے محل میں موجود ہے۔ بادشاہ سنتے ہی گرویدہ ہوجائے گا اور اس کو طلب کرے گا اسکی سواری کے پردے میں راجپوت دہلی پہنچ کر راجہ کو اٹھا لائیں۔ چنانچہ مثنوی پدماوت میں چیتوڑ کا ہی ایک برہمن ہے جو بادشاہ کو پدمنی کی لگن لگاتا ہے۔ فرشتہ کے ان الفاظ سے بھی کہ "بسمع بادشاہ رسانیدند الخ ظاہر ہے کہ رسانیدند کا فاعل ضرور کوئی راجہ کے ہی گھر کا بھیدی اور پڑھا یا ہوا تھا ورنہ کس پر راجہ کے زنانخانہ کے خط وخال دیکھکر چشم دید بیان کرنے کا اعتبار ہوسکتا تھا۔ مثنوی میں اس شخص کا نام "راگھو" اس کا وطن چیتوڑ اور اس کا اپنے ساتھ رانی کا انمول مرصع کنگن لیکر علاؤالدین کے پاس جانا مرقوم ہوا ہے۔ اور اس نے بادشاہ سے پدمنی کے تمام کتابی اوصاف بھی بحوالہ اپنے تجربے اور علم کے بیان کئے ہیں۔ کہتا ہے۔ کہ

پدمن امرت ہنس سدورد ۱ سنگلدیپ بھلنہ موموردو
ساتوں دیپ دیکھ ہوں آوا ۲ تب راگھو چیتن کہو آوا
آگیا ہووے نہ راکھوں دہوکا ۳ کہوں سب نارتھ کی دوکھا
یہاں ستنی سنکھنی او چترن بن بانس ۴ کہاں پدمنی پدم سر بھنور پھرتھ جہ پاس

ترجمہ

(۱) پدمنی، امرت، ہنس، شیر سرخ یہ سب سنگلدیپ کی چیزیں ہیں۔

(۲) ہفت اقلیم کو میں دیکھ کر آیا ہوں، تب راگھو ہوشیار میرا نام مشہور ہوا ہے۔

(۳) اجازت ہو تو سب عورتوں کے اقسام مفصل بیان کروں

(۴) یہاں اس ملک میں ہستنی اور سنکھنی بہت ہیں چترنی بن باس یعنی کمیاب ہے اور پدمنی پدم (ایک نایاب خوش رنگ پھول جیسے نسرین رنگین کمال) جس کے گرد بھونرے اسکو پھول سمجھ کر منڈلاتے ہیں۔

اول تین اقسام کے مفصل بیان کے بعد پدمنی کے اوصاف راگھو نے اپنے علم سے اس طرح بیان کئے ہیں

چوتھی کہوں پدمنی ناری ۵ پدم سیس دئی سنواری
پدمن جات پدم رنگ اوہی ۶ پدم باس مدھکر سنگ ہوئی
ناسٹھ لانبی نا چھوٹی ۷ نا سٹھ پاتر نا سٹھ موٹی
سورہ کراں رنگ یہ تیہی ۸ سو سلطان پدمنی گنی
دیرگھ چار چار لگھ ہوئی ۹ سبھر چار جیوں کھینے ہوئی
او سس بدن دیکھ سب موہا ۱۰ چال مرال چلت، گت سوہا
سورہ کراں سپورن او سورہ سنگار۔
۱۱ اب تہ چار نت برنگوں جس سبھے سنسار

(۵) چوتھی پدمنی عورت کا بیان کرتا ہوں کہ اس کا پدم کا سا رنگ اور چاندسی ہوتی ہے۔

(۶) پدمنی کی ذات میں پدم کا سا رنگ پیدا ہے۔ پدم کی سی خوشبو آتی ہے بھونرے اس کے ہمراہ ہوتے ہیں

(۷) قد اس کا نہ بہت لمبا نہ بہت چھوٹا۔ نہ بہت دبلی، نہ بہت موٹی۔

(۸) سولہ صفتیں اس میں موجود ہیں اسے بادشاہ پدمنی یہ گن رکھتی ہے۔

(۹) چار چیزیں اس کی دراز چار کوتاہ ہیں۔ چار چیزیں موٹی چار دبلی ہیں۔

(۱۰) چاند سا بدن جسے دیکھ کر لٹو ہو جائیں چال ہنس کی بہت خوشنما چال۔

(۱۱) سولہ صفتوں میں کامل۔ سولہ سنگار میں پوری اب اس طرح بیان کرتا ہوں جیسے لوگ اسکے اوصاف بیان کرتے ہیں۔

بھونرے اس کے گرد منڈلاتے ہیں۔ دودھ چاول بھی اسکو گرانی کرتے ہیں۔ صرف پان اور پھول سے سیر رہتی ہے۔ گلے میں پان کی پیک اترتی نظر آتی ہے پان کی رگ نکال کر پان کھاتی ہے۔ سیج کے پھولوں میں کوئی پتی مل جائے تو نزاکت سے بیجان ہو جاتی ہے۔ چار چیزیں اُسکے جسم میں دراز، چار کوتاہ، چار باریک چار پُر ہوتی ہیں۔

دراز:- سر کے بال، ہاتھوں کی انگلیاں، آنکھیں لچھوئی لمبی گردن جس میں خطوط نمایاں۔

کوتاہ:- دانت مثل الماس، پستان مثل نارنج، پیشانی مانند ہلال و زیر ناف۔

باریک:- ناک جیسے تلوار خمدار، کمر جیسے چیتے کی کمر پیٹ جس میں آنت نہ معلوم ہو۔ ہونٹ سرخ مونگے کی مانند

پُر:- چیزوں میں رخسار سرین کلائیاں اور رانیں جن کی مستانہ چال۔

حُسن چودھویں رات کے چاند کا جسم کندن سا رنگ پدم کا سا جسم کی نفاست مثل کافور، ہڈیاں موتی چور سامنے آنکھ کر کے اگر کوئی دیکھے تو آنکھوں میں پانی بھر آئے۔ ہنسی میں دانتوں سے کرن پھوٹتی ہے۔ پھلجڑی چھوٹتی ہے۔ گفتگو ایسی جیسے بسنت میں کوکلا بولے چوٹی سے سانپ ڈر جائیں۔ بھویں کمان، پلکیں کاجل میں ڈوبی ہوئی۔ سیندور بھری مانگ جیسے کسوٹی پر خط طلا۔ موتی بھری زلفیں جیسے سیاہ بادلوں میں سفید بگلے۔ پیشانی پر تلک گویا سونے کے تخت پر راجہ براجمان ہے۔ آنکھیں نشیلی تیز، منہ تصویر سا، تل جیسے کنول پر بھونرا، نگاہ چنچل چالاک، پتلی کی گردش گویا جی ہنڈولے میں ڈال دیا۔ کبھی آتا ہے کبھی جاتا ہے۔ کان سیپ کی مانند اُن میں بالے چاند کے گرد ہالے بادلوں میں بجلی کی چمک دکھاتے ہیں۔ رخسار ایسے گلاب کے پھول مور کی سی گردن سانچے میں ڈھلی جیسا بانکا گھوڑا لگام میں کھچا ہوا۔ ڈنڈ اور کلائی صندل کے گابھے ہتھیلیاں کنول کا شگفتہ پھول۔ سینہ تھالی، پستان کٹوریاں طلائی شریفے کی جوڑی یا ایک تخت پر دو راجہ بیٹھے ہیں۔ پیٹ باریک جیسے میدے کی پوری کمر بھنبھیری۔ سینہ و سرین کے درمیان کمر گویا کامنی بین سنبھالے بیٹھی ہے رانیں کیلے کے تنے ناف بھنور۔ زیر ناف نورجہاں بیگم کا مصرعہ ترجواب "زیر داماں تو پنہاں چیست اے نازک بدن"[۱]

---

[۱] نوکت محبسرے نقش سم آہو کی مثال جو نورجہاں بیگم نے اپنے جوابی مصرعہ میں دی ہے ملک محمد جائسی علیہ الرحمۃ کی طبعزاد تشبیہ ہے جو نورجہاں سے پہلے گذر چکے تھے غالباً نورجہاں نے مثنوی ملاحظہ کی تھی اور یہی تشبیہ اسکے خیال میں رہ گئی تھی۔

یہ پدمن چتوڑ آئی! راگھو نے بادشاہ سے کہا کہ ان اوصاف کی پدمنی چتوڑ آئی ہے"

اگر یہ قصہ سچ ہے کہ بادشاہ کہ پدمنی پر فریفتہ کیا گیا تو اسکے سامنے یہ اوصاف کتابی پدمنی یعنی عورتوں کی مفروضہ چہارگانہ اقسام میں سے ایک نایاب قسم کے پیش کئے گئے نہ کہ گوشت پوست کے کسی اسم باسمیٰ زندہ نسوانی جسم کے۔ عورتوں کی اس قسم کا نام ہی مشہور ہے کسی نے دیکھا نہیں۔ اس کا اتہ پتہ بھی مبہم ہے۔ دہلی میں مشہور ہے کہ پدمنی اتفاقیہ چماروں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ راجستان کے بھوپے اسکو جیسلمیر کے کلمیت کی مولی بتاتے ہیں۔ راگھو اسکو صرف سنگلدیپ کا تحفہ اور شہر سرخ، ہنس آبحیوۃ اور پارس وغیرہ کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

پدمنی کی اس تعریف و سراپا سے ہی ناظرین محسوس کریں گے کہ یہ ایک خیالی اور فرضی وجود ہے۔ پھر اسکا ایسے ہی خیالی اور فرضی وطن سے آنا جیسا کہ ہندی لٹریچر میں سنگلدیپ ہے۔ اس قدیم زمانہ میں جب کہ چتوڑ سے سیلون کا سفر قطب شمالی کی مہم سے کم دشوار نہ تھا اسکے وجود کو اور بھی خیالی اور فرضی ٹھیراتا ہی کرنل ٹاڈ پر تعجب ہے کہ انہوں نے راجہ چتوڑ کا اسکو سنگلدیپ سے بیاہ کر لانا آنکھ بند کر کے لکھ دیا۔

سنگلدیپ ہندی داستانوں میں ایک خیالی سرزمین اور پرستان کے مرادف ملک کے معنوں میں آتا ہے۔ اگر ہم پدمنی کے وجود کو تسلیم کریں تو لازم آئیگا کہ گل بکاولی کے قصہ کی بکاولی اور اس کے پھول کو بھی حقیقی اور واقعی تسلیم کریں۔ خلاصہ یہ کہ جب اصل شے ہی معدوم اور موہوم ہو تو اس کا جوہر کرنا ستی ہو جانا وغیرہ، سب اسی ذیل میں موہوم و غیر معتبر اور ٹکسال باہر بیانات قرار پاتے ہیں۔

پس علاؤالدین کو راجہ کے محلات میں اس نایاب جنس کا وجود جتا کر بدعا بر آری اور حیلہ کاری کیلئے از سرتاپا؟ ہو کا ہی دیا گیا ہو تو کچھ عجب نہیں اس ملمع سازی کی چکاچوند میں ایک طرف تو حسن پرست بادشاہ کے پروانہ وار پھنس جانے کا گمان غالب تھا۔ ادھر راجپوتوں کی بھی یہ سنکر کہ تمام راجستان کی ناک کی ناموس و آبرو کا بادشاہ طلبگار ہے تلواریں سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے اور لڑنے مرنے کا جوش اور غیرت دلانے کی یہ حیلہ بہترین تدبیر ہو سکتی تھی۔ ایسی کارگر تدبیریں ہندوستان کے دقیانوسی مدبرین اور سیاست دانوں کو وقت پر اکثر

سلہ ایک قلمی کتاب میں نظر سے گزرا کہ۔ باوجود تلاش بسیار بادشاہان باجاہ و جلال کو بھی اب تک اس قسم کی تین عورتوں سے زیادہ میسر نہیں آئیں اس بے سروپا کتاب میں ان بادشاہوں کا جنکو اس جنس کے تین عدد میسر آئے نام نہیں دیا پس بظاہر یہ تین بھی گانے ہیں کوئی عدد صحیح نہیں۔

سلہ ہندی اثرات کے ماتحت رفتہ رفتہ مسلمان مصنفین بھی سنگلدیپ کو اس کی اس شاعرانہ خصوصیت کا حامل سمجھنے لگے چنانچہ امانت لکھنوی اپنی غیر فانی کتاب اندرسبھا میں لکھتے ہیں سے جاؤ سنگلدیپ میں اختر نگر میں ان۔ سوتا ہے اک ماہرو لال محل پر دھان

(دلہ) میرا سنگلدیپ میں ملکوں ملکوں راج۔ جی میرا بھی چاہتا جلسہ دیکھوں آج

اختر

سوجھ جاتی ہیں اور بابودمیں سشتابہ کا کام کرتی ہیں۔ انگریزی کارتوسوں کے سور اور گائے کی چربی سے مجرب ہونے کی بنیاد غدر ۱۸۵۷ء بھی اسی قبیل کی افواہوں میں قابل شمار ہے۔ دہلی کے ایک قدیم راجہ نے بھی ایسا ہی حیلہ مسلمانوں کے حملہ آوروں کے خلاف ہنود کے سواد اعظم کو برانگیختہ کرنے کے لئے اختیار کیا۔ کہ ایک بت جنگل میں لے جاکر پوشیدہ کردیا۔ اور شہرت دی کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ بت فلاں مقام پر جلوہ گر ہوگا۔ اور اس کا حکم ہے کہ تمام ہندو متفق ہوکر تن من دھن سے مسلمانوں کی مدافعت کریں۔ لوگوں نے اس مقام پر جاکر دیکھا تو واقعی بت موجود تھا۔ اس بنا پر ہنود کا ایسا جوش مدافعت میں ہوا کہ ہندو عورتیں تک زیور بیچ کر اس میں شریک ثواب ہوئیں۔ چتوڑ کے راجہ کا بھی دکھینا بلکہ اپنے سرداروں تک کو دکھادینا اسی قسم کی سیاسی تدبیروں میں ایک تدبیر سمجھی جاسکتی ہے فرشتہ نے جو پدمنی کا تذکرہ اپنی تاریخ میں درج کردیا اسکی تکذیب اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ عہد علائی کے واقعات کے بارے میں فرشتہ کا بڑا ماخذ ضیا برنی رہ کی تاریخ فیروز شاہی ہے۔ شہر میں جو ہنگامے انکی حدود تاریخ کے اندر ہوتے انہوں نے اکثر نوٹ کئے ہیں۔ اتنا بڑا ہنگامہ سولہ سو راجپوتوں کا شہر میں بفریب گھس کر قید خانہ پر ٹوٹ پڑنا اور مار کر نکل جانا شہر میں ضرور غیر معمولی ہلچل اور شگفت کا موجب ہوا ہوگا۔ اور حقیقت میں یہ ایک ناقابل معافی شوخی اور دارالخلافہ کے بندوبست و انتظامات کے حق میں ایک سخت زخم عظیم تھا جس کے لئے ناگزیر تھا کہ اس کے بانیوں پر انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے فوج کشی کی جاتی اور جہاں کہیں بھی وہ فرار ہوکر پناہ گزین ہوئے تھے وہاں پہنچ کر ان کی بیخ کنی کیجاتی جو مستلزم ایک اچھی خاصی لشکر کشی کا تھا۔ مگر نہ اس واقعہ کا نہ اس لشکر کشی کا ہم کوئی تذکرہ ضیا برنی میں نہیں پاتے خزائن الفتوح بھی جو ۷۱۱ھ تک کی فتوحات اور لشکر کشیاں ایک ایک کرکے گنواتی ہے خاموش ہے بادشاہ کا قلعہ کو خضر خاں سے لیکر راجہ کے بھانجے کو دے دینا چتوڑ میں ایک باجگذار دیسی ریاست قایم کردینے کا حکم رکھتا ہے جس سے واقعہ اور بھی اہم ہوجاتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ ضیا برنی اور خزائن الفتوح کی مطلق خاموشی پر تعجب کریں یا فرشتہ کی زود یقینی پر جس نے اس فرضی ہنگامے کی داستان زبانی سن کر اسکو واقعات میں شمار کر لیا! یہ یاد دلانا مگر ضروری نہیں کہ فرشتہ کا عہد شہنشاہی پدماوت کی شہرت کے عین عروج کے زمانہ سے مطابق ہے فرشتہ نے اگر خود مثنوی کو نہیں دیکھا تو زبانی اس عجیب تصنیف کے مضامین کا چرچا اس تک ضرور پہنچا جنکو اس نے تاریخ کی کسوٹی پر صحیح کرکے اسکی صورت حالات قابل یقین بناکر اپنی تاریخ میں ٹانک دیا یا بقول شاعر

سنا دے قصہ گو انکو مرا حال لگا دے یہ بھی ٹکڑا داستاں میں

(باقی)

پرواز خیال

از

جناب مولانا مولوی سیّد عبد السلام صاحب خیاؔل ایم اے (علیگ)

خیاؔل صاحب قبلہ کی یہ غزل "تذکرہ" کی حیثیت رکھتی ہے اور جیسا کہ ناظرین اسکے مطالعہ کے بعد اندازہ فرمائیں گے۔ یہ غزل اسکی مستحق بھی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس غزل کو اردو تغزل کا بہترین معیار تسلیم کیا جاسکتا ہے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

اختر

اس قدر تیرا تصوّر کبھی بڑھ جاتا ہے
آئینہ دیکھوں، تو منہ تیرا نظر آتا ہے

شوق کیا کیا شب وعدہ مجھے بھڑکاتا ہے
یہ سمجھتا ہوں ہر آہٹ پہ کہ تُو آتا ہے

دیکھ تو اس لئے میں تجھکو خفا کرتا ہوں
کہ مجھے تیرے منانے میں مزا آتا ہے

ایسے رہ رہ کے مچلتا ہے تری یاد میں دل
جیسے بچّہ کا کھلونا کہیں کھو جاتا ہے

عشق میں پہلے قدم پر ہی سنبھل جائے تو خیر
ورنہ پھسلا تو پھسلتا ہی چلا جاتا ہے

دل تو جل جل کے ہوا خاک، مگر سینہ میں
ایک پنکھا سا ہے جو آگ کو بھڑکاتا ہے

مہربانی میں بھی ہے اُن کی ستم کا پہلو
درد کم ہونے سے دل اور بھی گھبراتا ہے

جستجو کس کی ہے یہ بھی نہیں معلوم ہمیں
دل کسی شئے کو مگر ڈھونڈھے چلا جاتا ہے

روز یہ کہتا ہوں، اب انکو نہ دیکھوں گا کبھی
روز اس کوچہ میں اک کام نکل آتا ہے

ایک تصویر ہے جو دل میں کھچی جاتی ہے
ایک نقشہ ہے جو آنکھوں میں جما جاتا ہے

اپنے چھوٹے بھی تو بنتے ہیں مصیبت میں بزرگ
سایہ بڑھ جاتا ہے جب وقت زوال آتا ہے

ہجر کیا چیز ہے دوری کا فقط ایک خیاؔل
ورنہ معشوق بھی پہلو سے کہیں جاتا ہے

زندہ بدست مُردہ

(از جناب مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب دہلوی بی۔ اے (علیگ)

جن لوگوں کے کان "مُردہ بدست زندہ" کی عالمگیر کہاوت سے آشنا ہیں اُن کیلئے "زندہ بدست مردہ" کی انوکھی آواز بہت کچھ حیرت و تعجب کا باعث ہوگی ـــــ! اگر یہ سچ ہے کہ "جدت کے بغیر کوئی ادب ترقی نہیں کرسکتا" تو اسمیں بھی کلام نہیں کہ جدت کا عمل جس حد تک خیالات کیلئے ضروری ہے اسی حد تک مضمون اور عنوان مضمون کے لئے بھی لازمی ہے اور اس لحاظ سے "سرنامہ" کی شوخی یقیناً ادبی جواز سے محروم نہیں ہوسکتی۔ جدت اچھی ہو یا بری، اسکے لئے یہی کافی ہے کہ وہ جدت ہے۔ اور اگر دنیا فرسودگی پرست نہیں ہے تو اسکے لئے ہر ایک جدت کی بلحاظ جدت کے داد دینا ضروری ہے ـــــ مثلاً پرستارانِ مغرب کی اکثر مہ جبینوں کا لباس کی قید و بند سے آزادی حاصل کرکے وہ جامہ اختیار کرلینا کہ "جس کا نہیں سیدھا الٹا" یقیناً ایک دلچسپ جدت ہے اور قانون کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس جدت میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کرے اسی طرح قدیم و جدید شجاعت کے اظہار سے مختلف ابن سعود کا مُردوں کے خلاف اعلان جنگ کرنا دنیائے شجاعت میں دلیرانہ جدت سے کم نہیں اور اگر مولانا محمد علی صاحب قبلہ اور اُنکے پیرو اسکو پسند نہیں فرماتے تو اسکے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ انہیں قدامت پرستی کا مادہ بہت ہے ـــــ! بہرحال کہنا یہ ہے کہ جو اہل ذوق جدت کو بلحاظ جدت کے پسند فرماتے ہیں اُنکے لئے ہمارے محترم مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب دہلوی بی۔ اے (علیگ) کا یہ مضمون، بہت سی اہم دلچسپیوں کا حامل ثابت ہوگا ـــــ اس مضمون میں بتلایا گیا ہے کہ جدت کیا چیز ہے کس طرح کی جاسکتی ہے؟ اور وہ کون سے اسباب ہیں جو جدتوں کی نشو و نما میں امداد پہنچا سکتے ہیں؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اس موضوع کو چھیڑنا بھی بجائے خود ایک جدت ہے اور اسلئے قابل داد ہے۔ پھر فاضل مضمون نگار کا وہ انداز تحریر جو نت نئی جدتوں سے لبریز ہے ایک علیحدہ اور مستقل قصیدہ کا طلبگار رہے ہے غرض ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ مے نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

"زندہ بدست مردہ ایک "نئے ڈھب" مضمون ہے اسمیں مضمون نگار کا لب و لہجہ جس حد تک آزادانہ، بیخوف، اور تبسم آفرین رہا ہے وہ ہمارے اکثر اہل قلم کیلئے سبق آموز ہے کچھ شک نہیں کہ ہم میں جب تک ایسے نڈر اور بے دھڑک لکھنے والے پیدا نہ ہونگے جو بے تکلف اور بلا کسی مصلحت کے اندیشہ کے نئے نئے خیالات کو ادا کرنے کی جرات کریں، ادب کی ترقی محال ہے ـــــ یہ مضمون پڑھ کر ناظرین کو [illegible] طرح بے ساختہ ہنسی آجائیگی لیکن ساتھ ہی ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ استدلال کی صداقت کا اثر بھی رائیگاں نہ جا[illegible]

یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ "ہاں کچھ ہے" — ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان لوگوں کے حق میں جو برسوں سے قدامت پرستی کے سومنات میں پیشانیاں رگڑ رہے ہیں یہ مضمون ایک اچانک حادثہ کا کام دے گا اور انکے صدیوں کے تراشے ہوئے مقدس بت آناً فاناً میں ڈھ پڑیں گے اگر ایسا ہوا تو ہمیں یہ کہنے میں عذر نہیں کہ بہارستان ہر وقت اُن کی گالیاں سننے کو آمادہ رہے گا۔ ع تو مشق ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر:

آخر میں ہم محترم مضمون نگار کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر اس سلسلہ کو حسبِ عادت وسیع کر دیا جائے تو یہ اردو ادب کی ایک بہترین اور ضروری خدمت ہوگی اور بہارستان اس کے لئے ہمیشہ ان کا زیر بار احسان رہے گا۔ اختر

نقاد اپنی قیمتی رائے کے خلاف کسی بات کو مانتے نہیں۔ اور یہی اُنکے نقاد ہونے کی ایک بڑی دلیل ہے لیکن یورپ کے بڑے بڑے نقادوں نے بھی ایک بات عام طور پر تسلیم کر لی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ادب میں بھی اور علوم کی طرح اُسی وقت ترقی ہو سکتی ہے کہ ارباب قلم جدت سے کام لیں۔

جدت کیا ہے اور کس طرح کی جا سکتی ہے۔ یہ دونوں سوال بے ڈھب سے ہیں۔ پہلے سوال کا ایک مزیدار جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جدت وہ چیز ہے جو نقادوں کو نصیب نہیں۔ اسکے علاوہ اور طرح بھی یہ سمجھا یا جا سکتا ہے کہ جدت کیا ہے۔ رہا یہ کہ جدت کس طرح کی جائے۔ اسکا کوئی جواب نہیں۔ جدت کرنا کوئی جامعہ (یونیورسٹی) بھی نہیں سکھا سکتی۔ بلکہ درسگاہوں میں جدت ذرا مشتبہ نظروں سے ہی دیکھی جاتی ہے۔ صاحب جدت طالب علم انگلستان کی نامور جامعوں میں بھی مشکل سے ہی پنپ سکتا ہے۔ شے لی (   ) اور سون برن (   ) جیسے جدت کے ماننے طلبہ کو بھاگ جانا پڑتا ہے — یا اُن کو بھگا دیا جاتا ہے۔ تو اب مشکل صورت یہ ہے کہ ایک طرف تو جدت کوئی سکھا نہیں سکتا۔ اور دوسری طرف بغیر جدت کے کوئی ادب ترقی نہیں کر سکتا۔ اردو ادب کا یہ حال ہے کہ دنیا میں بہت پھسڈی ہے نتیجہ یہ کہ پھسڈی ہی رہے گا۔ کیونکہ ایک تو یوں ہی مریل سا پھپوند لگا۔ اور اس پر یہ خدا کی مار کہ قدامت پسندوں کے ہاتھوں اردو کی دنیا مردم خیز نہیں۔ جدت پسند دماغ پیدا نہیں کرتی یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ جدت کی لِم دریافت کرنی چاہیے اور اگر اس کا راز ہاتھ آگیا تو پھر کیا ہے جبین لکھنا ہے شہرت ہاتھ باندھے سامنے کھڑی ہوگی۔ اخباروں اور رسالوں میں اپنے ہی نام کا کلمہ پڑھا جائیگا۔ اور درود بوا کیا یہ تو ریڈیو کا زمانہ ہے ہوا کے ذروں تک سے واہ وا کی صدا آئے گی۔ اس لالچ میں — اور یہ شہرت طلبی کی کمزوری ہر انسان چھوٹا ہو یا بڑا ماں کے پیٹ سے لاتا ہے۔ اس کمزوری کے دباؤ میں اس طرف دھیان دوڑانا شروع کیا۔ دیکھ کہ یہ کوئی انوکھی کوشش نہیں ہے، ترقی کے قبلہ و کعبہ یورپ نے اس میدان میں بھی چھان بین

کی جا رہی ہے۔ اور کوشش ہے کہ یورپی مدرسوں اور جامعوں میں سے جو طالب علم نکلے وہ جدت پسند بن کر نکلے۔ لیکن جی نی اس کا طلسم وہاں بھی نہیں ٹوٹا۔ اتنی بات ضرور پیدا ہوگئی ہے کہ یورپ میں جدت کی قدردانی نے بدعت کی چاٹ یا سنک کہئے ان دماغوں کو بھی لگا دی ہے جو ماں کے پیٹ سے جی نی اس کا عطیہ نہیں لائے ہیں اس معاملہ میں یورپ کے رشیوں سے بھی پیاسا ہی پھرنا پڑا۔ یہ راز نہ کھلا کہ بدعت کس طرح کی جائے شہرت کی دلفریب دیوی کالے کوسوں دور ہوگئی۔ واہ واہ کے سہرے کے پھول ایسے مرجھائے کہ برف کی طرح گھل گھلا کر تخیل سے غایب ہو گئے۔ اس زبردست مایوسی سے پہلے تو دل بجھ سا گیا لیکن رفتہ رفتہ شہرت کی پری کے ان دیکھے چہرہ نے پھر دل کو کھینچنا شروع کیا۔ جدت کی لم کے ہاتھ نہ لگنے پر فطرتاً غصہ آنے لگا۔ اس وقت ظرافت کی دیوی نے اپنی ہلکی چاندی کی گھنٹیوں کی سی کھلکھلاہٹ سنائی اور گدی پر اپنا گدرا گدرا گدگداتا ہاتھ رکھکر سمجھایا کہ جدت کی جان میں ہوں۔ ہر ہنسی کی بات جدت ہے میری ہی دلکشا روشنی میں جدت کو لم سجھائی دے گی ایسے نفسیاتی موقع پر حسن اتفاق سے ایک لطیفہ پیش آیا جس نے اس ظرافت کی کرن کو کرنوں کی لڑ بنا دیا۔

ایک سن رسیدہ بزرگ اپنے آپ کو اردو ادب کا بڑا ہی ہواخواہ جانتے تھے۔ اور یہ جملہ اکثر فرما دیا کرتے تھے۔

"یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کل کی تعلیم سے ویسے دماغ کیوں نہیں پیدا ہوتے جیسے اگلے وقتوں میں ہوئے ہیں"

ہر ادبی محفل میں یہ قابل احترام بزرگ اس حیرت بھرے سوال کو اپنے خاص انداز میں ایک آدھ دفعہ ضرور چھڑکا دیتے تھے لیکن جب کوئی ادبی جدت انکے سامنے آتی تو بدک جاتے اور فوراً تخریبی تنقید پر پل پڑتے اپنے اگلے وقتوں کے عالی دماغوں کو معیار قرار دیکر ادب کی نئی چیز کی تکا بوٹی فرما دیتے ان بزرگ کو آخر ایک منچلے مل ہی گئے اور ایک دفعہ یوں بات چیت ہوئی بزرگ ادب پرور نے پہلے تو اوپر والا جملہ چپٹ دیا اور فرمایا۔

"اچھا جو جدت کی جاتی ہے وہ سبحان اللہ زبان کی ٹانگ توڑ دی جاتی ہے۔ مسلمات ادب کے خلاف ذوق سلیم کا خون کرکے بے سروپا باتیں کہی جاتی ہیں اور سمجھتے ہیں کہ صاحب ہم نے جدت کی"

منچلے بولے "قبلہ آپ جدت کے بھی طالب ہیں اور جدت کی جائے تو آپ ناک بھوں چڑھاتے ہیں، بگڑ جاتے ہیں۔ اور محض اس لئے کہ جن پرانے بلند حضرات کو آپ بڑا مانتے ہیں آج کل کی جدت اسلوب اور خیال میں ان بزرگواروں کے رنگ ڈھنگ سے جدا ہوتی ہے"

ہنس کے فرمایا "مغالطہ تو یہی ہے ادب کے پرانے الوالعزم ارباب نے جو کارنامہ چھوڑا ہے وہ ابدالاً جو

اور مسلمات سے ہے اس سے کوئی ذی ہوش انکار نہیں کرسکتا۔ ان کے راستہ سے آپ ہٹیں گے تو یقیناً اصحاب ذوق سلیم کے نزدیک آپ گمراہ ٹھیریں گے۔

"ہاں تو یوں فرمایئے کہ جدت کی تعریف آپکے ذہن میں جداگانہ ہے۔ ہر جدت آپکے مسلمات سے جدا اور ایک نئی راہ ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ آگے چلکر وہ بری یا اچھی ثابت ہو۔ قصہ مختصر یوں کیوں نہ فرمایئے کہ جناب والا اس قسم کی جدت سرے سے جانتے ہی نہیں جو واقعی جدت ہو آپ محض آجکل کے فیشن کے مطابق زبان سے جدت جدت فرمانے لگے ہیں"۔

بحث مباحثہ سے کبھی کوئی بات طے نہیں پاتی اور پھر ایسے بابرکت پیٹ بھرے بزرگ کب کسی کی مانتے ہیں یہ ادبی گڑیاں کھیلنے والے بزرگ منچلے سے ناراض ہو گئے اور سنا ہے کہ اب تک برا بھلا سناتے ہیں۔

کہیں اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اس بات کو ساری دنیا تسلیم کرتی ہے کہ جدت کسی تعلیمگاہ میں سکھائی نہیں جاتی اس لیئے کہ کوئی اسے سکھا نہیں سکتا۔ اس بات کو بھی ساری دنیا مانتی ہے کہ جدت کے بغیر ترقی جسے کہتے ہیں نہیں ہوسکتی ایک اور بات بھی اسی قبیل سے ہے لیکن دنیا اُسے نہیں مانتی۔ وہ بات یہ ہے کہ جو چیز واقعی جدت کہلانے کی مستحق ہوگی وہ خواہ زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق ہو اس شعبہ کی باتوں سے الگ ہوگی۔ اس شعبہ کی جانی بوجھی چیزوں سے انوکھی اور نرالی ہوگی۔

اور یقیناً ان چیزوں میں سے بعض کو غیر مسلمہ قرار دینے کی دعویدار ہوگی۔ اس رمز کو عام طور پر دنیا تسلیم نہیں کرتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کوئی نئی بات سامنے آتی ہے تو خود وہی لوگ ہمارے ادبی بزرگوار کی طرح جدت کا ورد پڑھتے رہتے ہیں۔ اس جدت اور اسکے پیش کرنیوالے کو ہمارے ایک شفیق بزرگ کے قول کے مطابق "ملاصبیان" سنانے لگتے ہیں۔

اس مضمون کا اصل مقصد یہ ہے کہ قارئین محترم کی خدمت میں جدت کرنے کا طریقہ پیش کیا جائے۔ لیکن اس طریقہ کو پیش کرنے سے پہلے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ جدت سے لوگ کیوں اسقدر چراغ پا ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک امر واقعی ہے۔ یا آج کل کی اخباری اصطلاح میں ایک ننگی حقیقت ہے کہ دنیا میں اس وقت جو کچھ انسانی تمدن کی پونجی ہے وہ اسی طرح اکٹھی ہوئی ہے کہ پرانے دیوتاؤں کو توڑ توڑ کر نئے دیوتا برپا کیئے گئے۔ ادب کے سوا اور چیزوں سے اس مضمون کو سروکار نہیں۔ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے ادبی بزرگوار کی ریش مبارک نے اپنی موجودہ وضع قطع "بے گنتی جدتوں" کے بعد اختیار کی ہے۔ اور ان کا لباس پاجامے سمیت بیشمار پرانی باتوں کے اکٹھے چھٹنے اور انوکھی تراش خراش میں سے گذرنے کے بعد کہیں اس موجودہ نوبت کو پہنچا ہے اس طرح جب انسانی زندگی کی ہر چیز مسلسل اور بے گنتی جدتوں کا پھل ہے تو پھر یہ بات غور طلب ہے کہ

انسان جدت کے رجحان کا احسان ماننے کے بدلے اسکے پیچھے کیوں اس طرح لٹھ لئے پھرتا ہے؟

انسان کی ساری خرابیوں کی جڑ تکبر ہے۔ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔ اپنے آپ کو اس مغالطہ میں ڈالے رکھنا کہ جس چیز پر میری رائے قایم ہو چکی ہے وہ قطعی ہے۔ جو بدقسمت اصحاب جدت کی پیٹتے ہیں ان کا گناہ کبیرہ یہ ہے کہ مسلمہ باتوں کی دنیا میں جو لوگ بڑے سمجھے جاتے ہیں یا اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں ان کی بڑائی کے مندر کو جہاں وہ اپنی بڑائی کی مورتی کی پوجا کراتے یا اپنے آپ بے غل وغش اپنی پرستش کرتے ہیں۔ اس مندر کو ڈھا دیتے ہیں یا ڈھانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے ادبی بزرگوار کو ہی لیجئے۔ وہ خیر سے مصنف بھی واقع ہوئے ہیں یعنی کتابیں بناتے ہیں۔ یا یوں کہئے ان کا قلم کاغذ کی فضا پر اسی طرح تھرکتا اور کاوے لگاتا ہے جس طرح پرانی وضع کے چابکسوار اپنے گھوڑوں کو دلہن کی طرح ٹھمکایا کرتے تھے۔ جتنی پرانی تنقیدی باتیں سینہ بسینہ یا قلم بقلم چلی آئی ہیں ان کو ہی اپنے چکنے چپڑے اور گھلے گھلائے الفاظ میں بن بن اور سنور سنور کر دہرا دیتے ہیں۔ اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ انھوں بھی فرماتے ہیں کہ اب ادبی دنیا میں جدت ہی نہیں ہے ایک دفعہ فرمایا

"دیکھو درد، میر، ذوق، مومن، غالب اور داغ اور . . . . ہاں یہ بزرگوار کس قدر اصحاب جدت ہے۔ ان [illegible] نے اردو کو کس قدر خراد چڑھایا ہے؟ آج کل جسے زبان کہتے ہیں قسم ہے پیدا کرنے والے کی وہ بھی کوئی زبان ہے۔ ارے صاحب کیا کہوں جو ذرا بھی جچتی ہو۔ کیوں میر صاحب کچھ کہتے نہیں"

میر صاحب ٹھیرے ان کی بڑائی کے مندر کے پجاری وہ کیا کہیں سوائے اس کے کہ ہاں میں ہاں ملائیں۔ یہ وجہ ہے کہ جدت اور اصحاب جدت سے دنیا عام طور پر ناراض ہو جاتی ہے جب کوئی بدنصیب ایسی کوئی جدت کر بیٹھتا ہے کہ جس سے لوگوں کی بڑائی کی کوئی مورتی ٹوٹ جاتی ہے تو لازمی ہے کہ بڑائی کے خواب خرگوش میں مست بزرگوار چونک پڑیں، بدک جائیں اور دولتیاں جھاڑنے لگیں۔ ہر جدت ترقی کی ایک سوت ہی نہیں بن سکتی بلکہ ہمارے ادبی بزرگوار جیسے جدت نما، قدامت پسند اصحاب کیلئے اصل خاکساری اور عجز کی بہترین تعلیم ہوتی ہے۔ ان کی آنکھیں کھول دیتی ہے ان کے دماغ کو جگا دیتی ہے اور ان کو یہ راستہ سجھاتی ہے۔ کہ کس طرح یہ گڑے مردوں کے پجاری صحیح معنوں میں اپنے آپ کو زندہ بنا سکتے ہیں جتنے سچے قدامت پسند ہیں وہ دراصل مردہ ہوتے ہیں اور اس دنیا میں ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے۔ کہ ٹھیٹ اور کورے قدامت پسند نوع انسان کی ننانوے فی صد تعداد کا دعوی کر سکتے ہیں۔ جدت پسند دماغ صدیوں کے دوران میں دو ہاتھوں کی انگلیوں پر ہی گنے جا سکتے ہیں۔ زندگی

کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان کھائے پیئے بیاہا جائے اورصاحب اولاد ہو جائے۔ اتنا تو ہر جانور بھی کر ہی لیتا ہے۔ زندگی۔ انسانی زندگی، موت سے بالا اور موت کی دسترس سے دور ہوتی ہے۔ وہ موت پر جیت پاتی ہے اور صرف جیت ہی نہیں پاتی، بلکہ موت کو اپنی بقا کا زبردست آلہ بناتی ہے۔ یہ کوئی فلسفیانہ نظریہ نہیں۔ واقعہ ہے ایک آدھ مثال لیجئے۔

دردؔ۔ دنیوی حیثیت سے نہ تو لکھ پتی تھے اور نہ جاگیردار اور نہ عہدہ دار ایک معمولی گمنام سے آدمی تھے۔ دہلی اور نواح دہلی میں جو لوگ شعر وسخن یا تصوف کا ذوق رکھتے تھے اُن میں اُن کا یوں ہی ساچرچا تھا۔ ایسے آدمی کو دیکھئے اور اُردو شاعری پر سکہ بٹھانے کو دیکھئے۔ میرؔ اور میرؔ کے بعد سے آج تک جتنے نامور استاد گزرے ہیں سب انہیں کے نام لیوا یا بغیر نام لئے اردو شاعری کی اساسی باتوں میں انہیں کے پیرو ہیں۔

دردؔ کے بیسیوں شعر اور مصرعے اردو زبان کے امٹ اجزا بن گئے ہیں۔ اچھا اب اُنکے زمانہ کے امرا اور ساہوکاروں کے نام ٹٹولئے سوائے چند تاریخی ناموں کے اور سب اس طرح مٹ گئے ہیں کہ گویا کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ ان امرا اور ساہوکاروں کی دعوتوں اور شادیوں میں پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا ہوگا! اور اتنا روپیہ کہ بیچارے دردؔ نے اپنی عمر بھر میں ان کی ایک شادی کے برابر روپیہ نہ صرف کیا ہوگا۔ مگر یہ جاگیردار یہ ساہوکار ایسے مرے ہیں جسے مرنا کہتے ہیں۔ ان کی اقتصاداً یا اثر ہستیوں کا کوئی واضح اثر اس ہماری زندگی پر نمایاں نہیں۔ اس کے برعکس دردؔ زندہ ہیں۔ ہم اب بھی اُن کے خیالات بولتے اور لکھتے ہیں۔ جس ڈھرے پر اردو شاعری کو انہوں نے لگا دیا۔ اسی پر بیشتر چلے جاتے ہیں۔ ایسی مثالیں زندگی کے ہر شعبہ میں ملیں گی اور اُن پر غور کرنے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ اصلی زندگی انہیں لوگوں کی ہے جو جسمانی موت کے بعد بھی اپنی ملت کی زندگی کا انمٹ حصہ بنے رہیں۔ ان لوگوں کے دماغ زبان اور ہاتھ پیر سے کام لیتے ہیں جو جسمانی زندگی رکھتے ہیں۔ اس دنیا کی انسانی سرگرمیوں کے ہر شعبہ میں آپ یہی بات پائینگے کہ پیشرو لوگوں میں۔ ان لوگوں میں جو آگے گئے۔ جو ہستیاں واقعی زندہ تھیں وہ جسمانی وجود کے کالعدم ہو جانے پر زمانہ کے ہاتھوں تقدس اور احترام کا رنگ قبول کرتی اور اور بھی چیرہ دست ہوتی جاتی ہیں اور اپنی حکومت کا سکہ اُن لوگوں کی روحوں پر بٹھا دیتی ہیں۔ جو جسم رکھتے ہیں مگر محض اس لئے کہ ان مُردہ زندوں کے ارادہ اور اشارے پر اُن کے جسم اور ان کے نفوس کٹ پتلیوں کی طرح ناچیں۔ حقیقت حال تو یہ ہے لیکن ان کٹ پتلیوں کی طرح ناچنے والے زندوں نے لطیفہ یہ کیا ہے کہ انتہائی بے بسی اور لاچاری

کے اظہار کیلئے کہاوت یہ گھڑی ہے۔

"مردہ بدست زندہ"

اس کی بعینہٖ یہ مثال ہے کہ ایک بچہ خود تو باوا کی گود میں ہو اور کہے یہ کہ "آہا! ابا ہماری گود میں ہیں!" ذرا زیادہ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہم مردہ بدست زندہ جس حالت کے متعلق کہتے ہیں خود اس وقت بھی محض زندہ جسم والے مردہ زندوں کے احکام کے مطابق ہی بے جان جسم کو ہاتھ لگا سکتے ہیں۔ یہ مجال نہیں کہ مردہ جسم کے ساتھ بھی اپنی مرضی کے مطابق سلوک کر سکیں اس پہلو سے "مردہ بدست زندہ" کی کہاوت اور بھی کھوکھلی اور جھوٹ پر مبنی نظر آتی ہے۔

اس دنیا میں ہر طرف مُردوں کا راج ہے جسمانی موت کے بعد جسم کی کمزوریوں اور لغزشوں سے پنڈ چھڑا کر زوردار مردے اور بھی کُھل کھیلتے ہیں۔ زندگی میں اس مدت میں جب تک جسم روح کی بوجھل بیڑی بنا رہتا ہے بڑے بڑے لوگوں سے بھی ایسی حرکتیں سرزد ہو سکتی ہیں کہ آس پاس والے اُن کو اپنا سا کمزور سمجھنے لگیں لیکن جسم کی قید سے آزاد ہو کر پھر کوئی آنکھ ان زبردست ہستیوں کی کسی لغزش سے دوچار نہیں ہو سکتی اور لوگوں کے تخیل میں مرور زمانہ کے ساتھ ایک ایسا تصور بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے جس کو کسی کمزوری کی لغزش کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جیسا کہ کہیں عرض کیا گیا ہے بڑے لوگوں کی جسمانی موت ان کی عظمت اور بزرگی کا ایک زبردست منبع بن جاتی ہے۔ اور جسم کی قید سے آزاد ہو کر زندہ اصحاب بیدردی کے ساتھ خود اپنی موت کو اپنی جبری حکومت۔ لپنے استبداد کی ایک زبردست تلوار بنا لیتے ہیں جس کی دھار پر زمانہ کا بہاؤ اور سان چڑھاتا جاتا ہے اور جسم کی حد تک زندہ لوگوں کی آزادی کی جڑیں اور آسانی سے کٹتی جاتی ہیں۔

جدت کی پہلی اور آخری شرط یہی ہے کہ ان مُردہ زندوں کے استبداد سے نجات حاصل کی جائے جو لوگ محدود معنوں میں زندہ ہیں یعنی جو صرف جسم کی حد تک جان رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی چاہیتی مُن بسی خواہش یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح وسیع تر زندگی حاصل ہو بہت کم کیا بلکہ خال خال ہی آدمی اس رمز کو سمجھتے ہیں کہ ایسی زندگی سچ مچ اپنی زندگی اسی وقت ہاتھ آسکتی ہے کہ اپنی روح کو رفتگاں کی ہٹ دھرمیوں اور چیرہ دستیوں سے آزاد کیا جائے کیونکہ یہ ظاہرا سبکساران ساحل محض دکھاوے کے غیر موجود ہیں در اصل وہ ہماری روح اور ہمارے نفس پر۔ ہماری کل ہستی پر تسمہ پاؤں کی طرح سوار ہیں۔ چونکہ یہ روح سوار حضرات دکھائی نہیں دیتے اس لئے یہ اور بھی خطرناک ہیں اور موت کے ڈراونے آنکس سے ہماری روحوں کو جدھر چاہتے ہیں لئے جاتے ہیں۔ اور پھر اپنے راستہ سے بال برابر بھی بھٹکنے نہیں دیتے۔

اس ارضی زندگی کے دوران میں انسان انسان سے

خواہ وہ انگریز ہی کیوں نہ ہوں ہر طرح کی آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ بہت سے آدمی آپ کو ایسے ملیں گے جو انگریزی کی تعلیم پا کر بھی یورپ سے مرعوب نہیں ہیں۔ اسی طرح بعض ایسی ہستیاں بھی نکل آئیں گی جو پرانی تعلیم کے باوجود عربوں یا یونانیوں کے رعب داب میں نہیں ہیں۔ لیکن یہ سب بھی کسی نہ کسی پہلو سے مردہ زندوں کے حلقہ بگوش ضرور ہیں۔ پوری آزادی ان آنکھ سے چھپی ارواح سے کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ پوری آزادی نہ سہی تھوڑی بہت بعض چیدہ حضرات ہر زمانہ میں حاصل کر لیتے ہیں اور اسی حد تک زندہ بن جاتے ہیں۔ یہ بات ایک کلیہ قرار دی جا سکتی ہے کہ جو جسم والی روحیں بقا کی طالب ہیں ان کے لئے یہ بات ناگزیر ہے کہ وہ جہاں تک ہو سکے بزرگان پیش رفتہ کے استبداد سے اپنے آپ کو نکالیں اور ایک دن خود جسم کی جھول اتار کر مردہ زندوں پر اپنا راج بٹھائیں دنیا کی ترقی کا راز یہی ہے۔ اور جی نی اَس کی صحیح تعریف اور نشانی یہی ہے کہ وہ مردہ زندوں کا جوا اپنی گردن پر سے اتار پھینکے۔ اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کھڑی کر لے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس نازک آزادی کے پانے کا کوئی طریقہ بھی ہے یا نہیں؟ موجودہ مدارس دنیا بھر میں اس آزادی کی تعلیم اور تربیت کہاں، الٹی یہ بات نہایت زور شور سے سکھاتے ہیں کہ کس طرح ان رفتگان پیشین کا اور غلام اور کنونڈا بننا چاہئے۔ جس ملک کا نظام تعلیمی اس قسم کی ظاہراً پرلطف غلامی زیادہ مضبوطی کے ساتھ سکھائے گا وہ قوم دنیا میں اور قوموں سے زیادہ نکمی اور اَوْر قوموں کی ہر طرح دست نگر ہو جائیگی جن قوموں کا نظام تعلیمی جدت کا کم دشمن ہوگا وہ قومیں یقیناً دنیا کی زیادہ سربرآوردہ اور فرمانروا قومیں بن جائیں گی۔

مُردوں کا راج پھیلانے اور قائم کرنے میں اس مطالعہ نے بہت زیادہ مدد دی ہے جسے تاریخ کہتے ہیں جس نہج اور رنگ سے اس مطالعہ کے متعلق کتابیں لکھی جاتی ہیں اس رنگ نے لوگوں میں یہ بس بھرا رجحان پیدا کر دیا ہے کہ لوگ مستقبل کی طرف پیٹھ کر کے ماضی کے چہرہ پر اپنی آنکھیں گڑا دیتے ہیں۔ اس رجحان کو ـــــ اس غلط اسپرٹ کی ترقی کی دوڑ میں پھسڈی اقوام بہت ذوق شوق سے پالتی پوستی ہیں۔ اور سائینٹی فک مطالعہ سے اس طرح بدکتی ہیں جس طرح بعض گھوڑے اپنے پرچھائیں ہی سے چراغ پا ہو جاتے ہیں۔ آگے بڑھنے والی قومیں اس قسم کے مطالعہ کو ترجیح دیتی ہیں اور تاریخ کو بھی اس رنگ ڈھنگ سے لکھتی پڑھتی ہیں ــ یعنی وہ تاریخ کو بھی اس پہلو سے کارآمد سمجھتی ہیں کہ اگلے وقتوں کے لوگوں نے جس طرح بعد مُردن بھی اپنا اثر قایم کیا ہے اسی طرح یہ بھی جسم کی حوالات سے چھوٹ کر دنیا پر اپنا سکہ

بٹھائیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ جس طرح ماضی کے مختلف عہدوں میں اصحاب جدت نے نئی نئی باتیں پیدا کیں اسی طرح اب بھی جہاں تک ممکن ہو نئی نئی باتیں نکالی جائیں۔ کیونکہ مطالعۂ تاریخ کا صحیح مدعا یہی ہے کہ مردہ زندوں کی جان ڈالنے والی جدتوں کی کامیابیاں تاریخ پیش کرے اور موجودہ مطالعہ کرنے والوں کو جدت پر ابھارے ــــ ان کو یہ دکھائے کہ محض صاحب جسم ہونا اعلیٰ زندگی نہیں ہے انسان کی زندگی کو موت سے بالاتر اور غیر محدود ہونا چاہئے

(باقی)

آہنگِ تپش

(از جناب شیخ عبداللطیف صاحب تپش بی۔اے)

شوقِ وفا نہیں کچھ جز ذوقِ دادخواہی — چشمِ امید کیا ہے؟ نقشِ غلط نگاہی
فرشِ رہِ وفا ہیں اجزائے دیدۂ دل — اے پائے فتنہ در بر کب تک شرپناہی
آغوشِ صد اجل ہے خوابِ سکونِ خاطر — ہر جنبشِ نظر ہے گہوارۂ تباہی
رودادِ تنگئ دل ہے نالۂ خموشی — پروازِ رنگِ رخ ہے آمادۂ گواہی
ہستی بگاڑ دی ہے سازش نے جسم و روح کی — رہبر کو لوٹتا ہے رہزن سے مل کے راہی
جب تک تھی بند چشمِ خوابیدۂ زلیخا — گم کردہ کارواں تھی یوسف کی بیگناہی
خونِ بتاں میں شاید آنے لگی سفیدی — کعبہ کو جا رہی ہے کیوں میری روسیاہی
چھوڑا نہ قیدِ غم نے عمرِ گریز پا کو — سو بار کی اجل نے ہستی سے عذرخواہی

یہ مشتِ خاک اپنی پروردۂ تپش ہے
تردامنی کو میری دریا بنا الٰہی

غزل

(از حضرت جگر مرادآبادی)

نہاں کیے سے کہیں رازِ غم نہاں ہوتا زباں دہن میں نہ ہوتی تو میں زباں ہوتا
یہ سوچتا ہوں ٹھکانہ مرا کہاں ہوتا؟ اگر وہ میری طرح مجھ سے بدگماں ہوتا
تمام شوق کا سرمایہ رائگاں ہوتا مآلِ درد اگر حسن داستاں ہوتا
محال تھا کہ میں آزادِ دو جہاں ہوتا بقیدِ جسم نہ ہوتا بقیدِ جاں ہوتا
ہزار فیصلۂ معنی و بیاں ہوتا زبان دل کبھی بنتی نہ دل زباں ہوتا
بھلا ہوا کہ نظر حیرتوں میں ڈوب گئی کہاں کہاں نہ ترا حسن رائگاں ہوتا
یہ ذوقِ سجدہ کہیں مطمئن نہ رہ سکتا مری جبیں سے جو باہر وہ آستاں ہوتا
مری فنا ہے فنائے نمودِ بیتابی محال تھا میں نہ ہوتا یہ کل جہاں ہوتا
کہاں فراغ تلون مزاجیوں سے تری؟ یہ دردِ ہجر ہی اے کاش جاوداں ہوتا
تمام اُٹھ گئے پردے تو اس سے کیا حاصل؟ مزا تو جب تھا کہ میں بھی نہ درمیاں ہوتا
وہ حالِ دل لبِ خاموش سے بھی سنتے ہیں یہ جانتا تو نہ شرمندۂ فغاں ہوتا
نثار ہو گئے اک جلوۂ تبسم پر کہاں نصیب یہ وقتِ وداعِ جاں ہوتا
یہ سب نمود و نمائش ہے تیرے چھپنے سے جو تو نہ پردہ میں ہوتا تو میں کہاں ہوتا
کہاں میں اور کہاں اب فسانۂ غمِ عشق وہ التفات نہ کرتے تو کچھ بیاں ہوتا
صفاتِ عشق کی تکمیل بھی ضروری تھی جبیں پہ سجدۂ بت کا بھی اک نشاں ہوتا

بہار، توبہ شکن، چشمِ مستِ یار، مصر
میں آج پی جو نہ لیتا وہ بدگماں ہوتا

بڑے بابو

(از مسٹر پریم چند بی۔ اے)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۲)

اس شعلہ انگیز ظرافت نے جسم میں شعلے پیدا کر دیئے۔ آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے تحمل کی برودت مائل تبخیر ہوگئی۔ مگر قہر درویش برجانِ درویش کے مصداق سر جھکا کر کھڑا رہا۔ جتنی دلیلیں ذہن میں کئی دنوں سے ریزہ ریزہ کر کے رکھی تھیں صرفِ اظہار ہوگئیں بہت سوچنے پر بھی کوئی نیا پہلو ذہن میں نہ آیا۔ یوں خدا کے فضل سے غبی یا کند ذہن نہیں ہوں۔ فکرِ رسا پائی ہے اتنی فکر سے کوئی اچھی سی غزل ہو جاتی پر طبیعت ہی تو ہے نہ لڑی۔ اتفاق سے جیب میں ہاتھ ڈالا تو معًا یاد آ گیا کہ سفارشی خطوط کا ایک دفتر بھی ساتھ لایا ہوں رعب کا اوسان پر کیا اثر پڑتا ہے اس کا آج تجربہ ہو گیا۔ امید کی شگفتگی چہرہ پر نمودار ہوگئی۔ خطوط کا پلندا ہاتھ میں لیکر بولا "حضور یہ چند خطوط ہیں انہیں ملاحظہ فرمالیں۔

بڑے بابو نے بنڈل لیکر میز پر رکھدیا اور اُن پر ایک غلط انداز نظر ڈال کر بولے۔ آپ نے اب تک ان جواہر ریزوں کو کیوں چھپا رکھا تھا؟

میرے دل میں مسرت امید کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گویائی نے عود کیا۔ امنگ سے بولا "حضور کے جاہ و جلال نے اتنا مرعوب اور مسحور کر دیا کہ مجھے ان خطوط کی یاد ہی نہ رہی۔ حضور سے بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ میں نے اُن کے لئے کسی قسم کی سعی و سفارش نہیں بہم پہنچائی۔ کسی قسم کی جستجو نہیں کی۔

بڑے بابو نے مسکرا کر فرمایا۔ اگر آپ ان کیلئے سعی وطلب کی انتہائی قوتیں صرف کرتے تو بھی میں آپکو متہم نہ کرتا۔ آپ بیشک بڑے خوش نصیب ہیں کہ ایسا نایاب جنس آپ کو بے مانگے مل گئی۔ آپ زندگی کے سفر کا پاس پورٹ سمجھئے۔ واہ! آپ کو خدا کے فضل سے ایک سے ایک قدردان نصیب ہوئے۔ آپ ذہین ہیں راستباز ہیں، بے لوث ہیں۔ اطاعت شعار ہیں، افوہ! آپ کے اوصاف کی تو کوئی انتہا ہی نہیں قسم خدا کی آپ جامع کمالات صوری و معنوی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ میں فراست، متانت، دیانت، صیانت، اصابت، نجابت، شرافت، جسارت سبھی انسانی اور ملکوتی صفات موجود ہیں۔ آپ تو نمائش میں رکھے جانے

کے قابل معلوم ہوتے ہیں کہ دنیا نگاہ حسرت سے دیکھے اور دانتوں میں انگلی دبائے۔ آج کسی بھلے کا منہ دیکھکر اٹھا تھا کہ آپ جیسے پاکیزہ منش شخص سے شرف نیاز حاصل ہُوا۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو زندگی کے ہر ایک شعبہ میں آپ کو نام ونمود کے مدارج تک پہنچا سکتے ہیں۔ سرکار کی ملازمت آپ جیسے باکمال اصحاب کے شایان شان نہیں۔ آپ کو یہ کب گوارا ہوگا اس دائرہ میں آتے ہی انسان حیوان مطلق بن جاتا ہے۔ بولئے آپ اسے منظور کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ جناب ذرا ان الفاظ کی توضیح فرمائیں۔ انسان کے حیوان مطلق بننے سے آپ کا کیا منشا ہے؟

بڑے بابو نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ یہ تو کوئی ایسا پیچیدہ توضیح طلب امر نہ تھا۔ جب تو مجھے اپنے حسن ظن میں کچھ ترمیم کرنی پڑیگی۔ اس دائرہ کے عبودیت کیشوں کے لئے سب سے ضروری اور لازمی صفت فراست ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ لفظ میرے خیال پر قادر ہے یا نہیں۔ اس کا انگریزی مترادف ہے انپیرشن، کنایہ کے اصلی مفہوم کو سمجھنا۔ مثلاً اگر سرکار بہادر یعنی حاکم ضلع کو شکایت ہو کہ آپ کے علاقہ میں انکم ٹیکس کم وصول ہوتا ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اس میں اندھا دھند اضافہ کریں۔ کی آمدنی کی پرواہ نہ کریں۔ آمدنی کا بڑھانا آپ کی معاملہ فہمی پر منحصر ہے۔ ایک خفیف سی دھمکی کام کر جائے گی اور انکم ٹیکس دوچند سہ چند ہو جائیگا۔ یقیناً آپ کو یہ ضمیر فروشی گوارا نہ ہوگی۔

میں نے سمجھ لیا کہ میرا امتحان ہو رہا ہے عاشقانہ سرگرمی سے بولا۔ میں تو اسے ضمیر فروشی نہیں سمجھتا یہ تو حق نمک ہے۔ میرا ضمیر اس درجہ نازک نہیں ہے

بڑے بابو نے میری طرف قدردانہ نگاہ سے دیکھکر فرمایا۔ شاباش! مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی امید تھی آپ مجھے ہونہار معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن شاید یہ دوسری شرط آپ کو منظور نہ ہو۔ اس دائرہ کے مریدوں کیلئے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اپنے کو بھول جائیں کچھ آیا ذہن شریف میں؟

میں نے دبی زبان سے کہا، جناب کو تکلیف تو ہوگی مگر ذرا پھر اس کی توضیح فرما دیجئے۔

بڑے بابو نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا جناب یہ بار بار کی توضیح مجھے بری معلوم ہوتی ہے۔ میں اس سے زیادہ آسان طریقہ پر اپنے خیال کا اظہار نہیں سکتا۔ اپنے کو بھول جانا بہت ہی عام محاورہ ہے اپنی خودی کو مٹا دینا اپنی شخصیت کو فنا کر دینا، اپنی پرسونائٹی کو زائل کر دینا آپ کی وضع قطع سے، آپ کے خطاب وکلام سے، آپ کے انداز واطوار سے آپ کی ہندیت کی تکذیب ہو جانی چاہئے۔ آپ کے مذہبی اخلاقی اور تمدنی اثرات کا یک قلم محو ہو جانا ضروری ہے مجھے آپکے

کے بشرہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس توضیح پر بھی آپ میرا مفہوم سمجھنے میں قاصر ہیں۔ سنئے آپ غالباً مسلمان ہیں، شاید آپ راسخ العقیدۃ بھی ہوں۔ آپ نماز اور روزے کے پابند ہیں؟

میں نے انداز تفاخر سے کہا، جناب میں اتنا ہی راسخ العمل ہوں جتنا کوئی مولوی ہو سکتا ہے۔ میری کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ الا اس وقت جب میں بستر علالت پر تھا۔

بڑے بابو نے مسکرا کر کہا یہ آپکے پسندیدہ اخلاق ہی کہے دیتے ہیں مگر اس دائرہ میں آکر آپ کو اپنے عقیدہ او عمل میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کرنی پڑے گی۔ یہاں آپکا مذہب مذہبیت کا جامہ اختیار کریگا۔ آپ بھول کر بھی اپنی پیشانی کو منت کش سجدہ نہ بنائیں۔ کوئی مضایقہ نہیں آپ بھول کر بھی زکوۃ سے اپنے کو ملوث نہ بنائیں۔ کوئی مضایقہ نہیں۔ لیکن آپ کو اپنے مذہب کے نام پر فریاد کرنے کیلئے ہمیشہ پیش پیش رہنا اور دوسروں کو آمادہ کرنا ہوگا۔ اگر آپکے ضلع میں دو ڈپٹی کلکٹر ہندو ہیں اور مسلمان صرف ایک تو آپ کا فرض ہوگا کہ ہز اکسلنسی گورنر کی خدمت میں ایک وفد بھیجنے کیلئے روسا، قوم کو آمادہ کریں اگر آپ کو معلوم ہو کہ کسی میونسپلٹی نے قصابوں کو شہر سے باہر دوکان رکھنے کی تجویز پاس کر دی ہے تو آپ کا فرض ہوگا کہ زعیمان قوم کو اس میونسپلٹی کی سرزنش کرنے کیلئے تحریک کریں۔ آپ کو سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے قومی فدائیت کا راگ الاپنا چاہئے۔ مثلاً امتحان کے نتائج میں اگر آپ کو مسلمان طلبا کی تعداد مناسب سے کم نظر آئے تو آپ کو فوراً چانسلر کے پاس ایک گمنام خط لکھ بھیجنا ہوگا کہ اس معاملہ میں ضرور ہی سختی سے کام لیا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں اسی انیٹرشن والی شرط کے ضمن میں آجاتی ہیں۔ آپ کو صراحتہً یا کنایتہً یہ لائحہ عمل قایم کرنے کے لئے ہدایت نہ کی جائیگی۔ سب کچھ آپ کی فراست پر مبنی ہوگا اور آپ نے اس جوہر سے بہرہ دانی پایا ہے تو آپ ایک دن ضرور منصب اعلیٰ پر پہنچیں گے۔ آپ کو حتی الامکان انگریزی میں تحریر و تقریر کرنی ہوگی۔ اس کے بغیر حکام آپ سے خوش نہ ہونگے۔ لیکن قومی زبان کی حمایت اور اشاعت کی صدا آپ کی زبان سے پیہم نکلتی رہنا چاہئے آپ شوق سے اخبارات کا چندہ ہضم کریں۔ مستعار کتابیں پڑھیں۔ چاہے واپسی کے وقت کتاب کی قلب ہیئت کے باعث آپ کو معذرت ہی کیوں نہ کرنی پڑے لیکن زبان کی حمایت بانگ دہل سے کرتے رہئے۔ خلاصہ یہ کہ آپ کو جس کا کھانا اسی کا گانا ہوگا۔ آپ کے قول سے فعل سے، اور دل سے اپنے آقا کے فلاح اور استحکام میں منہمک ہونا پڑے گا۔ اگر آپ یہ خیال کرتے ہوں کہ آقا کی خدمت کے ذریعہ قوم کی خدمت بھی کروں گا تو یہ خیال خام ہے۔ سودا ہے، جنون ہے، حماقت ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہونگے۔ فرمائیے آپ اس حد تک اپنے کو بھول سکتے ہیں۔

مجھے جواب دینے میں ذرا تامل ہوا۔ حق یہ ہے کہ میں بھی آدمی ہوں اور بیسویں صدی کا آدمی ہوں میں بیدار نہ سہی مگر بالکل غافل بھی نہیں ہوں میں بھی اپنے ملک اور قوم کو بام عروج پر دیکھنے کا متمنی ہوں میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مذہب دنیا میں صرف ایک ہے اور اس کا نام ہے درد۔ مذہب کی موجودہ صورت دھڑے بندی کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ختنہ یا چوٹی سے کسی کی ماہیت نہیں تبدیل ہو سکتی۔ پرستش کے لئے کلیسا مسجد، مندر کی میں بالکل ضرورت نہیں سمجھتا۔ ہاں نفسانیت اور انانیت کو دبائے رکھنے کے لئے کسی عمل کی ضرورت تسلیم کرتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ اس سے مجھے جنت ملے گی یا میری مکتی ہوگی۔ بلکہ صرف اس لئے کہ مجھے دوسروں کے حقوق غصب کرنے سے اکراہ ہوگا مجھ میں خودی کا خاصہ عنصر موجود ہے۔ یوں اپنی رضا و رغبت سے کہئے آپ کی جوتیاں سیدھی کروں لیکن حکومت کی برداشت نہیں۔ محکوم بننا شرمناک، حقارت انگیز سمجھتا ہوں، کسی غریب کو ظلم کا شکار ہوتے دیکھکر میرے خون میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی سے دبکر رہنے سے مرجانا بہتر سمجھتا ہوں۔ لیکن خیال حالات پر تو فتح نہیں پا سکتا۔ معاش کی فکر تو مقدم ہے۔ اتنے دنوں کے بعد بڑے بابو کی نگاہ کرم کو اپنی جانب ملتفت دیکھ کر بجز سر تسلیم خم کرنے کے اور چارہ ہی کیا تھا۔ بولا جناب میری جانب سے مطمئن رہیں۔ آقا کی خدمتگذاری میں میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرونگا۔

"غیرت کو فنا کر دینا ہوگا"

"منظور"

"شرافت جذبات کو بالائے طاق رکھنا پڑیگا"

"منظور"

"مخبری کرنی پڑے گی"

"منظور"

تو بسم اللہ کل سے آپ کا نام امیدواروں کی فہرست میں لکھ لیا جائیگا۔

میں نے سوچا تھا کل سے کوئی جگہ مل جائے گی۔ اتنی ذلت قبول کرنے کے بعد معاش کے فکر سے تو آزادی نصیب ہوگی۔ اب یہ حقیقت کھلی، بے اختیار منہ سے نکلا اور جگہ کب تک ملے گی؟

بڑے بابو ہنسے وہی دلخراش ہنسی جس میں ذم کا پہلو غالب تھا، جناب میں عالم الغیب نہیں روشن ضمیر نہیں، بہتر ہو اس سوال کا جواب آپ کسی اولیا سے پوچھیں۔ دستر خوان بچھا دینا میرا کام ہے کھانا آیگا تو وہ آپکے حلق میں جائیگا۔ پیشین گوئی میں نہیں کر سکتا میں نے مایوسانہ انداز سے کہا میں تو اس سے بڑی عنایت کا منتظر تھا۔ بڑے بابو کرسی سے اٹھ کر بولے قسم خدا کی آپ پرلے درجہ کے کوڑھ مغز آدمی ہیں بالکل خشک دماغ، دستر خوان کا سامنے آجانا آپ کوئی چھوٹی بات سمجھتے ہیں۔ لطف انتظار آپ کی نگاہ میں کوئی چیز نہیں!

حالانکہ انتظار میں انسان عمریں گذار سکتا ہے۔ آپ روزانہ کچہری میں آئیں گے۔ غرضمندوں سے آپ کا سابقہ ہوگا عمال سے آپ روشناس ہو جائیں گے۔ معاملے بٹھانے سودے پٹانے کے زریں موقع آپ کے ہاتھ آئیں گے حکام کے لڑکے پڑھائیے۔ اگر گنڈے تعویذ کا فن سیکھ لیجئے تو آپ کے حق میں بہت مفید ہو۔ کچھ طبی معلومات بھی بہم پہنچائیے۔ اچھے ہوشیار زرگروں سے یارانہ پیدا کیجئے کیونکہ آپ کو اب ان سے اکثر سابقہ پڑیگا۔ حکام کی مستورات آپ ہی کی معرفت اپنی نسوانی فرمایشیں پوری کرائینگی مگر ان سب ٹٹکوں سے بڑھ کر ایک اور لٹکا ہے اگر وہ ہنر آپ میں ہے تو یقیناً آپ کے انتظار کی مدت میں بہت کچھ تخفیف ہو سکتی ہے۔ آپ حکام عالی مقام کیلئے سامان تفریح مہیا کر سکتے ہیں؟

بڑے بابو میری طرف کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرائے سامانِ تفریح سے اُن کی کیا مراد ہے یہ میں نہ سمجھ سکا مگر پوچھتے ہوئے بھی خوف ہوتا تھا کہ کہیں بڑے بابو بگڑ نہ جائیں اور پھر معاملہ خراب ہو جائے۔ ایک اضطراب کی حالت میں زمین کی طرف تاکنے لگا۔

بڑے بابو تاڑ تو گئے کہ اسکی سمجھ میں میری بات نہ آئی لیکن اب کی وہ چیں بہ جبیں نہ ہوئے۔ نہیں ان کے لہجہ میں ہمدردی کی جھلک تھی۔ فرمایا یہ تو غیر ممکن ہے کہ آپ نے بازار حسن کی سیر نہ کی ہو۔

میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ نہیں حضور بندہ اس کوچہ سے نا آشنا ہے۔

بڑے بابو۔ تو اب آپ کو اس کوچہ کی خاک چھاننی پڑیگی حکام بھی باصرہ اور سامعہ رکھتے ہیں۔ یہ آپ جانتے ہی ہیں دن بھر کی دماغی تکان کے بعد فطرتاً شب کو ان کی طبیعت تفریح کی جانب مائل ہوتی ہے اگر آپ اُنکے لئے حسن باصرہ فروز اور نغمہ سامعہ نواز کا انتظام سستے داموں کر سکتے ہیں یا کر سکیں تو ....

میں نے کسی قدر تیز ہو کر کہا آپ کا منشا یہ ہے کہ مجھے پروکیور بننا پڑیگا۔

"تو آپ تیز کیوں ہوتے ہیں۔ اگر اب تک اتنی موٹی سی بات آپ نہیں سمجھے تو یہ میرا قصور ہے یا آپکی کوتاہ فہمی کا؟

میرے جسم میں آگ لگ گئی۔ جی میں آیا کہ بڑے بابو کو بھی جٹسو کے دوچار ہاتھ دکھاؤں۔ مگر گھر کی بے سر و سامانی کا خیال آگیا بیوی کی منتظر آنکھیں اور بچوں کی گرسنہ صورتیں یاد آگئیں۔ ذلت کا ایک دریا حلق کے نیچے ڈھکیلتے ہوئے بولا۔ جی نہیں میں تیز نہیں ہوا تھا۔ ایسی بے ادبی مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) ضرورت نے میری غیرت کو فنا کر دیا ہے۔ آپ میرا نام امیدواروں میں درج کر دیں۔ حالات مجھ سے جو کچھ کرائیں گے وہ سب کروں گا۔ اور تا دم آخر آپ کا ممنون رہوں گا۔

نوائے یاس

(از جناب مولینا مولوی محمد شرف الدین صاحب یاسؔ ٹونکی)

تڑپ دل کی ہے، یا زخمِ جگر ہے
یہ جو کچھ ہے ترا فیضِ نظر ہے

مجھے اقرارِ قدرِ خیر و شر ہے
پھر الزامِ گنہ بھی میرے سر ہے

بہارِ صنع ہر سو جلوہ گر ہے
چمن ہر ذرہ گلچیں ہر نظر ہے

گلہ شکوہ نہیں دام و قفس کا
مآلِ آرزو بے بال و پر ہے

دلِ ایذا طلب پر رحم کھایا
سراپا درد وہ بیدادگر ہے

ترا پردہ ہے شاید ظلمتِ شب
ترا جلوہ مگر نورِ سحر ہے

اُسے کرتی ہے حالِ دل سے آگاہ
مری آہِ رسا پیغامبر ہے

نظر ہے دم بدم دل کی طرف کیوں
سمجھتا ہوں جو کچھ مدِ نظر ہے

گنہ سے پاک کرتی ہے ندامت
علاجِ دامنِ تر چشمِ تر ہے

مری آہِ سحر کے ڈر سے خورشید
چراغِ زیرِ دامانِ سحر ہے

سنو گے حشر میں تو حشر ہوگا
یہیں سُن لو تو قصہ مختصر ہے

تپش سے دل کی ہے ہنگامۂ عمر
چراغ اس بزم کا داغِ جگر ہے

شبِ غم جان روزِ زندگی کو
یقینِ وعدۂ فردا اگر ہے

منانا حشر کے دن عیدِ دیدار
کہ وہ اس شامِ فرقت کی سحر ہے

کنارہ کر بتوں سے اب تو اے یاسؔ
وفا کم بخت کس امید پر ہے

خدا

(اٹلی کے مشہور بطل حریت جوزف میزینی کی تصنیف فرائض انسان (Duties of man) سے)

مترجمہ

(جناب صاحبزادہ احمد سعید خاں صاحب شوق ٹونکی (علیگ) جائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "ہمدرد" (دہلی)

صاحبزادہ صاحب کا یہ دلچسپ ترجمہ پچھلی اشاعت سے شروع ہوا ہے اور شاید چھ مہینے تک مسلسل شایع ہوتا رہیگا — خدا کے باب میں میزینی کے خیالات، اسکے وظائف غور و فکر کے اہم ترین نتائج کا آئینہ ہیں اور اُن لوگوں کے لئے جو دہریت و لامذہبیت میں ہم، یورپی عقاید کے فریب خوردہ ہیں بہت کچھ مایۂ دلچسپی ثابت ہو سکتے ہیں — یہ معتقداتی وبا کچھ مغربی افکار ہی کی منت کش نہیں بلکہ اکثر ایسی انسانی زندگیوں میں جو عقلیات سے رسیاں تڑاتی رہتی ہیں، کبھی نہ کبھی ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب وہ خدا پرستی کی صحیح شاہراہ سے بھٹک کر، ایک کشاکش انکار و اقرار اور کشمکش ریب و یقین کی بھول بھلیوں میں پھنس جاتی ہیں، اور کسی خضر حقیقت کی عدم رہبری انہیں ہمیشہ کیلئے مذہب و خدا پرستی کی تلخ ترین لعنتوں کی آماجگاہ بنا دیتی ہے — یہ موضوع جو ذراسی لغزش فکر کے ساتھ بربادی عقاید کا سامان ہو سکتا ہے۔ ایک طویل فرصت کا طلبگار رہے — علاوہ برایں "پرانے زخم" کو تازہ کرنا گوارا نہیں، اسلئے "خموشی" کو وسیلۂ نجات سمجھنا "سلامتی افکار" کے حق میں مناسب ہوگا — رہا ترجمہ سو اسکے لئے دنیائے صحافت کے عالی وقار اور بلند پایہ سیاح صاحبزادہ احمد سعید خانصاحب شوق (علیگ) کا نام نامی ایک سنہری ضمانت ہے اور ہمارا "ان" اپنے معاصرین کی اس رائے کا ہمنوا ہے کہ ہمارے محترم صاحبزادہ صاحب ملک کے تین چار اول درجہ کے ترجمہ پرداز وں میں سے ایک ہیں — !

آخر میں ہم معذرت خواہ ہیں کہ ہماری عدم موجودگی کے باعث پچھلے پرچہ میں جو بہت سی غلطیاں رہ گئیں اُن میں زیادہ خطرناک غلطی "میزینی" کا "طالستائی" بن جانا تھا جس کی امید ہے ناظرین تصحیح فرمائیں گے — !

مذہب اور سیاست کو خلط ملط نہ کرو، مذہبی عقائد اور سماوی امور میں تو کسی مسلمہ مذہبی امارت کے ماتحت رہو۔ البتہ جس بات کے متعلق تمہارا ضمیر فیصلہ کرے کہ یہ مذہب کے حقیقی مقصد کے مخالف ہے تو اسکو نہ مانو اور ضمیر کی یہ آزادی ضرور [illegible] رکھو۔ دنیوی امور [illegible] اشتراک و اتحاد سے کام کرنا چاہئے [illegible] یا روحانیت کے ماننے والے ہو تمہارا [illegible] انسانی مساوات و آزادی کو تو ضرور [illegible]

کی عافیت اور خوش حالی کے طالب ہو گئے؟ اور عام حق انتخاب بھی چاہتے ہو گئے؟ تو پھر ان خواہشات کے حصول کے لئے متحد ہو جاؤ اس اتحاد کے لئے ضروری نہیں کہ تم سب مذہبی عقاید میں بھی متحد ہو! دوسری طرف تمہیں ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جو کہیں گے کہ:-

خدا موجود تو ضرور ہے لیکن اسکو سمجھنا یا اس تک رسائی حاصل کرنا انسانی فہم، ادراک اور طاقت سے باہر ہے - دنیا گذشتنی اور گذاشتنی ہے اور یہ دنیوی زندگی نتائج قلیل اور گھڑی پل کا بسیرا ہے - کوشش کرو کہ دنیوی تعلقات کی زنجیریں زیادہ بوجھل نہ ہوں - [illegible] ہستی اور زندگی کو بس اتنا ہی سمجھو جتنا کہ وہ در حقیقت سمجھنے کے لائق ہیں - عقبیٰ کی غیر فانی زندگی کی مسرتوں کے مقابلہ میں اس دنیا کی تمام زندگی کی لذتیں ہیچ ہیں - اس ہی حقیقت کو سمجھ لو - اور خدا پر نظر رکھو - دنیا کی یہ فانی زندگی رو کر یا ہنس کر، رنج میں یا راحت میں تکلیف یا آرام سے غرض کسی نہ کسی حالت میں بسر ہی ہو گی [illegible] کے متعلق زیادہ متردد نہ ہو - اور جس طرح ہو صبر [illegible] لیکن یاد رکھو کہ کل نفس ذائقۃ [illegible] سے انکار نہیں کر سکتے - مرنا ضروری [illegible] میں حاضر ہونا ہے جہاں تمہارے اعمال [illegible] والا ہے کہ تم اس دنیا میں خدا اور خدا کے لئے کیا [illegible] ہے - مصیبتوں سے گھبراتے [illegible] مصیبتوں پر تو خدا کا شکر کرو دنیا کی مصیبتیں منجانب اللہ ہیں انمیں برکت کا پیام اور راحت کی خوشخبری مضمر ہے یہ مصائب کا زمانہ تو خدا تعالیٰ کیطرف سے انسان کی ایک آزمایش ہے اور یہ زمین بھی خدا کی ہے تمہاری نہیں ہے - یہاں سے تم جلاوطن کئے جاؤ گے - اس لئے فانی کو نہ عزیز رکھو نہ اپنی سمجھو - بلکہ اپنے خیالات میں بلندی پیدا کرو اور اعلیٰ مدارج حاصل کرنے کی کوشش کرو - مصائب کے ہجوم، افلاس و ناداری کی زنجیروں اور غلامی کے طوق میں رہنے کے باوجود تم عبادت دعا، ترک لذات، جزا اور قرب الٰہی حاصل کر سکتے ہو تم یقین رکھو کہ تمہارے اعمال حسنہ کا بہترین انعام ملنے والا ہے ......

انسانوں کی یہ دو جماعتیں ہیں - پہلی جماعت تو خدا دوست نہیں ہے - اور دوسری جماعت خدا شناس نہیں ہے -

پہلی جماعت سے کہو کہ انسان تو ایک ہی ہے تم اسکو دو حصوں میں تقسیم نہیں کر سکتے - لوگوں میں انسانی اصل انسانی مقدرات اور دنیوی زندگی کے عام قوانین کے متعلق بھی اختلاف ہے لیکن کوشش کرو کہ محاسن انسانی کی ترتیب و تنظیم کے اصول میں لوگ تمہارے ہمخیال ہو جائیں

دنیا میں آج مذاہب کی حکومت ہے - جب ہندوستانیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ بعض تو ان میں سے برہم کے سر سے پیدا ہوئے ہیں بعض بازوؤں سے اور بعض پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں - انہوں نے انسانوں کو مختلف

ذاتوں میں تقسیم کر کے مجلسی نظام مرتب کیا چنانچہ جو لوگ سر سے پیدا ہوئے تھے وہ عالم ہوئے جو بازوؤں سے پیدا ہوئے تھے وہ سپاہی بنے۔ اور جو پاؤں سے پیدا ہوئے تھے وہ خدمت و محنت کے لئے مخصوص سمجھے گئے اس سکون پذیر حالت اور تقسیم کو گو وہ اب اچھا نہ سمجھتے ہوں لیکن جب تک اصول مذکورہ پر عقاید کا انحصار رہیگا یہ حالت باقی رہے گی۔

جب عیسائیوں نے دنیا میں اپنے عقاید کا اعلان کیا کہ تمام انسان خدا کے بیٹے ہیں اور اس طرح انسانوں کی برادری ایک ہی ہے تو دنیا نوی فلسفیوں اور فقیہوں کے اصول بالکل کالعدم نہ ہو گئے تھے ان اصول کے مطابق انسان کی فطرت دو قسم کی سمجھی گئی تھی اس اعلان غلامی کے عقیدہ پر یکسر خط نسخ نہیں کھینچ دیا اس میں شک نہیں کہ انسانی مجلس میں ایک بالکل جدا اور جدید نظام قایم ہو گیا۔ مذہبی عقیدہ کی ترقی کی منزل کے ساتھ ساتھ انسانیت کی تاریخ میں معاشری ترقی بھی ہوتی رہی۔ لیکن مذہبی معاملات میں تمہارے تساہل پسندی اور تغافل شعاری کے اصول سے تم تاراج (تاراج) کے سوا اور کوئی نتیجہ پیش نہیں کر سکتے تم تخریب کرتے رہے۔ تعمیر کی توفیق کبھی نصیب نہ ہوئی۔ اگر تم اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہو تو کرو!

(باقی)

ترانۂ فراموشی

(از مسٹر چند و لعل اختر دہلوی بی اے)

خود پرست ایسے ہوئے عشق خدا بھول گئے
یادِ حق بھول گئے، راہِ صفا بھول گئے

جب عالم نے وہ پھونکا ہے دلوں میں افسوں
زندہ در گور ہیں اور فکرِ قضا بھول گئے

دو گھڑی کے لئے ہی تیری بہار آرائی
گل سے کہنا یہ ہم اے بادِ صبا بھول گئے

دیتے تھے نسخے جو اوروں کو معالج بن کر
خود جو بیمار ہوئے اپنی دوا بھول گئے

جب سے مستِ مئے توحید ہوا دل اپنا
تجھکو اے حبِ جہاں ہم بخدا بھول گئے

عیش و عشرت میں اٹھایا تھا جو دولت کھو کر
زحمتِ فاقہ کشی میں وہ مزا بھول گئے

پھر اسی شوخ پہ مرتے ہیں جناب اختر
آنکھ ملتے ہی وہ سب اگلی جفا بھول گئے

ناکردہ گناہ

ایک فرنچ افسانہ کا ترجمہ

(مترجمہ جناب سید عبدالمغنی صاحب دہلوی بی اے (آنرز))

لوبین کے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں داخل ہو کر میں نے گھنٹہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ پیرس ایکسپریس کے لئے مجھے دو گھنٹے دس منٹ انتظار کرنا ہوگا الانتظار اشد من الموت مشہور ہے چنانچہ میرے لئے یہ وقفہ نہایت تکلیف دہ اور کٹھن ہوگیا میں نے محسوس کیا گویا میں تھک کر چور چور ہوگیا ہوں اور کوسوں کی منزل طے کرتا آیا ہوں میں نے اپنے اردگرد دیواروں پر نظر دوڑائی کہ شاید ان پر ہی کوئی ایسی جاذب چیز نکلے جو وقت کٹنے کا سامان ہو تو ذرا دل بہلے۔ تھوڑی دیر بعد میں باہر نکلا اور اسٹیشن کے دروازے پر کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ یہ یہ وقت کس طرح گزاروں۔

بازار میں دورویہ سرو کے درخت ایستادہ تھے مکانات یکساں بلند نہ تھے بلکہ ایک دلفریب عنائی و بدنظمی کیساتھ چھوٹے بڑے مکان برابر برابر کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ سامنے ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی اور بازار کے خاتمہ پر بلند درختوں کا ایک خوشنما جھنڈ تھا گویا یہ دورویہ پارک وہاں ختم ہوا تھا۔ بازار سنسان پڑا تھا کبھی کبھی کوئی بلی سڑک پر سے گزر جاتی تھی یا کتے کا پلا خوراک کی تلاش میں درختوں کی جڑوں کو سونگھتا دکھائی دیتا۔ لیکن حضرت آدم اور حوا کی اولاد کا وہاں عدم وجود برابر معلوم ہوتا تھا۔ مجھے یہاں بھی کوئی دلچسپ مشغلہ ہاتھ آنے میں مایوسی ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ ایسی خاموش جگہ دل بہلانے کا کیا خاک سامان میسر آسکتا ہے۔ اور میں اسی خیال میں تھا کہ مجھے یہ دو گھنٹے مسافرخانہ میں ہی گزارنے پڑیں گے کہ یکایک سامنے گلی میں سے ایک جنازہ نکل کر میری طرف آتا دکھائی دیا۔ میرے دل کو ذرا تسکین ہوئی کہ کم از کم دس منٹ تو جلوس دیکھنے میں گزر ہی جائینگے۔

لیکن یکایک میری تمام توجہ اس کی طرف منعطف ہوگئی۔ میت کے پیچھے صرف سات آدمی تھے جن میں سے ایک زار و قطار رو رہا تھا اور باقی سب آپس میں بات چیت کرتے جاتے تھے ایک سب سے عجیب بات تھی کہ جنازہ کے ہمراہ کوئی اسقف یا پادری نہ تھا میں نے خیال کیا کہ جیسے اب پادریوں سے عقد نکاح بند ہونے کی جگہ محض نام درج رجسٹر کرا لینے سے قانونی شادی مکمل ہوجانے کا عام رواج ہوگیا ہے اسی طرح شاید اس

میت کی تجہیز و تکفین مذہبی نہیں بلکہ "قانونی" ہوگی اور اسی لئے پادری کے ساتھ لانے کی ضرورت نہ ہوئی ہوگی۔ بیکاری کے سبب جذبۂ تجسس و راز جوئی نے میرے دلمیں طرح طرح کے گمان پیدا کئے اور جب جنازہ میرے برابر سے گزرا تو میرے دل میں بھی ان سات ہمراہیوں کے ساتھ ساتھ قبرستان جانے کا شوق پیدا ہوگیا۔ کیونکہ اس طرح کم از کم ایک گھنٹے کے لئے مجھے ایک اچھا مشغلہ ہاتھ آئے گا۔ سب سے پیچھے کے دو آدمیوں نے مڑکر مجھے دیکھا اور آپس میں کچھ سرگوشیاں کرنے لگے۔ یقیناً وہ اس تشویش میں تھے کہ میں اس شہر کا باشندہ ہوں یا کوئی اجنبی نووارد۔ انہوں نے اپنے دونوں ہمراہیوں سے دریافت کیا اور وہ دونوں بھی میری طرف غور سے دیکھنے لگے۔ مجھے اس بیجا تجسس سے بہت تکلیف ہوئی اور ان سب کی تلاش و جستجو کا خاتمہ کرنے کے خیال سے میں خود ہی آگے بڑھا اور سلام دعا کے بعد یوں گویا ہوا کہ

"حضرت مجھے معاف کیجیے گا اگر میں آپکی گفتگو میں مخل ہوا مگر ایک ایسا جنازہ دیکھ کر جس کے ہمراہ پادری موجود نہیں میرے دل میں بھی ساتھ جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور میں آپکے ساتھ چل رہا ہوں حالانکہ اس میت سے ایسا ہی ناواقف ہوں جیسا کہ آپ حضرات سے"

ان میں سے ایک بولا "یہ جنازہ ایک خاتون کا ہے" میں نے متعجب ہوکر پوچھا "لیکن یہ مذہبی کی بجائے قانونی تجہیز و تکفین کیسی؟" اس پہلے شخص نے جواب دیا جو مجھ سے گفتگو کرنے میں شاید دلچسپی لے رہا تھا۔ کہ جناب پادری صاحب نے میت کو گرجا میں داخل ہونے یا اسکے احاطہ میں دفن کئے جانے کی اجازت دینے سے صاف انکار کردیا ہے بھلا وہ اس کے ساتھ آنا تو کیسے گوارا کرسکتے تھے"

میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس معاملہ کے متعلق میں بالکل تاریکی میں تھا لیکن میرے محسن ساتھی نے چپکے سے کہا "اجی صاحب یہ تو خاصہ اچھا افسانہ ہے۔ اس نوجوان خاتون نے خودکشی کرلی۔ اس وجہ سے مذہبی رسوم ادا نہیں ہوسکتیں۔ وہ شخص جو سب سے آگے آگے اس قدر پریشان حال اور غم سے نڈھال پیچھے پیچھے جارہا ہے وہ مرحومہ کا غم نصیب خانماں برباد شوہر ہے"

میں نے ذرا تذبذب سے کہا "آپ نے مجھے بہت متحیر کردیا۔ اور مجھے اس قصہ میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ کیا میں آپ سے استدعا کرسکتا ہوں کہ مجھے بھی مفصل واقعہ سے خبردار کریں گے۔ اگر میری یہ درخواست کسی وجہ سے نامناسب معلوم ہو تو مہربانی سے میرے الفاظ کا برا نہ مانیں۔ اور یہ تصور کریں کہ گویا میں نے آپ سے کچھ کہا ہی نہیں تھا" اس نے نہایت بے تکلفی سے میری بغل میں ہاتھ ڈال کر کہنا شروع کیا "مجھے اس میں مطلق عذر نہیں ذرا آہستہ آہستہ قدم اٹھایئے تاکہ ہم سب سے پیچھے ہی چلتے رہیں اور میں سارا قصہ بآسانی آپکے گوش گذار کردوں

بڑا دردناک واقعہ ہے اور نہایت حسرتناک اور عبرت خیز داستان، قبرستان پہنچنے تک ہمیں بہت کافی وقت ملے گا۔ دیکھئے وہ سڑک کے خاتمہ پر جو درخت نظر آرہے ہیں وہی قبرستان ہے۔

یہ نوجوان خاتون میدام پال ہمیٹ اس علاقہ کے ایک نہایت دولتمند سوداگر فونٹینل کی بیٹی تھی، جب وہ بالکل معصوم اور بچہ تھی — غالباً اس کی عمر اس وقت گیارہ سال کی ہوگی تو ایک تیرہ بخت ملازم نے اس فرشتہ صفت ناسمجھ کے دامن عفت پر وہ داغ لگایا جو کسی خاتون کے لئے انتہائی بدنصیبی ہے۔ جب مقدمہ چلا تو معلوم ہوا کہ یہ ناکردہ گنہ معصوم تین ماہ سے اس رذیل وحشی کے پھندے میں اس کی بربریت کا شکار تھی ملزم کو حبس دوام کی سزا ہوئی بیچاری لڑکی بدنامی کی فضا میں پلی بڑھی اس کے ماتھے پر ایک ایسا کلنگ کا ٹیکہ تھا کہ اس بیچاری کو کوئی سہیلی یا ہمجولی میسر نہ آسکی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بدنما داغ کسی پاکیزہ زندگی اور مابعد کے اعمال سے نہیں دھل سکتا کم از کم موجودہ سوسائٹی میں تو انمٹ دھبہ سمجھا جاتا ہے وہ ایک اچھوت چیز ہوگئی جس کی صحبت بھی نجس اور بدنام کردینے کو کافی سمجھی جاتی تھی۔ لوگ اس سے اس طرح خائف تھے جیسے ہوے سے جب وہ بازار میں سے گزرتی تو منہ موڑ لیتے دوسرے گھرانوں کے ملازم اس سے دور رہتے تھے۔ جیسے متعدی امراض سے لوگ دور بھاگتے ہیں اس بیکس کم سن لڑکی کو اور سب بچوں سے علیحدہ اکیلے اکیلے کھیلتے دیکھ کر بڑا ہی رحم آتا تھا وہ اپنے ہم سنوں کو للچائی ہوئی نظر سے دیکھتی اور بعض اوقات جب اسے اپنے دل پر قابو نہ رہتا تو خائف اور ہراسان جھجکتی جھجکتی بچوں کی طرف بڑھتی مگر اُسے خود بھی محسوس ہوتا تھا گویا وہ کسی ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کر رہی ہے۔ لیکن یک لخت چاروں طرف کے بچوں سے ان بچوں کی مائیں یا دائیں اس طرح جھپٹ کر اپنے بچوں کو کھینچ لے جاتیں گویا وہ کسی مہیب خطرہ کے منہ میں تھے۔ کمسن لڑکی پھر تنہا رہ جاتی اور ڈھاڑیں مار مار کر روتی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا کلیجہ اس غم سے پھٹ جائیگا۔ آخر لاچار ہو کر وہ وہاں سے بھاگ کر اپنا منہ اپنی ماں کے آنچل میں چھپا لیتی۔

اس کی عمر کے ساتھ ساتھ اسکے مصائب میں اضافہ ہوتا گیا۔ سب لڑکیاں اس سے دور بھاگتیں جب وہ اپنی استانی کے ہمراہ بازار جاتی تو اس کی نگاہ ہمیشہ زمین پر جمی رہتی۔ شرمندگی کا خیال اس کے دل میں جاگزین تھا۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ نوجوان لڑکیاں جو اپنے والدین کی خوشحالیوں سے کہیں کم بے لوث اور باعصمت ہیں اس کے متعلق سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ اور اس پر ہنس رہی ہیں۔ لیکن اگر اتفاقاً وہ بھی آنکھ اٹھا کر ان کی طرف دیکھ لیتی تو وہ سب کی

سب فوراً منہ موڑ لیتیں اور دوسری طرف دیکھنے لگتیں۔ سوائے چند شریف طبع اشخاص کے اسے کوئی سلام نہ کرتا تھا۔ بازار کے لڑکے اسے بیگم بیپٹسٹ کہکر پکارتے تھے کیونکہ اس مردود ملازم کا نام جس نے ہمیشہ کے لئے اسکی خوشی کا جام پاش پاش کرکے دائمی روسیاہی اور بدنامی کا تمغہ دیدیا۔ موزو بیپٹسٹ تھا۔

کسی کو اس کے پوشیدہ رنج وتعب کا اندازہ نہ تھا کیونکہ وہ بہت کم گو تھی اور نہ کسی نے اسے ہنستے دیکھا۔ اس کے والدین بھی اس کی موجودگی میں بے چین رہتے تھے گویا وہ کسی ناقابل معافی جرم کے ارتکاب یا اپنی بدنامی و رسوائی کے خوف سے اس سے ذاتی کدورت رکھتے تھے۔ وہ زرد رو لیکن حسین تھی اس کا بدن چھریرہ اور قد لمبا تھا۔ اس کا حسن میری طبیعت کے موافق تھا۔ اور اگر یہ ناگریز واقعہ نہ ہوا ہوتا تو میں اسے ضرور اپنی بیوی بنانے کی کوشش کرتا۔

اٹھارہ مہینے ہوئے کہ ہمارے ہاں ایک نیا مجسٹریٹ آیا اور وہ ایک سکرٹری اپنے ہمراہ لایا۔ جو نوعمر اور خوشرو تھا عجیب وغریب طبیعت رکھتا تھا۔

اُس نے مس فونٹینل کو دیکھا اور اس پر عاشق ہو گیا۔ جب اُسے اس اندوہناک واقعہ کی اطلاع کی گئی تو اس نے کہا یہی واقعہ آئندہ کی احتیاط اور پرہیز کا موجب اور معمول سے زیادہ محبت اور باوفائی کا سبب ہوگا اور مجھے کوئی خطرہ یا خدشہ نہ رہے گا۔ اس نے شادی کا پیغام دیا جو فوراً منظور کر لیا گیا۔ شادی کے بعد ان دونوں میاں بیوی نے لوگوں سے ملنا جلنا شروع کیا۔ جن میں سے بعض نے تو ملاقات باز دید کی بھی لیکن اکثر قطعاً خاموش رہے۔ رفتہ رفتہ لوگ گذشتہ واقعات بھولنے لگے اور یہ تازہ کتخدا جوڑا سوسائٹی میں داخل کر لیا گیا۔

وہ اپنے خاوند کی پرستش کرتی تھی کیونکہ اس نے اسکی کھوئی ہوئی عزت و وقعت اُسے واپس دلادی تھی اُس نے لوگوں کے کہنے سننے کی مطلق پروا نہ کی اور مخصوص برگزیدہ ہستیوں کی مثال اُس نے رائے عامہ کا نہایت دلیری اور جوانمردی سے مقابلہ کیا جب لوگوں نے سنا کہ وہ عنقریب ماں بننے والی ہے تو سنگدل سے سنگدل نے اپنا دروازہ اسکے لئے چوپٹ کھول دیا۔ گویا ماں بننا ایک ایسی کرامات تھی جو تمام گناہوں سے پاک وصاف کر دیتی ہے۔ یہ باتیں آپ کو بہت عجیب معلوم ہونگی مگر کیا کیا جائے اس دنیا کا کچھ ایسا ہی دستور ہے۔ وہ ہر طرح خوش تھی اسکے تمام معاملات رو باصلاح ہو چلے تھے کہ مقامی تہوار کا دن آیا۔ مجسٹریٹ نے دیگر حکام اور اہلکاروں کے درمیان کھڑے ہوکر حسب معمول تقریر کی جس کے [illegible] کا سکرٹری پال ہیمٹ انعامی تمغے تقسیم کرنے [illegible] آپ کو معلوم ہے کہ ایسے موقعوں پر تمام پرانے بغض اور کینے رنگ لاتے ہیں خصوصاً اس [illegible] شہر کی تمام خواتین کٹہروں پر سے جھکی ہوئی [illegible] دیکھ رہی ہوں۔ سب سے پہلے مادمیلن [illegible]

جسے دوم درجہ کا تمغہ دیا جانا قرار پایا تھا۔ کیونکہ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہر شخص اول انعام نہیں پا سکتا۔ جب سکرٹری نے اسکے ہاتھ میں تمغہ دیا تو اس نے سکرٹری کے منہ پر دے مارا اور کہا " یہ تمغہ ہیپٹسٹ کے لئے رہنے دو نہیں مجھے اور اسے دونوں کو اول درجہ کا تمغہ دینا واجب تھا۔"

جملہ حاضرین قہقہے لگانے لگے۔ عوام الناس نہ مہذب ہوتے ہیں نہ ان میں لحاظ و مروت پائی جاتی ہے سب نے اس ناکردہ گناہ کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ جیسے لوگ کسی زبردست مجرم یا دلچسپ تماشہ کو غور سے دیکھتے ہیں۔ کیا آپ نے کسی خاتون کو اچانک مخبوط الحواس ہوتے ہوئے دیکھا ہے؟ نہیں! خیر ہم نے اس دن دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی مگر گر پڑی پھر اٹھی پھر گر پڑی اسکی نظروں سے مترشح ہوتا تھا کہ اس بھیڑ میں سے نکل بھاگنے کیلئے جنہوں نے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی وہ سب کچھ تج دینے کو تیار اور آمادہ تھی۔ کرہ کے پیچھے سے کسی نامعلوم شخص نے چیخ کر کہا " بیگم ہیپٹسٹ!! " پھر کیا تھا فوراً دہقانوں کی زبان چلنی شروع ہوئی اور ہر طرف وہ شرمناک واقعہ دہرایا جانے لگا جس میں طرح طرح کے بیہودہ مذاق طعنوں اور طنزیہ چست فقروں کی آمیزش تھی۔ لوگ اس حرمان نصیب خاتون کو فقط ایک نظر دیکھنے کے لئے اپنی کرسیوں پر کھڑے ہو ہو گئے۔ خاوند والیاں بچوں کو گودوں میں اٹھا اٹھا کر اس دکھیا کو دکھایا۔ اور بھائیوں نے بہنوں کو اس گڑبڑ اور شور و غل کی وجہ سے ایک قیامت سی بپا معلوم ہوتی تھی۔ وہ بالکل گم سم ہوگئی اور سہم کر اپنی کرسی پر بے حس و حرکت گر گئی آہ اس کے لئے کس قدر مصیبت کا سامنا تھا اس کی بپتا کے خیال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ نہ وہ وہاں سے نکل کر جا سکتی تھی اور نہ کہیں چھپ سکتی تھی اسکی آنکھیں بند ہوگئیں گویا سورج کی روشنی سے چندھیا گئی تھیں۔ اس نے ٹھنڈے سانس بھرنے شروع کر دیئے اسکو اس حالت میں گرفتار دیکھ کر دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ مسٹر ہمپٹ نے اس وحشی ہیڈ ماسٹر کا گریبان پکڑ لیا اور وہ دونوں زمین پر زور آزمائی کرتے دکھائی دیئے۔

ایک گھنٹے بعد ہمپٹ اور اس کی بیوی گھر جا رہے تھے تو وہ خاتون تھر تھر کانپ رہی تھی مگر اس واقعہ ہائلہ کی بابت اس نے زبان سے ایک حرف نہیں نکالا تھا جب دونوں پل پر پہنچے تو اس سے پہلے کہ اس کا خاوند کچھ مزاحمت کر سکے اس نے ایک چھلانگ ماری اور دریا میں کود گئی۔ اس جگہ پانی بہت گہرا ہے۔ اور باوجود شدید تلاش کے تقریباً دو گھنٹے تک لاش بھی نہ مل سکی۔"

مذکورہ بالا واقعہ بیان کر کے وہ شخص کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔ پھر بولا " غالباً اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ طعن و تشنیع سنتے رہنے

تو وہ ایک بار دریا میں کود کر جان دے دے۔ اس دنیا میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جن کی موجودگی میں زندگی ناممکن نہیں تو بے انتہا تلخ ضرور ہے۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ پادری صاحب نے مذہبی رسوم کی ادائیگی سے کیوں انکار کر دیا۔

اس خودکشی اور اس کی متعلقہ داستان نے لوگوں کو میت میں شرکت اور جنازہ کے ساتھ جانے سے باز رکھا۔ بالآخر ہم قبرستان کے دروازہ پر پہنچے اس قصہ سے میرا دل دہل گیا۔ دفن ہونے تک میں نے وہیں انتظار کیا، پھر میں اس نوجوان کی طرف بڑھا جو سسکیاں لے لیکر رو رہا تھا۔ نہایت خاموشی سے میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا۔ اس نے اشک آلودہ آنکھوں سے میری طرف متعجب ہو کر دیکھا اور کہا۔ میں آپ کا بہت بہت ممنون ہوں! شکریہ!!

یہ الفاظ اور مذکورہ بالا واقعہ سننے کے بعد مجھے ان دو گھنٹوں کے ضایع ہونے کا جو مجھے ریل کے انتظار میں وہاں بسر کرنے پڑے تھے زیادہ قلق نہ ہوا۔

نذرِ غالب

(از مسٹر کنہیا لال ثاقب بی۔ اے (آنرز))

وہ حسرتیں جو آ نہیں سکتیں حساب میں ۔۔۔ سرمایۂ نشاط ہیں عہدِ شباب میں
حالت بدل گئی ہے تمہاری شباب میں ۔۔۔ ڈوبے ہوئے ہو سر سے قدم تک شراب میں
آئینۂ حقیقتِ ہستی ہے رازِ مرگ ۔۔۔ دورِ حیات ۔۔۔ ایک سفینہ سراب میں
انکی "نہیں" بھی کم نہیں لطفِ وصال سے ۔۔۔ ملتی ہے کسقدر ہمیں راحت عذاب میں
وہ "لطفِ زندگی" ہمیں جسکی تلاش تھی ۔۔۔ آغوشِ دوست مل گئی دنیائے خواب میں
حیرت تھی شب کو دیکھ کے وہ دلفریبیاں ۔۔۔ کل تم چھپے ہوئے تو نہ تھے ماہتاب میں

ثاقب نہ مفت میں رہو امیدِ خام پر
ان کو قسم ہے کچھ نہ لکھیں گے جواب میں

بوسہ

(مترجمہ جناب صاحبزادہ احمد سعید خاں ٹونکی (علیگ)

بوسہ ایک محبت بھرا پیغام ہے، جو ایک روح دوسری روح کو بھیجتی ہے، اس کی مستانہ دلآویزیوں سے ہر شخص واقف ہے مگر اسے بجائے خود اس کی اہمیت کا قرار واقعی احساس نہیں ہوتا ——— اس سے پہلے ناظرین اسی لطیف موضوع پر ہمارے نامور اہل قلم سید سلطان حیدر صاحب جوش (علیگ) کے خیالات کے خیالات سے محظوظ ہو چکے ہیں۔ اب اسکی مغربی تصویر ملاحظہ فرمائیں جسکے لئے صاحبزادہ احمد سعید خاں صاحب شوق (علیگ) کی شوخئ طبع شکریہ کی مستحق ہے ——— اس مضمون کے اس حصہ سے جہاں "آداب بوسہ" کے باب میں بحث کی گئی ہے ہمیں پورا اتفاق نہیں ہے۔ مثلاً "مرد کا دراز قامت ہونا" (جو ممکن ہے مصنف و مترجم کے حق میں فائدہ مند ہو) ہمارے نزدیک فطرت پر ایک ناروا الزام سے کم نہیں ——— اسی طرح بوسہ کی حلاوتوں کے برتنے میں ہاتوں کے انداز کی تعین بھی کچھ زیادہ دلچسپ نہیں، ہمارے خیال میں اس وقت دست گستاخ کا کسی کے الجھے ہوئے بالوں سے کھیلتے رہنا زیادہ خوشگوار ہے ——— بعض اور بھی لطیف مباحث ہیں جن سے ہمیں اختلاف ہے۔ مگر ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ انکے باب میں گستاخئ تحریر روا رکھی جائے کیونکہ بہارستان یورپ کا کوئی "بوسہ ستانی" کا اسکول نہیں ہے ——— ہمارے بعض احباب طبی نقطہ نظر سے دنیا کی اس سب سے زیادہ لطیف رسم کو وہ زہر کے برابر مضرت رساں سمجھتے ہیں ——— لیکن یہ حقیقت ہے کہ وقت پر اس میٹھے زہر کے پینے سے انکار کی جرات انکو بھی نہیں ہوتی ——— اور نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ حقیقت میں یہ وہ دوا ہے جس کے لئے کہا گیا ہے ؎

یہ موت فخر زیست ہے یہ زیست رشک موت
دیتا ہے کوئی "زہر" ملا کر "دوا" مجھے

اختر

مسٹر سینڈرسن کارنیل میگزین میں لکھتے ہیں کہ:-

"بوسہ انسانی حیات کا ایک اہم اور لازمی جزو ہے ہر انسان کی حیات کی تاریخ میں بوسہ کی تاریخ بھی ضرور مرتب ہوتی ہے۔ مرد اور عورت کیلئے بوسہ ہی میں سب کچھ ہے

بوسہ ایک ایسی سرگم کی لے کی طرح ہے جو تیور (چڑھے ہوئے) سروں بجتی ہے اور شروع ہونے کے بعد پھر بڑھتی اور ترقی کرتی رہتی ہے۔

بوسہ فریب اور دغا بازی بھی ہے اور خلوص و عقیدت

کا ثبوت بھی! وہ عجیب بوسہ اس ماں کی محبت کا مظہر ہے جو اپنے پہلے نوزائیدہ بچہ کی پیشانی پر پہلی مرتبہ دیتی ہے۔ بوسہ تقدس کا منبع ہے اور معصیت کا سرچشمہ بھی۔ بوسہ ایمان و امانت کی ایک شان ہے، اور کفر و خیانت کا سبب بھی!

فرانس میں بوسہ مہذب سلام خیال کیا جاتا ہے لیکن انگلستان میں اسکے برعکس یہ مہذب سلام سخت بدتہذیبی اور توہین ہے۔

عورت سے ملاقات یا جدائی کے وقت بوسہ عہد و پیمان ہوتا ہے ایک کاذب جب دروغ حلفی کا مرتکب ہوتا اور آسمانی کتاب کو بوسہ دیتا ہے تو یہ بوسہ تباہیوں اور مصیبتوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ ایک بوسہ معصوموں کا ہے جو انکی دلی اور بے اختیارانہ مسرت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مشہور انگریز شاعر بائرن کا قول ہے کہ "بوسہ شراب دو آتشہ ہے جب ایک دوشیزہ اپنے لبوں سے بوسہ لیتی ہے تو یہ بوسہ آتش سیال کا ایک طوفان خیز دریا ہو جاتا ہے بوسہ انسانی احساسات پر ایک برقی اور طلسمی اثر پیدا کرتا ہے۔ اور انسانی جذبات کو ترقی دیتا ہے۔ ہماری نطق و گویائی کو طاقت دیتا ہے اور ہماری نیکیوں کو زینت بخشتا ہے۔ بوسہ پاکبازی بھی ہے اور اس میں گناہ کی آلودگی بھی پنہاں ہے۔ یہ دلوں کی آبادیوں میں انقلاب پیدا کرسکتا ہے۔ اور خاموش سفارشوں کا ایک دفتر ہے۔ یہ مسکن بھی ہے اور مسکر بھی۔ زہر بھی ہے اور تریاق بھی! اس میں مسیح کا سا تقدس بھی ہے اور یہودہ کی سی غداری بھی! بوسہ کے متعلق دفتر کے دفتر سیاہ ہو چکے ہیں۔

ٹیلیبرٹن مشہور مورخ نے بوسہ کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں پر تاریخی حیثیت سے نظر ڈالی ہے۔

یہ فاضل مورخ کہتا ہے کہ کائنات عالم کی طرح بوسہ بھی قدیم حیثیت رکھتا ہے۔ بوسہ کی عمر بھی دنیا کی عمر کے برابر ہے لیکن اس قدامت کے باوجود اس میں شباب کی تمام ولولہ زائیوں اور لذت بخشیوں کی ایک دنیا مضمر ہے بوسہ کی سحر کاریاں پہلے بھی تھیں آج بھی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ بوسہ مدار زندگی ہے بہشت میں ماما حوا نے بوسہ کی تعلیم حاصل کی ایک فرشتہ نے ان کو بوسہ کی پاکیاں خوبیاں اور فرحت انگیزیاں سمجھائیں۔ اس میں عجیب کشش اور مسحور کن دلنوازیاں ہیں۔ ایک بد مذاق اور شتاب کار تو بوسہ کی تمام خوبیوں کا انکار کرکے اپنی خشک باطنی کا یہ کہکر اظہار کرے گا کہ "وہ خدایا جس نے سب سے پہلے بوسہ کی ابتدا کی وہ بڑا ہی احمق اور عاصی تھا!" لیکن اسے دنیا کے ہر خطہ اور ہر حصہ میں بوسہ کی رسم کسی نہ کسی شکل میں نظر آئیگی۔ زمانہ ماضی اور حال کے افسانہ نویسوں کو تو بوسوں کا اجارہ دار سمجھنا چاہیئے۔ یا ایک تاجر کہنا چاہیئے جس کی دوکان میں ہر قسم کی اچار چٹنیاں موجود ہوں۔

بوسہ کے اثرات

شاعروں کے نزدیک بوسے شراب کے قطرے ہیں

کے نزدیک بوسے محبت کا ایک بڑا توپ خانہ۔ محبت کا حقیقی ثبوت۔ اور الفت کا مہکنے والا پھول ہیں۔ ہیرک کہتا ہے کہ بوسے محبت کا لاسہ اور عشق کی عمارت کے لئے سیمنٹ اور چونہ ہیں شئے لی کا عقیدہ ہے کہ جب عشاق کے لبوں پر ایک روح کا وصال دوسری روح سے ہوتا ہے تو ایک عجیب اور خوشگوار کسوف پیدا ہوتا ہے۔ کیٹس کے مصرعہ میں ایک عجیب سوز اور خلش ہے اس کا خیال ہے کہ ایک مقدس بوسہ میں حرارت سوز اور گداز کی ایک متحرک دنیا اور لرزاں عالم پنہاں ہے" بائرن کے ایک مصرعہ میں اس سے بھی زیادہ اضطراب موجود ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ایک طویل و مسلسل بوسہ میں دنیائے عشق اور عالم شباب کی تمام لذتیں اور مسرتیں ہیں" بائرن نے بوسہ کو شعر کے قافیہ اور نظم کے وزن سے تشبیہہ دی ہے۔ جانسن کی رائے میں گدانا اور ملائم لب ایک صحیح المذاق انسان کو بوسہ کی مداومت پر لبھانے کے لئے کافی ہے۔

یہی جانسن اپنی معشوقہ سیلیا کو کیسے دلکش نفیس اور پاکیزہ طریقہ سے مخاطب کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ دلنواز معشوقہ صرف اپنی خمار آلود اور پر سرور آنکھوں کی مستی کے جرعہ شباب سے مجھے بھی مست کر دے پھر میری آنکھیں خود تجھ سے پیمان وفا باندھ لیں گی مجھے اپنے کاسہ زنخداں سے ایک بوسہ لے لینے دے پھر میں جام شراب سے ہمیشہ کے لئے بے نیاز ہو جاؤں گا۔

شیکسپیر بوسہ کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "میرا وہ بوسہ جو تیری عظمت کے لئے ہے اس سے مجھے محروم اور مایوس نہ کر اور میرے مضطر قلب سے دعا ہے۔ خدا تجھے سلامت اور محفوظ رکھے"

اضطراب کی حالت کے بوسہ کے متعلق شیکسپیر کہتا ہے کہ "اس زور سے بوسے لئے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا لبوں پر بوسے اُگے ہوئے ہیں اور وہ انہیں جڑ سے اکھاڑ رہا ہے۔ یا "اُن کے چاروں لب گلاب کے چار سرخ پھول تھے اور موسم بہار کے جوش حسن اور جوبن میں انتہائی نزاکت کے ساتھ ایک دوسرے کو بوسے دے رہے تھے

سون برن کے آتشی اور جوشیلے جذبات کی غیر فانی روح بوسہ کے بغیر صبر نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے معشوق کو غائبانہ طور پر مخاطب کرتا ہے کہ تیرا شیریں سرخ شاندار اور قابل پرستش دہن ہے۔ اس سے بھی زیادہ روحانی لذت وہ اس طرح حاصل کرتا ہے کہ ایک بچہ کے لیپی کی طرح کے ہلکے گلابی رنگ کے پاؤں آسمانی آبادی کو بھی لبھا سکتے ہیں۔ اور ایک فرشتہ کے لب ان پاؤں کو بے اختیار بوسہ دے سکتے ہیں۔ ٹپر وشیور نے کیٹ کو محصور کرنے کے بعد بوسوں کے مکمل توپ خانہ کو نکالا اس نے اپنی دلہن کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے اور اس کے لبوں کے اس طرح بوسے لئے کہ تمام گرجا گونج اٹھا۔

چارلس بکسٹن جس کا زمانہ ۱۸۲۳ء؁ تک ہی اور جو پارلیمنٹ کا ممبر اور مشہور مصنف گذرا ہے اس کے الفاظ

یہ ہیں کہ اگر ہمارے لبوں کی جگہ سینگ ہوتے اور وہ ہمارے چہروں سے ایک یا دو فٹ باہر نکلے ہوتے تو بوسوں کی عادت تب بھی باقی رہتی۔ مخلوقات عالم میں طیور سے بڑھ کر کوئی اور مخلوق بوسہ کی عادی نہیں۔

ایک فراموش کردہ موضوع

آج اس تفریق انگیز زمانہ میں جبکہ خاندانوں کی مخصوص اور امتیازی رسوم و روایات مٹ مٹا کر نمایش گاہوں اور تاجروں کی آرایش گاہوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ گوشۂ گمنامی سے نکل کر بازار شہرت میں پہنچ چکی ہیں اور جرائد و رسائل میں درج ہو رہی ہیں بوسہ کا دلچسپ موضوع اور دلکش مضمون بالکل فراموش کر دیا گیا ہے حالانکہ کسی شخص کی زبان بوسہ کے تذکرہ سے خالی نہیں ہر شخص کی فکر رسا اس منزل سے آگے نہیں بڑھتی۔ اور ایک حسین شکل ایک انسان کو مسحور کر دیتی ہے اب تو نقب زنوں کی تعلیم یافتہ جماعت بھی بوسہ کی طاقتوں اور ساحرانہ کششوں کے متعلق عجیب و غریب تجربے کر رہی ہے انکے یہ تجربے بالکل منطقیانہ اصول پر مبنی ہیں۔ جس بوسہ میں یہ حیرت انگیز طاقت ہو کہ دلوں کے ٹکڑے کر دے وہ چند بند دروازوں اور آہنی صندوقوں کو بدرجہ اولیٰ پاش پاش کر سکتا ہے۔ یہ دنیا ایک تماشہ گاہ ہے اور اسکے اسٹیج پر بوسہ سے حیرت انگیز اثرات بالکل مختلف اور متضاد ظاہر ہوتے ہیں۔

ایک دلچسپ قصہ۔ کچھ عرصہ ہوا ایک شام کو میں اپنے دل میں بوسہ کے مختلف پہلوؤں اور نتیجوں پر غور کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک طویل القامت خاتون شام کے لباس میں آندھی کی طرح جھپٹتی ہوئی آئی اور آتے ہی ہوٹل کے دروازہ کو ذرا عجلت اور زور سے کھولا۔ کچھ عرصہ کے بعد بالاخانہ کی کھڑکی سے ایک چھوٹی خوبصورت بچی جھانکتی ہوئی نظر آئی۔ بچی مخمل اور سمور کا خوبصورت لباس زیب تن کئے ہوئے تھی بچی کی دلکش آنکھیں پرنم تھیں۔

"اماں! پیاری اماں!! کیا میں آپ کے پاس آؤں"

"نہیں ڈوری! جاؤ اور گھر جا کر سو جاؤ!"

"ماما جاؤ! ڈوری کو لے جاؤ اور گھر لے جا کر سلا دو"

اب ماں نے بچی کی پیشانی کا بوسہ اس طرح لیا کہ گویا برف کے ایک پہاڑ نے قطب شمالی کے کسی ساحل کا بوسہ لیا ہے۔ غیر مادرانہ اور شفقت کش بوسہ ختم ہو گیا اور بچی کی ماں بچی کو گھر بھیج کر ہوٹل سے روانہ ہو گئی!

دوسرا پر لطف واقعہ۔ میں اس واقعہ سے عبرت اندوز ہونے کے بعد ایک ریلوے اسٹیشن کی طرف چلا یہ اسٹیشن "پناما" اور "پابلر" کے درمیان ہے اور مشہور اسٹیشن ہے۔ یہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ میں گویا بوسوں کی ایک دنیا میں آ گیا ہوں ٹرینوں کی آمد و رفت کے پرشور وقت کے علاوہ وہاں ہر وقت بوسوں کی آوازوں کا ایک شور جاری رہتا ہے۔ لوگوں کی آمد پر بوسے تھے، وداع کے بوسے تھے۔ عزیزوں کے بوسے تھے۔ احباب کے بوسے

تھے۔ عشاق کے بوسے تھے۔ غرضکہ بوسوں کی ایک دنیا تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ بوسوں کی ایک بازی ہے جس میں جیتنے والا "پیالہ" اور "تمغہ" کے انعام کا مستحق ہوگا۔ ایک شخص تو ایک خاتون سے ملاقات کرکے ایسا بیخود ہوا کہ وہ خاتون کے بجائے اس کے قلی کا بوسہ لینے لگا۔ لیکن خیر ہوئی کہ وہ جلد سنبھل گیا اور اس نے قلی کو کچھ دے دلا کر معاملہ رفت گذشت کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں یہ باتیں عادت بن گئی ہیں اور ناقابل توجہ خیال کی جاتی ہیں۔

بوسہ کے آداب

میں نے ایک رسالہ خریدا اور اسکو پڑھا۔ اس رسالہ میں ایک زرد رنگ کا ورق تہ کیا ہوا بھی تھا۔ اس ورق میں بوسہ کے فلسفہ کے متعلق عجیب مضمون پایا۔ اس مضمون میں ۱۸۵۰ء کے زمانہ کی رنگین رسوم اور لذت بخش عادات کے حالات درج تھے۔ یہ ایک ایسا دلچسپ اور بالکل صحیح انکشاف تھا کہ کوئی شخص عام کتابوں کی بہتر سے بہتر جلدوں میں بھی نہ پا سکتا تھا۔ ان رسالوں کو ایک ایسا شخص فروخت کر رہا تھا جو ایک قدرتی شاعر معلوم ہوا اور جس کا صحیح رنگین مذاق اور فطرتاً طبیعت کا لگاؤ مشہور شاعر بائیرن سے کم نہ تھا۔ اسکا عام ذوق سلیم اشیا کی موزونیت سمجھنے اور صحیح جانچ کرنے میں عجیب وغریب تھا۔ وہ عام مجمع میں بوسہ کے فلسفہ پر ایک عالمانہ انداز سے تقریر کر رہا تھا۔ اسکی اس دلچسپ فلسفیانہ تقریر کا دلچسپ حصہ میں نے اپنی یادداشت میں لکھ لیا۔ اور وہ اتنا دلچسپ ثابت بھی ہوا کہ اب تک میری یادداشت سے ضایع نہ ہو سکا۔ اس شخص نے کہا تھا کہ لوگوں میں ایک فی صدی بھی بوسہ کے آداب اور قواعد سے آگاہ نہیں وہ بالکل ناواقف ہیں کہ اس پر سحر جنبش لب سے کس طرح لذت اندوز ہونا چاہئے اور کس طرح حزف ریزوں اور جواہر ریزوں میں امتیاز کرنا چاہئے حالانکہ یہ نہایت سیدھی سی بات ہے۔ پہلی بات تو قابل لحاظ یہ ہے کہ بوسہ لینے والا کون ہے، مرد یا عورت؟ اگر بوسہ کے عام آداب کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ لذت چند گونہ زیادہ ہو جاتی ہے۔ اگر بوسہ لینے والا مرد ہے تو اسکا قد دراز قد ہونا بہت خوب ہے۔ چہرہ صاف ہو آنکھوں سے الفت و مروت ٹپکے محبت ولذت کے آثار عیاں ہوں شیریں کلامی کی جائے سر برہنہ ہوں ہاتھ ایک دوسرے کے شانہ پر ہوں باہمی عزت ادب اور احترام کا لحاظ ضروری ہے لیکن محبت کی لذت زائیاں عشق کی بیقراریاں اور خیالات کی طوفان انگیزیاں بھی ظاہر ہوں قواعد مذکورہ کی پابندی میں تیزی اور شتابی نہ ہونی چاہئے بوسہ کی جگہ کو دھیان میں رکھیں اور جب لب جنبش و حرکت کریں تو اسوقت دل کشادہ ہوں اور آنکھیں بند یا نیم باز ہوں لب وا ہوں لذت و مسرت کے یہ وہ لمحے ہیں جب کہ دنیا کی کسی مصیبت تکلیف اور کلفت کا خیال گزر نہیں سکتا اور اس وقت دنیا فردوس بن جاتی ہے جس طرح شام کے نیلگوں آسمان کو شہاب ثاقب کی شعلہ فشانیاں منور کر دیتی ہیں اسی طرح اسوقت لذت وحرارت کی بجلیاں جسم انسانی میں کوندتی ہیں اور تمام اعصاب میں لذت کا جوش پیدا کر دیتی ہیں۔ اسوقت دلوں میں درشتی اور سختی نہیں رہتی۔ سکون، اطمینان اور آہستگی بوسہ کے آداب کی جان ہے۔

یادِ ہمنشیں

(از جناب مولوی ابو المصانع محمد عبید السلام خاں صاحب جلالؔ میرزا خانی لشیرانی مالیرکوٹلوی)

وہ نغمہ ہائے جانفزا، وہ مستیاں شراب کی ۔۔۔ وہ شوخیاں رباب کی، کہانیاں شباب کی
ہزار اور زاریاں، گل اور اشکباریاں ۔۔۔ دلوں کی بیقراریاں، صدائیں اضطراب کی
وہ جوش وہ جوانیاں، وہ فطرتی روانیاں ۔۔۔ فنا کی ترجمانیاں، کہانیاں حباب کی
وہ دہندلی دہندلی روشنی، کہ روشنی کی چھاؤں سی ۔۔۔ وہ جھٹ پٹی سی چاندنی، وہ حالت ایک خواب کی
وہ پربہار وادیاں، وہ دیو دار گھاٹیاں ۔۔۔ وہ آبشار کا سماں وہ بوندیاں سحاب کی
وہ راستوں کا گھومنا، ہر اک شجر کا جھومنا ۔۔۔ پہاڑیوں کا چومنا رکاب ہر سحاب کی
وہ لطف سوز و ساز کا، سماں نیاز و ناز کا ۔۔۔ وہ لحن خوش حجاز کا، وہ شوخیاں رباب کی
وہ نے کی مست سی صدا، وہ گونجتی ہوئی فضا ۔۔۔ کمی نہ کر پلائے جا، کمی نہیں شراب کی
کہاں وہ بزم پیار کی، وہ محفلیں بہار کی ۔۔۔ سبھوں نے اختیار کی ہیں صورتیں نقاب کی
وہ بزم وہ نشہ کہاں، بہار فتنہ زا کہاں ۔۔۔ وہ مست سی صدا کہاں کرامتیں تھیں خواب کی
مگر نہیں یہ خواب ہے، کہ مجھ سے وہ جدا ہوئے ۔۔۔ وفا بھی صورت اختیار کرتی ہی عتاب کی
وہ میرے انتظار میں، ہیں ایک حالِ زار میں ۔۔۔ بس اب اٹھی ہی چاہتی ہے پردگی حجاب کی

جلالؔ دن قریب ہیں کہ ہم بھی مر کے جی اٹھیں
کریں سرشک شوق تاب نذر آنجناب کی

اُردو مرکز، اربابِ علم اور ڈرامیٹک کلب

معزز رسالہ سُہیل (علیگڈھ) کی گذشتہ اشاعت کے شذرات میں اردو مرکز ارباب علم اور ڈرامیٹک کلب کے متعلق چند سطریں ایسی شایع ہوگئی ہیں جن سے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان تھا۔

اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے حضرت سالک بٹالوی نے جو مدیر سہیل کے نام کھلا مکتوب شایع کیا ہے اس نے اصل معاملے کو تو صاف کردیا مگر اپنی بے ضرورت تفصیلات سے اردو مرکز کے متعلق نادانستہ طور پر کچھ اور غلط فہمیاں پیدا کردیں۔ یہ تحریر انہیں غلط فہمیوں کے دور کرنے کی غرض سے شایع کی جاتی ہے۔

بقول حضرت سالک یہ تو واقعہ ہے کہ ڈرامیٹک کلب اور اردو مرکز میں کسی قسم کا کوئی تصادم نہیں ہے

ڈرامیٹک کلب گذشتہ سال پنجابی زبان میں ہیر رانجھے کا ڈراما اسٹیج پر کرچکی ہے اور غالباً اسکے حدود کار یہی ہیں کہ سال بھر میں ایک ڈرامہ اسٹیج پر کردیا کرے

اردو مرکز ایک دار التصنیف و التالیف ہے جو اپنی حیثیت کے مطابق اردو ادب کی خدمت میں مشغول ہے

اس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ڈرامیٹک کلب اور اردو مرکز کے ذرائع کار ایسے ہیں کہ ان میں کسی قسم کا تصادم ہونے کا آئندہ احتمال نہیں ہے لہذا محترم مدیر سہیل کو مسکے نامعلوم نامہ نگار نے جو اطلاعات بہم پہنچائی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ اسی طرح اردو مرکز کے حسب و نسب اور اسکی ہیئت ترکیبی کی تحلیل میں سالک صاحب نے جس صنعت ابہام کا بیجا استعمال کیا ہے اس سے بھی حسن نیت کے ثواب کے سوا اُنکے دامن میں نادانستہ غلط بیانی کے سوا کچھ نہیں پڑے گا۔

ذیل کی دفعات قایم کرکے میں ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ اردو مرکز کی نگرانی سے خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب کو دور کا بھی تعلق نہیں۔ شیخ صاحب موصوف کی بیکراں مصروفیات سے جو شخص واقف ہو وہ کبھی یقین نہیں کرسکتا کہ اُنکی عزیز مصروفیتیں چوبیس گھنٹے میں ایک منٹ کیلئے بھی اردو مرکز کے تصور کو اُنکے دماغ میں آنے کی اجازت دے سکتی ہیں۔ اردو مرکز کی بڑی خوش نصیبی ہوتی اگر شیخ صاحب جیسا گراں پایہ اور باخبر انسان مرکز کے کارناموں پر نگرانی کی زحمت برداشت کرتا۔ اردو مرکز کے کارکنوں کے کاموں کی نگرانی تنہا میں کرتا ہوں۔ میری ہدایات کے مطابق مرکز میں کام ہورہا ہے البتہ جب خود مجھے کسی معاملہ میں مشورے کی ضرورت ہوتی ہے تو اپنے محترم خان بہادر شیخ عبد القادر اور ہر اس باخبر ادیب جسکے مشورے کو میں گراں قدر سمجھتا ہوں، مشورہ لے لیا کرتا ہوں ان مشورہ دینے والے حضرات میں پنجاب و بیرون پنجاب کے

بڑے بڑے مقتدر حضرات شامل ہیں۔

۲- اردو مرکز کا میں صرف بقول آپکے کارفرما ہی نہیں ہوں، مالک بھی ہوا۔ عطر چند کپور کی مشہور فرم مرکز کی ملکیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ مرکز کے مختلف شعبوں میں صرف "منتخبات ادب" کے شعبہ کے متعلق اس سے معاہدہ ہوا ہے اس شعبے کی تالیفات پر فرم مذکور پندرہ ہزار نہیں بلکہ اب تک پچاس ہزار روپیہ صرف کر چکی ہے۔ اور حسب ضرورت صرف کرے گی۔

عطر چند کپور کی فرم اس وقت ان پبلشروں میں شمار کی جاتی ہے جنکی تعداد ہندوستان بھر میں دو چار سے زیادہ نہیں ہے۔ اس فرم کے کرتا دھرتا پبلشری اور بک سیلری میں آپ اور ہم دونوں سے زیادہ تجربہ کار، زیادہ عاقبت اندیش اور اپنی مصلحتوں کو ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں اپنی بزنس کے انجام کے متعلق کسی کی راہنمائی اور تنبیہ کے محتاج نہیں ہیں اردو مرکز سے جو ان کا معاہدہ ہوا ہے اسکے متعلق مالی امداد کے اندیشے میں ہیں آپکو گھلنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب تک اُنکی بزنس انہیں اجازت دے گی وہ اپنی امداد جاری رکھیں گے جب اُنکے تجارتی مصالح انہیں روکیں گے تو وہ آپکے سارے مشوروں سے بے نیاز ہونگے۔

۳- آپ فرماتے ہیں "اردو مرکز میں جو کارکن بلائے گئے وہ مجھ سے بیزار ہو کر چلے گئے اب صرف حضرت اصغر [illegible] ہیں جنکی مجبوریوں کا میں ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتا" [illegible] نہیں سمجھتا کہ سیتی میں شایع شدہ تحریر کے کس حصے کا یہ جواب ہے؟ اگر اس کھلے مکتوب کے نیچے آپ کا نام نہ ہوتا تو میں کسی طرح یقین نہ کرتا کہ یہ فقرے جن سے کسی ناکام پبلشر کی بوڑھی آواز پھوٹ رہی ہے کسی ایسے جرنلسٹ کے قلم سے نکلے ہیں جو اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتا اور دوسروں کو اصول صحافت کا واسطہ دینے کا حق رکھتا ہے۔ جن کارکنوں کو میں نے بلایا تھا وہ "آنریری ورکر" نہیں تھے تنخواہ دار ملازم تھے مرکز نے جب تک اُن سے کام لینا مناسب سمجھا کام لیا اور جب ہمیں معلوم ہوا کہ ان میں سے کچھ لوگ ان پارٹیوں کی سازشوں کا شکار ہو رہے ہیں جن کی آنکھوں میں اردو مرکز کا شہتیر خیرگی پیدا کر رہا ہے تو انہیں اجازت دیدی گئی کہ وہ سازشی جماعتوں کے دکھائے ہوئے سبز باغوں میں اپنے مستقبل کے سراب کا نظارہ کریں۔ باقی حضرت اصغر کی جن مجبوریوں کا ذکر کرنا آپ مناسب نہیں سمجھتے وہ مجبوریاں اگر کچھ واقعیت رکھتی ہیں تو بسم اللہ "خانہ آباد و دولت زیادہ"

حضرت اصغر سے ہم نے کوئی ایگریمنٹ نہیں لکھوایا جسکی دفعات اُنکے لئے زنجیر پا بن رہی ہوں +

۴- پراونشلزم کا سوال بھی جواب بے سوال ہے۔ ہزاروں یو۔پی کے باشندے پنجاب میں بہ عافیت زندگی بسر کر رہے ہیں اور بے شمار پنجابی بھائی یو پی کے ہر قصبے و ہر شہر میں "محلہ پنجابیاں" قایم کئے ہوئے ہیں نہ کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ آپ نے پنجاب میں آنے کی زحمت کیوں فرمائی نہ کسی نے آجتک اُنسے دریافت کیا کہ آپ یہاں دہنا دیکر کیوں بیٹھ رہے خدا کا ملک اور برطانیہ کی حکومت ہے جس کا جہاں جی چاہے

رہ سکتا ہے۔ ہم اور آپ روکنے ٹوکنے والے کون ہیں؟ کوئی مفاد جذبات ادھر یا ادھر اس ذلیل مالیخولیا میں مبتلا ہے تو آپ کی ہماری بلا سے حکومت کے ہسپتال کی اپریشن اسکے دماغ کو درست کر دیں گے۔ بدقسمتی سے ملک پہلے ہی سینکڑوں پارٹیوں میں تقسیم ہو کر مجموعی طور پر کمزور ہو چکا ہے اب ان ملعون تقسیمات میں پراونشلزم کی بیہودہ اور بے اثر تفریقات کس قدر مہلک ہونگی

۵۔ اردو مرکز اپنی وسعت اور استطاعت کے مطابق مجوزہ حدود کے اندر اردو کی خدمت انجام دے رہا ہے ان خطوط کے سوا جو خاص خاص ادیبوں کو بھیجے گئے ہیں کسی اخبار یا رسالے میں اس کا باضابطہ اعلان بھی نہیں ہوا دوسروں کی طرح ہم نے بلند بانگ فرضیات کا ڈھنڈورہ پیٹ کر دنیا کے کان بہرہ کرنے کی کبھی جرات نہیں کی اور صرف معیاری اصول بیان کرنے کی حد تک اس فرض کو ادا نہیں کیا بلکہ سال بھر کی مسلسل خاموش کاری سے ہمنے یہ ثابت کر دیا ہے کہ

قول سے بہتر عمل ہے

۵۔ اردو مرکز کے بانی اور کارکن انسان ہیں انسانیت غلطیوں سے مبرا نہیں ہے اگر آپ کو اسکے طریقہ کار میں کچھ نقص نظر آتا ہے تو اسے بتلانے کی مہربانی فرمایئے ہم شکریہ کیساتھ اس مشورے کو قبول کریں گے اور اگر یہ زحمت گوارا نہیں ہے تو اسکو کیساتھ اسوقت کا انتظار کیجئے جب اردو مرکز اپنی کارکردگی کو پبلک کے سامنے پیش کریگا۔ اسوقت ہم خود اُن حضرات کو صلائے عام دیں گے جنہیں اردو مرکز کی خدمات پر شوق تنقید زندگی کے اطمینان سے محروم کئے ہوئے ہیں۔

خدارا انصاف تو فرمایئے کہ ابھی تک اردو مرکز کی مطبوعات پریس سے باہر نہیں نکلیں قبل از وقت یہ ظالمانہ فیصلہ کہ

نتیجہ معلوم

کہاں تک اصول صحافت کا خون کرتا ہے کیا یہ اپنے اشاعتی اقتدار کا ذاتیاتی استعمال نہیں ہے۔

عطر چند کپور کی فرم ایک ہندو فرم ہونے کے باوجود اردو ادب کی اس غیر تاجرانہ خدمت پر پانی کی طرح روپیہ بہائے مگر ہم اردو کیلئے سرفروشانہ مظاہرہ کرنیوالے اس قابل قدر ایثار پر اس فرم کی زبانی حوصلہ افزائی سے بھی دریغ روا رکھیں ع

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

پھر اگر ہمارے اس غیر مآل اندیشانہ رویہ کو دیکھکر کوئی مبصر یہ رائے قائم کرے تو کیا بیجا ہوگا کہ ہم صرف اسی تحریک کو زندہ رہنے کا حق دیتے ہیں جسکے جاری کرنے میں تنہا ہمارا ہاتھ ہو اور جن تحریکات میں ہمارا ہاتھ نہ ہو خواہ وہ کیسی ہی مفید کیوں نہ ہوں انہیں نقصان پہنچانا ہمارے لئے زندگی کا ایک اہم کام ہو جاتا ہے۔

محترم مدیر سہیل سے التماس

محترمی! تسلیم عقیدت! اگر آپ اپنے نام سالک صاحب کا کھلا مکتوب سہیل میں شایع کرنے کی ضرورت سمجھیں تو براہ کرم سطور بالا کو بھی اسی اشاعت میں شایع فرما کر ممنون فرمایئے کیونکہ اس مکتوب میں روئے خطاب غیر ارادی طور پر آپ کی بجائے اردو مرکز کی جانب ہو گیا ہے۔

نیازمند تاجور نجیب آبادی

بہارستان۔ اس مراسلہ کے متعلق اپنی رائے سر دست محفوظ رکھتا ہے۔

تبصرے

بہار کے پھول (۱) اور علمی پھول (۲)

یہ دو چھوٹے چھوٹے کتابچے جناب فدا حسین مرزا بی اے اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس اور جناب خوشتر گرامی جرنلسٹ نے بچوں کے لئے لکھے ہیں ان میں بچوں کی سمجھ کے مطابق سلیس اور سادہ زبان میں کئی دلچسپ اخلاقی کہانیاں بیان کی گئی ہیں کہانیاں ہر لحاظ سے بچوں کے مطالعہ کے قابل ہیں اور بیحد مفید ہیں ہم امید کرتے ہیں کہ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی ان دلچسپ مفید کتابچوں کو ابتدائی مدارس کی لائبریریوں کیلئے خرید کر بچوں کے لئے عمدہ لٹریچر بہم پہنچائیگی۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب حجم ۱۰۰ اصفحات دونوں کی قیمت ۸/ ملنے کا پتہ میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز تاجران کتب لاہور

نقش ارژنگ

یہ جناب چودھری جلال الدین اکبر علی والوی متفرق نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے شروع میں ملک کے نامور ادیبوں کی رائیں درج ہیں جن میں مولانا نیاز فتحپوری مولانا تاجور نجیب آبادی، مولانا سید سلیمان ندوی اور خواجہ حسن نظامی کے نام نمایاں ہیں۔ اکبر پنجاب کے ایک نوجوان شاعر ہیں اور اُن کا کلام مولانا حسرت موہانی کا نقش ثانی معلوم ہوتا ہے ہمیں امید ہے کہ آپ کے کلام کی کماحقہٗ قدر کی جائیگی مجموعہ کا حجم ۱۲۵ اصفحات لکھائی چھپائی دیدہ زیب شروع میں مصنف کی تصویر بھی دی گئی ہے قیمت عہ ملنے کا پتہ دفتر بہارستان مزنگ لاہور

ادبستان

یہ باتصویر رسالہ جسے بمبئی کا واحد ادبی علمی رسالہ کہنا چاہئے ہمارے دو دوستوں مسٹر رشید صدیقی، اور مسٹر خلیل احمد سیکروی کی ادارت میں شایع ہوتا ہے بمبئی جیسے تجارتی مقام سے ایسے رسالوں کا اجرا ترقی اردو کے حامیوں کے لئے کمال مسرت کا باعث ہے اور ہم اپنے ہمعصر کا دلی تپاک سے خیر مقدم کرتے ہیں قیمت سالانہ تین روپیہ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ ادبستان۔ دادر بمبئی۔

ہندوستانی تجارتی جنتری معہ ڈائرکٹری ۱۹۳۶ء

ہمارے پاس برائے تنقید بھیجی گئی ہے۔ مضامین کتابت طباعت و نیز فہرست مضامین سے اندازہ کر کے ہم بوثوق کہہ سکتے ہیں کہ یہ جنتری و ڈائرکٹری تجارتی و صنعتی مشاغل سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کیلئے مفید معلومات کا مجموعہ ہے جس میں ہندوستان بھر کے تاجروں اور کارخانوں کے پتے بھی ہیں قیمت ۸/ ملنے کا پتہ ہندوستانی تجارتی معہ ڈائرکٹری ریلوے روڈ لاہور۔

مردوں کو لوہے کی لاٹھ بنانے والی آٹھ دوائیں

محبت بھرا تیل
طرفین کو حقیقی خوشی اور لذت کیلئے

اسم بامسمیٰ اور نایاب چیز ہے چند قطروں سے وہ راحت حاصل ہوتی ہے کہ دیدہ باید فی شیشی ایک روپیہ چار آنہ

امساک بھری گولیاں
اگر مادہ تولید اصلی حالت میں نہ ہو تو سرعت کی شکایت ہوگی۔ اس حالت میں اگر ایسی دوائی کی تلاش ہو جو شرم و ندامت سے نجات دلائے تو یہ گولیاں حاضر ہیں فی شیشی ایک روپیہ

اگر
قوت مردمی کی کمزوری نے دل شکستہ کر دیا ہے تو **بام صحت** کا استعمال شروع کیجئے اس کے چند روزہ استعمال سے تمام شکستہ قوتیں بحال ہو جائیں گی پٹھوں میں قوت و تحریک پیدا کرتی ہے کہ جوش قوت دیرپا ہو جاتا ہے خلوت کے بعد جو کمزوری اور تکان محسوس ہوتی ہے اسے یہ بہت جلد دور کر دیتی ہے اس کے چند روزہ استعمال کرنے والے میں خود احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اب قوت مردانہ سے مایوس و محروم نہیں ہے۔ قیمت فی شیشی تین روپے

صراط الشفا
جریان نیا ہو یا پرانا احتلام کی کثرت سے ہوتا ہو اور ساتھ ہی ساتھ سرعت کی بھی شکایت ہو تو اس دوائی سے گھبرائیے نہیں فائدہ حاصل کیجئے جریان کے ہولناک نتائج سے بچانے اور قوت مردمی کی کمزوری کے دور کرنے کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے قیمت صرف پانچ روپے

مسیحائی
اگر سرعت کی شکایت ہو اور ایسی دوائی کی تلاش ہو جس سے عارضی فائدہ کے بجائے مستقل نفع ہو اور طبعی امساک پیدا ہو جائے تو مسیحائی کا استعمال شروع کر دیجئے عارضہ کا ازالہ کرنے والے نوجوانوں کیلئے یہ ایک خاص چیز ہے [illegible] قیمت چھ روپے

لاجواب طلا
اس حالت میں جب کہ کسی خراب اور شرمناک حرکت سے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر لیا ہو یا دوسری وجوہات سے قوت گھٹ گئی ہو تو یہ طلا تمام خرابیوں کو دور کر کے اعضائے تناسل کے لئے کافی روح و ریح حاصل کر کے کمزور حصہ کو قوت بخشتی ہے قیمت دو روپے

کامیابی
وہ نوجوان جن کی شادیاں نزدیک ہیں یا وہ لوگ جو قوت مردانہ میں اپنی حالت کو ناگفتہ بہ خیال کرتے ہوں کامیابی کی چند خوراکوں سے بھرپور فائدہ حاصل کر سکتے ہیں یہ دوا قوت مردمی کے لئے حیرت انگیز دوا ہے جو بگڑی ہوئی قوت کو ٹھیک کرتی اور مایوسی اور پشیمانی کو خوشی سے تبدیل کر دیتی ہے۔ اگر آپ کو بھی [illegible] میں ذرا بھی کمزوری محسوس ہوتی ہے تو بس فوراً اس دوائی کا استعمال کر دیجئے۔ بارہا کی آزمودہ اور مجرب چیز ہے قیمت فی شیشی دو روپے

پیام صحت
وہ بدنصیب انسان جو بیاہ سے [illegible] حقیقی خوشی سے [illegible] وہ نوجوان جو [illegible] وہ [illegible] پیام صحت [illegible] قیمت فی شیشی [illegible]

ملنے کا پتہ ادویات بام صحت دواخانہ کوچہ چیلاں دہلی



جھوجھو بچیہ دار جھولا

بچہ کی حفاظت اور حفظانِ صحت کے اصولوں کو مدنظر رکھکر تیار کیا گیا ہے۔ جھوجھو میں بچہ کو حفاظت اور آرام کے ساتھ ایسی قدرتی ورزش میسر آتی ہے جو اس کا ہاضمہ درست رکھنے اور نازک قوی کو مضبوط کرنے کے واسطے ضروری ہے۔ جھوجھو میں نہ بچہ کو بھی پکڑنے کی ضرورت نہ کسی کی نگرانی کی حاجت۔ بچہ کو خوش محفوظ اور آرام سے دیکھکر ماں کے دل کو فرحت رہتی ہے اور اطمینان سے گھر کے اور کاموں کی فرصت ملتی ہے۔ تہ ہوکر بستر میں لپٹ سکتا ہے۔ ہر جگہ آسانی سے لٹکایا جا سکتا ہے۔ ایک من وزن سہار سکتا ہے۔

معزز و مستند ڈاکٹر اپنے بچوں کے واسطے استعمال کرتے ہیں اور وں کے بچوں کے واسطے تجویز کرتے ہیں۔ (۱) دو اور بھیجد یجیئے۔ میں جھوجھو کے مفید ہونے کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ از جناب ڈاکٹر ڈی ہوشن صاحب آئی۔ ایم۔ ایس ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔ (۲) ڈاکٹر کلف نے آپکا جھوجھو بچہ کے واسطے تجویز کیا ہے۔ از جناب لیفٹ ہاڈی کاٹ صاحب۔ مسوری (۳) ڈاکٹر شا فہ نے آپ کا جھوجھو بچہ کے واسطے تجویز کیا ہے۔ از جناب ایس احمد صاحب بسمت فتح دیار آباد دکن۔

جھوجھو بہت کام بڑے آرام اور تھوڑے دام کی چیز ہے

(۴) جھوجھو ہم کو ان بدن کار آمد اور مفید ثابت ہوتا جاتا ہے۔ از جناب دیا کمن صاحب ایم۔ اے۔ ڈاکٹر محکمہ تعلیم کوئٹہ۔

(۵) آپ کا جھوجھو جھونپوں کے آرام کے واسطے عجیب چیز ہے۔ بڑی خوبی یہ کہ ان داموں میں ہر شخص خرید سکتا ہے۔ از جناب سید حسن امام صاحب ازگیا۔

دنیا کی موجودہ ترقی کا راز اور دں کے تجربہ سے فائدہ حاصل کرنے کا نتیجہ ہے۔ آپ بھی اپنے پیارے اور عزیز بچہ کو اس مجرب اور مفید چیز سے محروم نہ رکھیں اپنے پسند ہونے یا واپسی کی شرط پر آج ہی بذریعہ وی پی منگائیں

قیمت قسم اعلیٰ بتیل کا فوم نہایت اعلیٰ قسم کا خاکی چین **لعہ** **قسم اوسط** آہنی فریم خاکی چین نہایت مضبوط ۱۲ روپے

کے اینڈ کیز کمپنی۔ فیض بازار ۱۲ پوسٹ بکس ۲۲ دہلی

ہزاروں بیماریوں کی ایک دوا

جوہرِ شفا ہاضمہ کی بہترین دوا ہے۔ پیٹ کی کوئی بیماری ہو اس کے چند قطرے پانی میں ملاکر پینے سے فوراً آرام۔ بھوک زیادہ کرتی ہے غذا کو جلد ہضم کرتی ہے جسم میں کسی جگہ درد ہو اسکی تین بوندیں مل دیجئے ۳ منٹ میں آرام ہو۔ سر کے درد۔ کھانسی۔ نزلہ۔ زکام موسمی بخار کیلئے بیحد نافع ہے۔ اسی لئے اس کا نام **جوہرِ شفا** رکھا ہے۔ قیمت فی شیشی ڈیڑھ روپیہ۔ چھوٹی شیشی ایک روپیہ۔

نقرئی گولیاں طاقت مردمی کیلئے نایاب چیز ہے۔ ان گولیوں کا خاص فائدہ یہ ہے کہ ان کا اثر عارضی نہیں ہوتا بلکہ مستقل ہوتا ہے ان گولیوں کے استعمال کے بعد اگر دس برس تک آپ کو جریان یا کثرتِ احتلام کی شکایت ہو تو دوا مفت۔ قیمت ۱۲ گولی بیہہ

انعامی چیز

یہ طلاء ایک رئیس کیلئے تیار کیا تھا۔ جنکے استعمال سے پورا پورا فائدہ ہوا۔ اور موصوف نے ہم کو ۲۰۰ روپے بطور انعام عطا فرمائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا نام انعامی طلاء رکھا ہے۔ قیمت چھوٹی شیشی عہ بڑی پانچ روپے۔

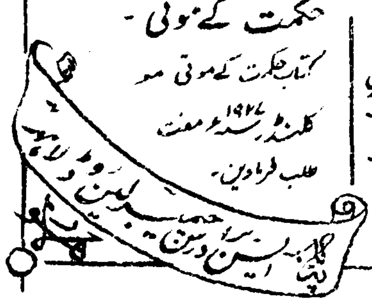
دمہ کی دوا۔

دمہ کے مریض کو سردیوں کے موسم میں جو تکلیف ہوتی ہے ناقابل بیان ہے۔ رات بھر کی تکلیف صرف ایک چٹکی سوتے وقت پان کے ساتھ کھانے سے دور ہو جاتی ہے۔ قیمت بہت کم یعنی فی شیشی عہ

محصول ڈاک ہر دوا بذمہ خریدار

حکمت کے موتی۔

کتاب حکمت کے موتی مع کلنڈر سنہ ۱۹۲۷ء مفت طلب فرمادیں۔



قواعد

۱ - بہارستان - ہر ماہ انگریزی کی یکم تاریخ کو شائع ہوتا ہے -

۲ - سالانہ چندہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے، نمونہ آٹھ آنہ، (علاوہ محصول ڈاک) غیر ممالک سے آٹھ روپیہ (سالانہ) پیشگی آنے پر رسالہ جاری کیا جاتا ہے -

۳ - جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ آنا ضروری ہے -

۴ - خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے کے پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے

۵ - رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۵ تاریخ سے پہلے پہنچ جانی چاہیے - اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا -

۶ - منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا پورا پتہ لکھیں -

۷ - کوئی ایسا اشتہار جو خلافِ تہذیب ہو نہیں درج کیا جاتا ہے

۸ - نرخنامہ اشتہارات حسب ذیل ہے -

پیمانہ صفحہ	ایک اشاعت	تین اشاعتیں	چھ اشاعتیں	بارہ اشاعتیں
پورا صفحہ	۶ روپے	۱۶ روپے	۳۰ روپے	۵۵ روپے
نصف صفحہ	۳ روپے	۸ روپے	۱۶ روپے	۳۰ روپے
سرورق	۱۵ روپے	۴۰ روپے	۷۰ روپے	۱۲۵ روپے

منشی محمد صادق مینجر رسالہ بہارستان مزنگ لاہور

نے باہتمام منشی نظام الدین گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

بنام شاہد نازک خیالاں

نذر عاشقان آشفتہ حالاں

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ماہوار مجموعہ

بہارستان

ادارہ

مدیر مسئول

اختر شیرانی

معاون

رفیعی اجمیری

مقام اشاعت

دفتر رسالہ "بہارستان" مزنگ لاہور

جلد ۲ | فہرست مضامین بابت ماہ مارچ ۱۹۲۷ء | نمبر ۳

تصاویر ۱- ساقی (۲) کنول سے مشابہ ستون جن کو رامیس اعظم نے تعمیر کرایا۔ (۳) لکسر معبد۔ ستونوں کا ایک اور دلفریب منظر (۴) ہورس کا مقبرہ (بمقام اڈفو) (۵) لکسر معبد۔ ہشت پہلو ستونوں کا ایک خوبصورت نظارہ۔

بہارستان سبھا

اس دفعہ حسب وعدہ قبلہ مولانا احسن لکھنوی کا ایک گرامی نامہ درج کیا جاتا ہے جسے امید ہے ناظرین دلچسپی کی نظر سے دیکھیں گے۔ یہ ہمارے بعض سوالات کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

تحقیق قصہ پدمنی ایک یا دو اشاعتوں کے بعد ختم ہو جائیگا اس لئے ہم مولانا محمد احتشام الدین صاحب حقی دہلوی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ آئندہ کے لئے کوئی ایسا ہی گراں پایہ مفید اور محققانہ مضمون عنایت فرمائینگے۔

آرٹ پر جناب شیخ عطاء الرحمٰن صاحب دہلوی کے سلسلہ مضامین کی بسم اللہ ہوتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آگے چل کر آپ اس فن لطیف کے دوسرے مباحث پر توجہ فرمائیں گے۔

افسوس ہے کہ حضرت قبلہ مضطر خیرآبادی علیل ہیں ہماری دعا ہے کہ شافی مطلق جلد سے جلد صحت عطا فرمائے۔

حضرت غریب جہاں آبادی جن کا افسانہ "اسیر حرم" پہلے بہت مقبول ہو چکا ہے۔ اس مرتبہ پھر تشریف لائے ہیں۔ لیکن پہلے کی طرح صرف نام کی روشنی میں کاش کہ آپ اپنا پورا پتہ لکھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔

"زندہ بدست مردہ" اس اشاعت میں ختم ہوتا ہے جس کا افسوس ہے۔ دل چاہتا ہے کہ یہ مضمون اور بھی طویل ہوتا۔ کیا ہم امید کریں کہ محترمی مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب دہلوی آئندہ اسی مضمون کی صدائے بازگشت سنانا پسند فرمائیں گے؟

کوئی صاحب بتلائیں کہ ذیل کا بند کس نظم کا ہے۔ اور کس کی تصنیف ہے ؎

ایک مدت تک دل غمگیں کو بہلاتے رہے
ضبط غم کرتے رہے، کہنے سے شرماتے رہے
سیر کوہ و راغ و دریا روز دکھلاتے رہے
الغرض سو سو طرح سے جی کو سمجھاتے رہے
اب مگر چلتا نہیں دل پر فریب آرزو!
یوں تو ہم کھایا کئے اکثر فریب آرزو!

(اختر)

مُسلم یُونیورسٹی علیگڈھ

اور

"نشاطِ روح"

علیگڈھ میگزین نے اپنی ایک قریبی اشاعت میں نشاط روح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر اسکو مسلم یونیورسٹی کے اردو نصاب میں داخل کرلیا جائے تو یہ ایک بہت اچھا انتخاب ہوگا۔

مسلم یونیورسٹی کا اردو نصاب اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے اس کے حصہ منظومات میں بعض نیم فلسفیانہ قومی نظمیں تو ضرور ہیں لیکن ان کی شاعرانہ حیثیت ذوق سلیم اور وجدان صحیح کیلئے باعث ننگ ہے یہاں گنجایش نہیں ہے کہ ہم تام بنام ان کتابوں پر تبصرہ کریں اس وقت صرف میگزین کی تائید مقصود نظر ہے۔

"نشاط روح" بلحاظِ فن نہایت بلند چیز ہے شاعری کا شباب، جذبات کا ترنم، الفاظ کی شادابی تراکیب کی ندرت، غرض ہر ضروری خصوصیت اپنے منتہائے عروج پر نظر آتی ہے،

"نشاط روح" پر ملک کے بلند پایہ رسالوں میں جو تبصرے ہوئے ہیں اور جنکا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے ان میں نمایاں طور پر اعتراف کیا گیا ہے کہ نشاط روح کی فنی حیثیت اردو شاعری میں سب سے زیادہ ارفع ہے۔ اور خالص شاعری صحیح شاعرانہ جذبات، پرواز شعریت، لطافت فکر اور رعنائی خیالات کے اعتبار سے آج کل کے مشہور شعرا حسرت اقبال فانی۔ جگر۔ عزیز وغیرہ اصغر کی گرد کو بھی نہیں پہنچے۔

فارسی میں بھی بجز حافظ کے سوا کوئی ایسا رنگین نوا شاعر نظر نہیں آتا جس کو جناب اصغر کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔

نشاط روح کا مقدمہ بھی بجائے خود ایک مستقل علمی وادبی حیثیت رکھتا ہے، غرض یہ کتاب ہر طرح اس کی مستحق ہے کہ اسے مسلم یونیورسٹی اپنے نصاب میں داخل کرکے اپنی بلند ذوقی کا ثبوت دے۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے نصاب ساز حلقہ میں اس مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے اور اگر حسب توقع "نشاط روح" نصاب میں داخل کرلی گئی تو یہ امر ہر طرح مسلم یونیورسٹی کے نصاب کے شایان شان ہوگا۔

(سید محمد صدیق بجنوری ایم، اے۔

نامۂ احسن

(لسان العصر حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی)

اختر شیریں زبان سلمہ اللہ تعالیٰ

مدت کے بعد جواب لکھا جا رہا ہے تعویق جواب کا باعث حوادث روزگار ہیں۔ ایک سال کا ایک بچہ ایک ہفتہ پیچیدہ امراض میں مبتلا ہو کر راہی عدم ہوا۔ خدمت تیمارداری سے فرصت پائی۔ بازگشت حقیقی کا کوئی علاج نہیں۔ ایک روز موٹر پر ولیعہد بہادر کو ہمراہ لیکر سکول جا رہا تھا کہ ایک صاحب نے موٹر کا دروازہ پوری قوت سے بند کر دیا۔ ایک انگلی پر سخت ضرب آئی شکر ہے کہ ناخن نہیں ٹوٹی اور ایک ہفتہ میں صحت ملی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ حالانکہ اس دارمحن میں یہ تکلیفیں معمولی ہیں۔ مگر ذی روح ہونے کے باعث کبھی چیخ بھی نکل جاتی ہے

آج میں تمہارے ادب کی بھی تھوڑی سی تعریف کرونگا نہ کہ تمہارے لئے میرے پاس الفاظ ستائش و مدح سرائی کم ہیں۔ اس لئے نہیں کہ میں خدانخواستہ مفلس یا بخیل ہوں۔ بلکہ اسلئے کہ تم نے اظہار ارادت میں مجھے تہذیب مروجہ کے شکنجہ میں کسا ہے۔ میں کچھ کہوں اور تمہارے حریفان بزم سوء ظن میں مبتلا ہو جائیں۔ یا آپ کی نازک مزاجی کی جبین پر شکن ہو جائے۔ اخیر جو کچھ ہو رعنائی ادب کو محروم نہیں رکھ سکتا۔ یہ گناہ کبیرہ ہے۔ حسن و خوبی سے متاثر نہ ہونا غیر ذی روح کا کام ہے۔ میں بوڑھا ہوں مگر ابھی لاش نہیں ہوں۔ دماغ میں برودت کلی نہیں، خون دورہ کرتا رہتا ہے اور قلب باوجود ضعف و ناتوانی متحسس ہے!

جب نیا بہارستان سامنے آیا۔ تمہاری نظم و نثر دیکھی۔ ایک لہر سی آئی جی چاہا کہ کچھ لکھوں۔ جواب لکھنے بیٹھا بھول گیا۔ اسلئے عنوان نامہ اختر کی مدح سرائی سے شروع ہوتا ہے۔ شاید پیری کی بیہوشی غالب ہو کر پھر مقصود فی الذہن کو فنا کر دے۔ اختر! دلفریب الفاظ کی تلاش دلپذیر فقرات کی خوبصورت کڑیاں زنجیر ادب کے سلسلہ میں باعث فروغ قوت باصرہ ہیں۔ خدا مبارک کرے۔ فارسی ترکیب کے چھوٹے چھوٹے خود ساختہ فقرے (صفت بحال متعلق، یا بصورت اسم فاعل ترکیبی) الجھن اور غرابت کے بغیر تمہارے قلم سے نکل کر جاذب ذوق ہوتے ہیں۔ انداز خوب ہے بلکہ بہت خوب ہے۔

اختر! جس سطح اعتدال پر ہو اور جس نقطہ کو مرکز بنائے ہوئے ہو اس سے زیادہ تجاوز نہ کرنا زمانہ کے ساتھ ترقی کا سفر کرنا اور اپنے کسی پیر ز قوت کو آگے رکھ لینا۔ ترقی میں افراط و تفریط کا نازک خیال پیش نظر رہے ایسے ارادہ اور جسارت سے بڑے بڑے ارباب فن و صاحبان معلومات دھوکا کھا کر خراب ہو گئے ہیں۔ مشاہیر اساتذہ لکھنو میں جناب رشک اور حضرت بحر کی مثال قرن اوسط میں اور ہمارے زمانہ میں حضرت .... کا کمال ہے۔ جب یہ ذی استعداد لوگ لکھنو میں ابھرے اور انکی شاعری چمکی تو ان لوگوں کو علمی قوت پرواز کے بھروسے پر یہ خیال پیدا ہوا کہ ہماری شاعری میں عمومیت کے خلاف کوئی شان امتیاز پیدا ہونا چاہیئے۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے چلے مگر ایسی پست ہوئی کہ طبقۂ اسفل السافلین تک پہنچ گئے

جناب رشک سے

چہرا چلا فلک پہ بت خانہ جنگ کا   چھوٹا ہے نیل گاڑ پہ کتا تفنگ کا

جناب بحرؔ

غم سے ہوئے ہیں بال ہمارے سفید بحرؔ   سر میں پھپھوندی لگ گئی آنکھوں کے سیل سے

جناب ...... ۔۔۔ ....

مثال کے طور پر ان تینوں صاحبان کمال کا کلام لکھا گیا خوف طوالت سے قلم انداز کرتا ہوں۔ اس رنگ شاعری نے علم و سخن پر پانی پھیر دیا حالانکہ یہ مستند لوگ ہیں اور اپسماندگان کیلئے اپنی تصنیفات کا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں جس سے ارباب لکھنو مستفید ہو رہے ہیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ آجکل اردو بگڑ رہی ہے جسکو اہل ذوق ترقی سمجھے ہوئے ہیں وہ تنزل ہے جوانان سعادت آثار ہیں ہو تو پیر دانا کی نصیحت یاد رکھنا ایک شان ادب خفیہ طور پر جو لطافت نثر پر مستولی ہو رہی ہے اہل قلم کے احساس سے باہر ہے الہامی دماغ کی خوبی یہی ہے کہ جو کچھ اور جس قدر بلا ارادہ قلم سے نکلے اسکو ودیعت قدرت سمجھو الفاظ کی شوکت اور معنوی سنجیدگی میں پڑ کر نثر کو کلام بدر چاچی نہ بناؤ۔ نیچر خود مصلح ہے طبیعت کی اصلاح کے تابع رہو کسی کی نقل نہ کرو یہ نہایت کمزوری انسانی ہے کہ انسان دوسروں کے الفاظ پر فریفتہ ہو کر خود بھی ایک لغت تصنیف کرنے لگے۔

زوردار طبیعتیں کسی ٹکسال یا ہر مذاق کی نقل نہیں کرتیں یہ وہ باتیں ہیں کہ جو کسی کتاب میں تمہیں نہ ملیں گی۔ اور کہنے والے کا بھروسا نہیں کہ کب آنکھ بند ہو جائے۔ جوان صالح ہو تو پیر دانا یا نادان کے باتوں کو گرہ میں باندھ رکھو گے!

بعض اہل قلم کی جناتی زبان دیکھکر عبرت ہوتی ہے۔ اردو ایسی ستھری فہم زبان مشہور تھی جب معاملہ فہمی کی اشد ضرورت واقع ہوتی تھی تو انگریزی، فارسی، عربی چھوڑ کر اردو ہی میں معاملہ فہمی کی گنجائش پیدا کرتے تھے۔ لیکن آج کل کے اہل کمال کی اردو جو منازل ارتقاء ادب کو طے کرتے ہوئے حجب آسمانی میں ڈوب جاتی ہے۔ وہ حضرت جبرئیل سے صدرۃ المنتہیٰ پر باتیں کرنے کے قابل ہے جس اردو کو فارسی پڑھے ہوئے لوگ بھی نہ سمجھیں تو لعنت ہے اس اردو پر! اللھم اہدنا الصراط المستقیم۔ یہ اک وبا ہے یا اک مادہ ساری ہے تمام دنیا کے کمالوں سے بہترین کمال احساس مذاق سلیم ہے۔ یہ ودیعت قدرت ہے انسانی دار و گیر سے بری ہے۔ اختر! تمہارا "بہارستان" بھی اس مرض سے خالی نہیں۔ وہاں بھی گردش قلم اور ہیجان طبیعت ہیجِ ہذیان تپ زدہ ہے۔ جھگڑا چھڑ جائے کا خوف ہے ورنہ حوالہ دیتا۔ رہنے دو، چلنے دو، کچھ مابہ الامتیاز فرق قدرت کے شاگردوں اور نیچر کے مقلدوں میں رہنا چاہئے۔ ہاں اور سنئے آپکی عنایتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ مدبران بیرونجات کی جانب سے معہ فرمائش مضامین صحیفجات کے ارمغان مختلف متواتر وصول ہو رہے ہیں ایک حریف رقابت شعار بہارستان کے مقابل میں نگارستان شہر بنگلور سے نکال رہے ہیں۔ اور دعوت دیتے ہیں۔ ...... شاید انہیں معلوم ہوگیا کہ احسن پھر زندہ ہوگیا۔ ادھر کلکتہ کا آفتاب تجلی ریز ہے۔ فرسودہ قلم پیر حقیر سے نوجوانوں کی حسرتیں کیونکر پوری ہونگی؟

میری رائے ان نباتات موسمی کیلئے باد سموم کا کام دیگی

ع خاموش از ثنائے تو حد ثنائے تست۔

آپ کے محبت نامہ کے ساتھ ایک عنایت نامہ ....
..... کا بھی مدغم یا ملفوف تھا۔ استفسارات میں مستفسر

کا لب و لہجہ جو تخلص زیر بغل تھا وہ بھی برہم کن نیاز کیشی ہے؟
میرے لئے بعض ادائیں . . . . . . میں روح فرسا ہیں
یہ عمل سلیقہ انتخاب پر مبنی ہو یا عمداً میری کمزوری دکھانے
کا ارادہ ہو کہ میرے کلام سے وہ حصہ انتخاب ہوا ہے جو
نہایت معمولی ہے۔ اگر میرے ڈراما سے بعض مقامات جو نظم
ونثر کی قوت سے مملو ہیں منتخب کئے جائیں تو روح ماثور
میں ہیجان پیدا کردیں گے۔ مگر ہائے رے کم نظری اس؎

کے بخاک فگند و کسے نواخت مرا
بقدر ہمت خود ہر کسے شناخت مرا

گو مجھے اتفاقات نے ڈرامانویسی کی جانب مائل کیا تھا مگر زمانہ دراز کی مشقت کے بعد مجھے باشندگان دنیا سے کس مپرسی سے امید تھی کہ میری تصنیف کی قدر کریں گے۔ میرے کندھے اپنی تصنیف کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھرتے رہے۔ لیکن نگاہ قدر شناسی بے نور نظر آئی۔ جب میں الفاظ کے لخت جگر اسٹیج پر پھینک رہا تھا تو دنیا خاموش تھی، انسان مفلوج تھے قدرداں گونگے تھے۔ قوت حس فنا ہو چکی تھی۔ سینہ نہ تھا مزار تھا۔ دل نہ تھا میت تھی زبان سے قوت گویائی سلب ہوچکی تھی آخر میں نے اپنے ڈراما کی بے غسل وکفن لاشیں گھر کے صندوقچے میں دفن کردیں۔ اور ان پر آخری فاتحہ خیر پڑھ دیا۔ تماشا یہ تھا کہ موضوع شاعری پر جب بڑے بڑے اہل قلم کے مضامین شایع ہو رہے تھے تو وہ لوگ ہندوستان میں ڈراما کی کمی کی شکایت کرتے تھے۔ مگر چراغ کے تلے اندھیرا، ان کے تقدس ان کے زہد و ورع نے کبھی اسٹیج پر تشریف لانے کی تکلیف نہ دی۔ وہ بزرگوار مرگئے۔ مثلاً جناب شبلی یا جناب حالی۔ خدا غریق رحمت کرے!

وہ اسٹیج کو شرمناک مزبلہ اور ڈراما کو دیار رام کا قصہ سمجھتے رہے۔ تھیٹر کا نظارہ ان کے لئے باعث تہجین ڈرامانویس ان کے نزدیک عاصی و گنہ گار مجھے نہ معلوم ہوا کہ وہ کیا چاہتے تھے۔ اور ڈراما وہ کس چیز کو سمجھے ہوئے تھے۔ کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر پیش تھا اور وہ منہ پھیرے رہتے۔

ہمارا فرض اک بے اثر نالہ تھا کہ کسی کے کان تک نہ پہنچا۔ اک بیہودہ فریاد تھی کہ کسی نے نہ سنی، دل خون ہوگیا اور اپنی محنت پر رونا پڑا؎

سوختیم و سوزش ما بر کسے ظاہر نشد
چوں چراغان شب مہتاب بیجا سوختیم

اتنا ہی غنیمت تھا کہ تھیٹر ہال کے محدود دائرہ میں اک وقتی ہمہمہ ہو جاتا تھا جس سے ڈرامانویس کی ہمت میں بالیدگی پیدا ہوجاتی تھی۔ اور تعریف ناشناس ہی مرہم زخم جگر ہوجاتی تھی۔

تمہارا تقاضا ہے کہ . . . . . صاحب کے استفسارات کی جانب بہت جلد توجہ کی جائے

میں اپنے نزدیک جوابات سے فارغ ہو چکا کوئی سوال ایسا نہیں ہے جس کا جواب آپ کو پہلے خط میں روانہ کیا گیا ہو

سچ تو یہ ہے کہ مجھے ...... سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پرانی کتابوں سے زیادہ کام لینے میں تحقیقات ذاتی اور درایت پر مدار نہیں ہوتا پھر اس فروگذاشت کا اثر کتاب پر کیوں نہ پڑے۔

(ارادت) آپ فرماتے ہیں جناب ...... صاحب کو مجھ سے ارادت ہے۔ یہ بات قابل تسلیم نہیں انکی ...... شاہد حال ہے ارادت اور ادارت دونوں کا مادہ ایک ہے۔ میرے نزدیک دونوں میں کمی ہے ارادت حقیقی اگر محرک ہو تو حسن کی شاخ قلم پھر ہری ہو جائے

ڈرامانگاری کب شروع کی۔ کیوں شروع کی دستاویز محبت کب لکھی۔ چندراولی کی شان نزول وغیرہ وغیرہ!

یہ سب سوال اول تو مستغنی عن الجواب ہیں اور پھر فی الحال مشت بعد جنگ!

بعض استفسارات کا مکرر جواب

(۱) کسی ڈراما کا کوئی نسخہ مجھ سے نہیں مل سکتا اور یہ محنت میں کیوں کروں۔

(۲) میں نے اپنے ڈراما کو مدون کر کے چھپوایا نہیں۔ نہ مجھے طبع کا اختیار تھا نہ طمع دامنگیر حال۔ اوروں نے مال مسروقہ کی حیثیت بگاڑ کر فائدہ اٹھانا چاہا مگر سوائے اس کے کوئی فائدہ نہ ہوا کہ اصلی ڈرامہ مسخ ہو گئے۔

(۳) میں نے اپنی تصنیفات سے معاوضہ کیا پایا یہ ذرا اخلاق سے گرا ہوا سوال ہے ذاتیات کی بات ہے اور نکتہ یہ ہے کہ معاوضہ پر ڈراما نویس کی کامیابی کا راز دریافت کیا جاتا ہے

(۴) ڈراما نویسی کی ابتدا یا سبب تالیف پہلے لکھ چکا ہوں

تفصیلاً [illegible]

حیثیت التناسخ پیکر جدید میں آتی ہے۔

جذبۂ عشق جو ہر فرد بشر کے لئے حلقہ بگوش آفرینش ہے میں اس عنصر کو امتیازی طور پر اپنے ساتھ لایا تھا دنیا کی فضا میں جہاں حسن کی شعاعیں بکھری ہوئی تھیں قوت متخیلہ کام کرتی رہی۔ بے ستی حسن نے چشمۂ عشق میں غوطے لگانے شروع کئے عالم گہوارہ میں بھی مائل عشق تھا حالانکہ ماہر عشق نہ تھا، فیثاغورث کے لفظوں کی طرح جذب عشق کے معنی نہیں سمجھ سکتا تھا طفلی کا وہ عالم جب نہالچوں پر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے چودھویں رات کے چاند کی طرف ٹکٹکی بندھی ہوتی تھی یا شمع کی لو سے نظر لڑتی تھی۔ خاص مقدمۂ عشق تھا اور حسن پرستی کا پیش خیمہ

حیات عشق پرست کا دوسرا اسٹیج

سیلاب شباب کی طغیانی سمندر کی موجوں سے زیادہ مہیب نظر آئی جس طرح آفتاب و مہتاب یا در شب رو ستارے اپنے محور پر گزرتے ہوئے حسب تقاضائے فطرت عروج و زوال سے دوشادوش ہوتے ہیں اسی طرح ہر انسان منازل ہستی طے کرنے کیونکر پست و بلند سطح حیات کو ناگزیر عبور کرتا ہے نہ کوئی طاقت بشری نظام عالم کو درہم برہم کرسکتی ہے نہ کوئی قوت جبری جذبات صادق میں رکاوٹ ڈال سکتی ہے؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ	باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

نپولین نے جنگ میں، ارسطو نے علم میں، ابن طفیل نے فلسفہ و حکمت میں عشق کو تلاش کیا میرے پیکر میں اک روح حقیر تھی اسکو رنگا رنگ جلوہ ہائے ڈرامہ کے اسٹیج پر وہ چیز دکھائی دی اور میں جذب ہو گیا۔

[illegible] ۱۹۲۲ [illegible]

[illegible]

نذرِ خیام

میخانہ بدوش ہیں گھٹائیں ساقی
پیمانہ فروش ہیں فضائیں ساقی
اک جام پلا کے ہم کو کر دے بے ہوش
غارت گرِ ہوش ہیں ہوائیں ساقی

اختر شیرانی



ساقی

بہارِستان

جلد ۲ — مارچ سنہ ۱۹۲۷ء — نمبر ۳

تحقیقِ قصّۂ پدمنی

(مسلسل)

(از جناب مولانا احتشام الدین صاحب دہلوی ام، اے (علیگ)

فرشتہ کے بیان کیلئے اور تاریخوں کے برخلاف یہ ایک نئی اور دلچسپ روداد تھی مگر غالبًا یہی ایک بیان فرشتہ کا یعنی قصّۂ پدمنی، خسرو، برنی صدر جہاں وغیرہ معلوم و معتبر مورخین سے ماخوذ و ملتقط اور موافق نہیں ہے اور اسی بیان میں حضرت فرشتہ غوطہ کھا گئے ہیں!

لیکن فرشتہ ایسا مورخ ہے جسکی تردید میں مزید دلائل اور قرائن اگر بہم پہنچ سکیں تو ان کو بھی پیش کرنا چاہئے ؛

فرشتہ نے راجہ کے دہلی سے فرار ہونے کو فتح مالوہ اور کپک سردار مغول کے حملہ کے درمیان واقع ہونا تحریر کیا ہے۔ دونوں سنہ ۷۰۵ھ کے واقعات ہیں دو ایک برس کے اندر چتوڑ کے انتظامات کی وہ تبدیلی بھی عمل میں آگئی ہوگی جس کا اس قصہ کے ضمن میں فرشتہ نے ذکر کیا ہے یعنی بادشاہ نے رتن سین کی تاخت و تاراج سے پریشان ہوکر قلعہ کو خضر خاں سے لیکر راجہ مفرور کے خواہرزادہ کو دیدیا ہوگا۔ مگر چتوڑ سے حال میں ایک سنگیں کتبہ سنہ ۷۰۹ھ عہد

علاؤ الدین کا برآمد ہوا ہے جسے ہم نقل کرتے ہیں۔

شہریار جہاں محمد شاہ آفتاب زمان و ظل اللہ

بوالمظفر سکندر ثانی شد مسلم بروجہانبانی

عشر و ذوالحجہ موسم قسبٹلہ سال بدہفصد و نہ از ہجرا

تا بود کعبہ قبلۂ عالم

باد ملک شہنی آدم

اس کتبہ سے ۷۰۹ھ یعنی فتح چتوڑ سے چھ سال اور ہنگامہ کہپک سے ۴ سال بعد تک چتوڑ میں علاؤ الدین کا ہی دور دورہ ثابت ہوتا ہے۔ اگر خیال کیا جائے کہ علاؤ الدین نے ۷۰۳ھ کے بعد چتوڑ کی حکومت خضرخاں سے لیکر رتن سین کے بھانجہ کو دیدی ہوگی، تو مولانا ضیاء برنیؒ کے بیان سے متضاد ہوتا ہے کہ فتوحات علائی کی تکمیل پر جو بروئے خزائن الفتوح ۷۱۱ھ میں مکمل ہوئی ہیں اور بروئے فرشتہ ۷۱۲ھ اور اس کے بعد کے سنین تک جاری رہی ہیں سلطنت کے صوبوں کی تقسیم اس طور پر تھی :۔

گجرات الپخاں ملتان، تاج الملک، دیپالپور غازی ملک، سامانہ ملک آخر بک، دہار واجین عین الملک، جھائیں فخر الملک، چتوڑ۔ ملک ابا محمد چندیری، ملک تمر۔۔۔۔۔

اس تقسیم سے ظاہر ہے کہ کم سے کم ۷۱۱ھ تک تو چتوڑ علاؤ الدین کے قبضہ میں مثل دیگر ولایات کے موجود تھا اور اسکے والی پیشگاہ سلطانی سے مقرر ہوتے تھے خضرخاں سے لیکر اگر چتوڑ کی حکومت کسی کو دی گئی تو وہ ملک ابا محمد کو ملی نہ کہ کسی ہندو رئیس کو! مؤلف تاریخ فیروز شاہی لکھتے ہیں کہ ان صوبہ داروں کے حسن انتظام و قابلیت سے ولایت ممالک پر جارمت بخوبی مضبوط و مستحکم ہوگئیں۔ متمرد اور سرتاب ہر جانب مطیع و منقاد ہو گئے۔ فتنے اور بغاوتیں فضولیات اور خام خیالات دلوں سے محو ہوگئے یعنی ان چیزوں کا نام نہیں رہا۔

برخلاف اس کے فرشتہ لکھتا ہے کہ رتن نے وطن پہنچکر وہ ہاتھ پاؤں نکالے کہ بادشاہ کا دم ناک میں کر دیا۔ اور آخر اسکو حکومت چتوڑ سے دست بردار ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ بیچارہ رتن سین جس کے تیس ہزار طرفدار اور تمام منتخب سردار چتوڑ کے قتل عام میں مارے جاچکے تھے اور اس سرزمین سے سربرآوردگان کا نام و نشان مٹا دیا گیا تھا[1] کھلے میدان میں بادشاہ کے مقابلہ میں کیا ہاتھ پاؤں مار سکا ہوگا۔ جب کہ چتوڑ جیسے مستحکم قلعہ میں اسکی اور اس کے تمام سرداروں کی بادشاہ کے سامنے کچھ پیش نہ گئی تھی عاجز ہوکر اطاعت قبول کرنے اور قدموں میں لوٹ جانے کے سوا چارہ نہ رہا تھا۔

علاؤ الدین آخر عہد میں مستسقی ہوکر فریش ہوجاتا ہے اور انتظامات میں تزلزل نمودار ہوتا ہے۔ مگر حضرت امیر خسرو کی مثنوی خضرخاں اور دولرانی کے مضامین سے مستنبط ہوسکتا ہے کہ بادشاہ کا مریض ہوکر مرجانا اور

[1] بروئے خزائن الفتوح جس کی عبارت نقل ہوچکی ہے

علالت سے موت تک کا زمانہ تین چار مہینے کے اندر اندر طے ہو کر قصہ ختم ہو گیا تھا۔ اس عرصہ میں بقول فرشتہ جیپور نے بغاوت کی اور بادشاہی آدمیوں کو قلعہ سے نیچے پھینک دیا؛" مگر "جے پور" کا اسوقت وجود نہ تھا۔ صدیوں بعد جے پور کی ریاست قایم ہوئی ہے اور شہر جے پور زمانہ حال میں بسایا گیا ہے۔ تو گویا اس نام کو چیتوڑ پڑھنا چاہئے؛ مگر فرشتہ لکھتا ہے کہ چیتوڑ کا ہندو حاکم (رتن سین کا خواہر زادہ) بادشاہ کے آخر عہد تک مطیع و فرمانبردار رہا اور شرائط جاں نثاری بجا لاتا رہا؛ لامحالہ یہ نام جیتور پڑھا جانا چاہئے جو ممالک دکن میں تاحال علاقہ نظام میں موجود ہے اور بڑا فلک فرسا اور وسیع قلعہ بنا ہوا ہے۔ یہ مقام علاؤالدین کے آخری فتوحات میں تھا اور اچھی طرح مستحکم نہیں ہوا تھا۔ فرشتہ صاف طور پر ممالک دکن کے شامل جیتور کا نام لیتا ہے لکھتا ہے کہ: "بادشاہ ملک نائب را نوبت چہارم در سنہ اثنیٰ عشر (۷۱۲ ہجری) روانۂ دکن ساخت داد۔ اکثر بلاد مرہٹ را تا گلبرگہ و مدکل و رائچور مصفا ساخت و آبل و جے پور (صحیح جے تور) و ہور سمند و دیگر ممالک کرناٹک تلنگ را از تصرف راجہا بر آوردہ و قلعہا مفتوح گردانیدہ؛"

علاؤالدین کے عہد کے بالکل ہی آخر ایام میں یہ ایک بغاوت جیتوڑ سے ملتی جلتی ہوئی مگر مزید غور و تحقیق سے وہ بھی دکن کا قصہ ثابت ہوئی۔ پس کیا خیال کرنا چاہئے کہ عہد قطب الدین میں جیتوڑ دہلی کے براہ راست تسلط سے نکل کر راجپوت راجہ کی حکومت وہاں قایم کردی گئی تھی؟ اگرچہ اس حد تک فرشتہ کے بیان کی چھان بین ہمارے حدود سے خارج ہے مگر وہ قصہ ہمارے دائرۂ تحقیق کے اندر ہے کہ قطب الدین مبارک خلجی نے باپ کے تخت پر بیٹھ کر سب سے پہلے عہد علائی کے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ راجہ جیتوڑ بھی اگر اس وقت تک دہلی میں بقید حیات تھا تو وہ بھی ضرور رہا ہو کر اپنے دیس میں واپس پہنچ گیا۔ لیکن اس نے وہاں پہنچکر تاخت و تاراج اپنا پیشہ بنایا ہو اور ملک میں دست اندازی کی ہو۔ اس کا کوئی قرینہ نہیں تمردین کی سرکوبی کے لئے۔ پہلا حملہ مبارک دکن پر ہوا اور ولایت مرہٹ کو جس کے انتظامات علاءالدین کے آخر ایام میں درہم برہم ہو گئے تھے از سر نو فتح کر کے منضبط کیا۔ اور امراء میں بطور جاگیر اس تمام علاقہ کو تقسیم کر کے واپس دہلی آگیا؛" اس کے بعد کوئی بغاوت اس کے ۴ سال ۴ ماہ عہد میں نہیں ہوئی۔ حالانکہ سخت عیاش مدہوش۔ غافل و بے اصول و بے باک تھا لیکن اس عہد کے عقلا اس کے زمانہ کے امن و امان بے خلش و بے خلجان سکون و اطمینان پر حیرت میں تھے کہ باوجود سلطان کی بیہوشی اور بدعقلی کے کہیں کیل کا کھٹکا تک نہیں؛ مسٹر ونسنٹ اسمتھ زمانہ حال کے محقق انگریز مورخ ہیں۔ عہد قطبی میں ہندوستان کی

اسلامی سلطنت کی سب سے زیادہ وسعت تسلیم کرتے ہیں۔ اُنکے پیش کردہ نقشہ سے ثابت ہے کہ ان سے زیادہ تسلط مسلمانوں کو ہندوستان میں عہدِ قطبی سے پیشتر اور اس کے بعد عہدِ اکبر اور اورنگ زیب میں بھی کبھی نصیب نہیں ہوا۔ ادہر تبت میں بادشاہ کا خطبہ و سکہ رائج تھا ادھر دکن میں راس کماری کی عین ناک پر علاؤالدین کی مسجد بنی ہوئی تھی۔ مغرب میں غزنین تک بادشاہ کے فتحنامے پڑھے جاتے تھے۔ اور ادہر بنگال و آسام تک سے اطاعت و فرمانبرداری کے پیغام اور نذرانے آتے تھے۔

الغرض اس عہد میں بھی ایک انچ زمین کا دہلی کے تسلط سے نکلنا باور نہیں کیا جا سکتا۔ تو کیا قطب الدین کے جانشین تغلق اول کے عہد میں جس کو تمام فتوحات علائی گویا وراثت میں دست بدست پہنچی تھیں چتوڑ دہلی کے تسلط سے نکل کر دیسی تسلط میں چلا گیا؟

لیکن تغلق اول کے عمائد و امرا کا چتوڑ میں اولی الامر ہونا ذیل کے کتبہ سے براہ راست ثابت ہے۔ جو چتوڑ کے ہی حوالی سے برآمد ہوا ہے۔

کتبہ کی پہلی سطر کہنگی سے مٹ گئی ہے

خدائے ملک و سلیمان و تاج و تخت و نگیں

چو آفتاب جہاں تاب ملکہ ظل الله

یگانہ ختم سلاطین عصر تغلق شاہ

یہ مصرعہ پھر غائب ہو گیا ہے

سواد مملکت از رائے او مزین باد

ملا ز ملک اسدالدین ارسلان جواد

کہ گشت محکم از و عدل و داد را بنیاد

یہ مصرعہ بھی محو گیا ہے

سہ از جمادی الاولیٰ گزشتہ بالایام

خدا بفضل مرین خیر را قبول کناد

جزائے حسن عمل را یکے ہزار دہاد

کتبہ کے مضمون سے مترشح ہے کہ کسی بنائے خیر و عمارت وقف پر یہ کتبہ لگایا ہے۔ جب تک کسی جگہ کا پورا قبض و تسلط پختہ و دیرپا نہ ہو بیگانہ مقام پر کوئی خیراتی مکان بنانے یا ثواب کے کام کو جاری کرنے کی عموماً جرات نہیں ہو سکتی۔ اس کتبہ سے ظاہر ہے کہ بنظر آیندہ مستقل اور یادگار عمارت کے وہاں تعمیر کرنے میں بانیٔ خیر کو اس قسم کا کوئی خدشہ یا اندیشہ عنانگیر نہیں ہوتا۔ نتیجہ صاف طور پر یہ نکلتا ہے کہ ۷۰۳ھ ہجری میں فتح ہونے کے بعد سے عہد تغلق اول یعنی ۷۲۵ھ ہجری تک مسلسل اسلامی حکومت میں رہتے رہتے چتوڑ اور اس کے نواح پختہ دارالاسلام ہو گئے تھے۔ اسدالدین ارسلان جس کا کتبہ میں نام ہے سلطان کا برادر زادہ تھا اور غالب گمان ہے کہ چتوڑ کا حکمران بنا کر پیشگاہ سلطنت سے بھی گیا ہو گا۔ ”عدل و داد“ کے الفاظ کتبہ میں بول رہے ہیں کہ شخص مذکور عادل و منصف حاکم ہونا اس کا ضروری ہے۔ لہذا حاکم ہونا اس کا ضروری ہے۔ فرشتہ نے ۷۰۵ھ

کے قریب وسط عہد علاؤ الدین میں ہی چتوڑ کے اسلامی تسلط سے نکل کر بدستور راجپوتی اقتدار میں چلا جانا بیان کیا ہے۔ مگر ہم نے دلائل و قرائن نیز مقامی کتبات سے ثابت کر دیا ہے کہ تغلق اول تک چتوڑ نہ صرف اسلامی اقتدار میں بلکہ مسلمان امرائے دہلی کی براہ راست حکومت میں رہا۔ فرشتہ کا یہ بیان قصہ پدمنی کی حکایت کا ضمیمہ تھا۔ خاص قصہ کے اہمال اور لغویتیں پیشتر ثابت کی جا چکی ہیں۔ یہ ضمیمہ بیان جو فرشتہ کی حکایت پدمنی کو اپنی شمولیت سے تاریخی شان بخشتا ہے معتبر تاریخی شہادت، اور کتبات سنگین سے بے بنیاد ثابت ہو جاتا ہے۔ اور سوائے یہ کہنے کے گنجائش باقی نہیں رہتی کہ علاؤ الدین کے قلعہ چتوڑ راجہ کو بخش دینے کے بعد تغلق اول نے شاید دوبارہ فتح کر لیا ہوگا، مگر چتوڑ پر چڑھائی اس کا فتح کرنا ایسا معمولی کا نوالہ نہیں تھا کہ بغیر محاصرۂ طویل آسان فتح ہو جاتا۔ اور تغلق کے مورخ اس کا کچھ تذکرہ نہ کرتے یقیناً بڑی دہوم دھام کی چڑھائی ہوتی۔ عرصہ تک محاصرہ رہتا اور چتوڑ کی فتح ایک جدید کارنامہ ہوتا جو ضرور عہد تغلق کے مفصل بیان میں تاریخ فیروز شاہی ضیا برنی میں جگہ پاتا۔ برخلاف اس کے بادشاہ یا کسی لشکر کا عہد تغلق میں اس سمت جانا بھی فیروز شاہی یا فرشتہ میں مذکور نہیں۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ تغلق ثانی (محمد بن تغلق) کے آخر عہد میں جس طرح اور صوبے آزاد و خود مختار ہو گئے چتوڑ پر دلی کا تسلط مضبوط نہ رہا۔ اول شاید انتظاماً اس نواح کے رئیسوں کے سپرد ہوا بعدہٗ رفتہ رفتہ اُنکے قبضہ میں مستقل ہو گیا۔ یہاں تک کہ اکبر اعظم نے اس کو از سر نو فتح کر کے پھر دلی کی سلطنت میں شامل کیا۔

ویسے بھی کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے کہ سلطان علاؤ الدین نے جہاد و غزا کر کے مسلمانوں کا خون بہا کر، اور قتل عام سے ہندو سرداران علاقہ کا نام و نشان مٹا کر، جو ملک مشہور اور قلعہ نامور بہ نفس نفیس جا کر فتح کیا ہو جو اس کی شہرت سکندری کے کارناموں کی فہرست میں جلی حروف سے لکھا گیا ہو اُسے، ایک پر و دم موش کو ہی (رتن سین مفرور) کی کھڑ بڑ سے گھبرا کر اسی کے بھانجے کے سپرد کر دیا ہو گا۔ اور خود بے دست و پا کر ہو کر بیٹھ گیا ہو گا۔ علاؤ الدین خلجی کے عہد کی تاریخ اور اس کے مزاج کی کیفیت سے جو دیدہ ور واقف ہیں وہ اس کا یقین نہیں کر سکتے نہ یہ آثار و قرائن موجودہ فرشتہ کا یہ بیان یقین کے لایق ہے۔

ہمارا یہ دعوے نہیں کہ فرشتہ میں جو چند سطریں قصہ پدمنی کی لکھی گئی ہیں وہ اس نے خود تصنیف کر لی ہیں۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ اس سے پدماوت مثنوی کی سنی سنائی کہانی کا لب لباب جس قدر اسکی تاریخ کے

معتبر اور یقینی بیانات سے مخالف نہ تھا۔ لکھدیا ہے اور
صحیح و معتبر تاریخ کی روایت سے مخالف و برعکس اجزاء
روایت کی اصلاح کر دی ہے۔ یہی عمل درآمد ہمارے زمانہ
میں کرنل ٹاڈ نے دیسی روایات میواڑ کے ساتھ کیا ہے
مثلاً اسی قصہ کی دیسی روایت میں چتوڑ کی سرپرست
دیوی مجسم ہو کر اثناء محاصرہ میں راجہ کو نظر آتی ہے۔
اس سے گفتگو کرتی ہے اور ایک درجن تاجداروں
کی بھینٹ مانگتی ہے الخ

مورخانہ نظر سے روایت میں اس مہم باطل کا
اشتراک روایت کو اعتبار سے ساقط گردانتا ہے لیکن
کرنل ٹاڈ اس کو نظر انداز کرکے مافوق حکایت کو صحیح
تاریخ کا مرتبہ عنایت کر دیتے ہیں۔ ٹاڈ صاحب نے اس
اصول کی بدولت آخر یہ دن دیکھا کہ جدید دستیاب شدہ
تاریخی مواد اور کتبات کی روشنی میں اُنکی تاریخ کے
بہت سے بیانات غلط اور بے بنیاد محض ثابت ہو چکے
ہیں۔ اور تازہ تحقیقات نے اُن کی تاریخ کو اس تھوڑے
عرصہ ہی میں چھلنی کرکے رکھدیا ہے۔ خود اودے پور ریاست
کے محکمہ تواریخ کے زیر اثر اور زیر نظر جو تاریخ میواڑ لکھی
جاتی ہے اس میں اقرار کیا جاتا ہے کہ کرنل ٹاڈ نے رانا
گڈھ لکھمن سنگھ یا لکھی سی کے عہد میں علاؤ الدین کا حملہ ہونا
لکھکر غلطی کی ہے۔ غلطی بھی تھوڑی نہیں بلکہ سخت
غلطی ہے۔ راناگڈھ لکھمن سنگھ کا عہد تغلق اول سے مطابق
بیٹھتا ہے۔ علاؤ الدین کے حملہ سے تغلق اول تک جو
فصل ہے اس عرصہ میں راول کرن سنگھ یا راناراہپ
اور اُن کے بعد چھ رئیس اور میواڑ کی گدی پر یکے بعد
دیگرے بیٹھ چکتے ہیں۔ ساتویں تھوسنی کے وقت میں
قدیم راجدھانی یعنی چتوڑ مسلمانوں کے تسلط سے واپس
لیا جاتا ہے۔ جدید تحقیقات کے اس نتیجہ کو ماننے میں
ہمیں تامل نہیں۔ بھوسنی کا زمانہ تقریباً تغلق ثانی
کے عہد سے مل جاتا ہے اور یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ
تغلق ثانی کے آخر عہد میں جب کہ دلی کی گرفت دور
و دراز کے صوبوں پر کمزور رہ گئی تھی چتوڑ اور اس کا
علاقہ بھی مثل دیگر دوردست صوبوں کے دلی کے تسلط
سے نکل کر دیسی رئیسوں کے قبضہ میں واپس چلا گیا
کرنل ٹاڈ کا بیان حملہ علاؤ الدین "کھمان راسا"
پر مبنی ہے جس کے متعلق ناظرین پیشتر انہی صفحات
میں کرنل موصوف کا بیان پڑھ چکے ہیں کہ رانا
اودے پور کی پرائیویٹ لائبریری میں ان کو ایک قلمی
کتاب کھمان راسا کے نام سے ملی جس کو وہ لکھتے ہیں
کہ بین طور پر زمانہ حال کی تصنیف ہے۔ مگر اس کے
بیانات قدیم مواد پر مبنی ہیں۔ اور اکبر اعظم کے عہد میں اسکو
از سر نو ترتیب دیا گیا ہے۔" زمانہ حال کی تصنیف کے
زیادہ سے زیادہ یہ معنی لئے جا سکتے ہیں کہ اکبر اعظم کے
عہد میں تصنیف ہوئی۔ اور قدیم مواد پر مبنی ہونے سے
یہ مراد ظاہر ہے کہ مثلاً اس میں علاؤ الدین خلجی کا حملہ
چتوڑ مذکور ہوا ہے جو اکبر سے ڈھائی سو برس پیشتر کا واقعہ

ہے۔ اور اس میں اکبر کے عہد کے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ کتنا صحیح نہیں کہ اکبر کے عہد میں اس کے مضامین کو از سر نو ترتیب دیا گیا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ وہ اکبر کے ہی عہد کی تصنیف ہے۔ اکبر سے شیر شاہ تک جس کے عہد میں مثنوی پدماوت تصنیف ہوئی صرف چند سال کا فاصلہ ہے۔ ۱۵۴۲ء میں شیر شاہ تخت نشین ہوتا ہے۔ اور ۱۵۶۸ء میں اکبر چتوڑ فتح کر لیتا ہے۔ ان سولہ برس میں مثنوی پدماوت کی تصنیف ختم ہو کر اس کی نقلیں زبانی اور تحریری ہندی بولی کے آشنا ممالک اور مخصوص ملک میں قدرتاً اشاعت پا رہی ہونگی۔ کیا یہ قیاس بعید ہے کہ اکبر کے کثیر لشکر کے ساتھ اس تازہ تصنیف کی جو چتوڑ کے ہی ایک قدیم حملہ او تسخیر کا اور اس عہد کی عام فہم ہندی زبان میں ایک دلچسپ قصہ اور حسن و عشق کی داستان ہے۔ کچھ نقلیں تحریری اور روایتیں زبانی چتوڑ نہیں پہنچیں جبکہ یہ معلوم ہے کہ خود اکبر اور اس کے اکثر امرا ہندی سے واقف اس کے قدردان اور ہندی نظم و نثر کے شایق تھے یہ کیونکر ممکن تھا کہ چتوڑ پر حملہ ہو۔ اور پدماوت مثنوی ان قدردانان کو فراموش رہے علاؤالدین کے حملہ چتوڑ کی روئداد اور کیفیت کیونکر چتوڑ کے ارادۂ تسخیر کے ساتھ اسی طرح فاتحین کو لاحق رہی ہوگی جیسے ہمارے زمانہ میں جرمن جنرل برنہارڈی کی کتاب موسومہ "جرمنی اور آئندہ جنگ" کی گزشتہ جنگ عظیم سے پیشتر تلاش اور جستجو تھی کہ ادیشن پر ادیشن اس کا شایع ہوتا تھا۔

(باقی دارد)

غزل

(از حضرت جادو دہلوی)

کوئی جانے جھجکتے ہیں کوئی جانے وہ ڈرتے ہیں
میری تربت پہ کن اٹکھیلیوں سے پاؤں دھرتے ہیں

ہوا چین جبیں پر موج بحر حسن کا عالم
بگڑتے ہیں وہ جتنے ہم سے اتنے ہی سنورتے ہیں

یہ آنکھیں تشنہ خون دلبران محبت ہیں
تمہارے طرفہ آہو ہیں جو شیروں پہ بپھرتے ہیں

کلیجہ چھیدتے ہیں اور اگر پوچھو تو کہتے ہیں
ہمیں کیوں ٹوکتے ہو ہم تو دل میں راہ کرتے ہیں

دیا الزام اس نے مجھ کو اس حیلہ حوالہ سے
تمہارا نام تو جادو ہے ہم جادو سے ڈرتے ہیں

پروازِ خیال

(از جناب مولانا مولوی سید محمد عبد السلام صاحب خیالؔ ٹونکی ام اے (علیگ)

جس روز سے تسکین وہ مجھے دے کے گیا ہے
اس روز سے کچھ دردِ جگر اور سوا ہے

یا شام شبِ وصل تھی، یا صبحِ سیہ روز
اے گردشِ ایام ابھی کیا تھا ابھی کیا ہے؟

وہ، اور مری میت پہ کھڑے پیٹ رہے ہیں
بیداری ہے، یا خواب ہے! اللہ! یہ کیا ہے؟

دنیا جسے کہتی ہے محبت وہ یہی ہے
کوئی کہیں بیٹھا ہوا دل کھینچ رہا ہے۔

اک دن تھا کہ دل دینے کا ارمان تھا ہمکو
اب دل کی جگہ روز اک ارمان نیا ہے

کچھ لوگ مجھے چھوڑ گئے ہیں سرِ منزل
اے بادِ صبا اُن میں سے کوئی بھی ملا ہے

امید بھی، اور اُن کی بندھائی ہوئی امید!
جینے کو دمِ نزع بھی جی چاہ رہا ہے

ناکامیِ الفت کی کوئی حد بھی ہے توبہ
اب رشکِ عدو کا مجھے ارمان ہوا ہے

عشاق کے دل میں نہ جگہ اسکی ہو کیسے؟
ہے تو یہ خیالؔ آپ کا گو لاکھ برا ہے!

زندہ بدست مُردہ

(از جناب مولانا محمد عظمت اللہ خاں صاحب دہلوی، بی۔ اے (علیگ)

(مسلسل)

یہاں ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جدت کی صلاحیت جیسا کہ لوگ اب تک مانتے چلے آئے ہیں خاص لوگوں میں ایک خداداد چیز ہوتی ہے یا یہ صلاحیت ہر فرد میں کم و بیش موجود ہے اور اس صلاحیت کی پرورش اور تربیت کی جا سکتی ہے۔ دوسری صورت اس راقم کی رائے میں صحیح تر معلوم دیتی ہے۔ اسلئے کہ اس میں پہلی صورت بھی شامل ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ ہر کس و ناکس میں یہ صلاحیت موجود ہے تو یہ بات اس امر کے تسلیم کر لینے میں مانع نہیں ہے کہ یہ صلاحیت بدرجہ اتم خاص لوگوں میں خداداد ہوتی ہے۔ ہر شخص میں یہ صلاحیت اپنی بساط بھر موجود ہوتی ہے۔ جن قوموں کا رجحان ترقی کی طرف ہوتا ہے ان میں جدت کی قدر شناسی بہت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب کسی قوم میں ایک چیز کی قدر کی جانے لگے تو ظاہر ہے کہ ان کے ہاں اس چیز کو ابھرنے پھولنے پھلنے کا ہر طرح موقع دیا جائیگا۔ یہی سبب ہے کہ پیش نوردہ قومیں زیادہ مردم خیز سمجھی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ ہر ضرورت اور ہر شعبہ کے لئے ان کے ہاں کام کے آدمیوں کی کمی نہیں ہوتی۔ اگر پھسڈی تورانیوں میں ایک اندھوں میں کانا راجہ، بزرگوں میں جا ملے تو پھر اس کی جگہ لینے کو چراغ لیکر ڈھونڈھنے پر بھی کوئی آدمی نہیں ملتا۔

اوپر جو استدلال گزرا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جدت کرنے کی پہلی اٹل شرط یہ ہے کہ اگلے بڑے لوگ جو کچھ کر گئے ہیں اسکو آنکھیں بند کر کے تسلیم نہ کیا جائے یہ نہ سمجھا جائے کہ بس جو کچھ کرنا تھا وہ یہ بزرگ ہستیاں کر گئیں۔ اب ہمیں صرف ان کہنے کو مردہ بزرگوں کے خیالات کے مطابق کٹ پتلیوں کی طرح ناچنا چاہئے۔ جدت پسندی کی ترنگ جس دماغ میں سمائے اس کے لئے سب سے پہلی اور کٹھن منزل یہ ہے کہ وہ نہایت خلوص قلب کے ساتھ زندہ مردوں کے استبداد سے اپنی روح اپنے دماغ اور اپنے جسم کو آزاد کرے۔ اس بات پر ٹھنڈے دل سے آمادہ ہو جائے کہ ان رفتگاں کی ہر بات کے خلاف سوچ سکے اور سوچنے کے بعد علی الاعلان بزرگوں کی مسلمہ باتوں کے خلاف بولنے لکھنے اور عمل کرنے پر تل جائے۔ جدت

کرنے کا اصلی راز اور مشق کی پہلی سیڑھی یہی ہے۔ اور چونکہ ترقی بغیر جدت کے محض افیونیوں کا خواب ہے، لہذا اگر ترقی کرنی ہے تو ہر شخص اور ہر قوم کو اپنے ہاں کے زندہ مردگاں سے آزادی حاصل کرنی اور اپنے آپ کو محض کٹ پتلیوں کی حیثیت سے نکالکر ایک جیتی جاگتی اپنے برتے پر سوچتی ساچتی روح رکھنے والوں کا گروہ بنانا ضروری ہے۔

انسانی تمدن کے کسی شعبہ کا مطالعہ کیجئے۔ جس عہد کے متعلق آپ کو یہ خیال ہو کہ اسے ترقی کا عہد کہہ سکتے ہیں۔ اس کے اسبابِ ترقی پر غور فرمائیے ترقی کا راز آپ یہی پائیں گے کہ اس عہد کے لوگ اپنے بزرگ رفتگاں کے کنونڈے نہیں ہیں۔ بلکہ صرف اس بات میں انکے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ ان بزرگوں کی طرح مرنے کے بعد اپنی آیندہ بود پر اپنی حکومت بٹھائیں۔

صاحب جدت دماغ — وہ دماغ جو اپنے آپ کو قدامت پسندی یعنی بزرگانِ رفتہ کے استبداد سے نکال چکا ہے۔ وہ مرنے سے پہلے ہی اپنی طرح کے جسم اور روح والوں کو محض کٹ پتلیاں بنا لیتا ہے اور اپنے ارادہ کے تاروں سے جس طرح چاہتا ہے نچاتا ہے لیکن ستم تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد یہ اور بھی بلائے بے درمان کی طرح چھا جاتا ہے۔ اسکی جسمانی زندگی تو ایک حد معین ہوتی ہے۔ لیکن اس مرنے کے بعد کی زندگی کی کوئی حد نہیں۔ بعض زندہ مردے جو بہت ہی زوردار واقع ہوئے ہیں۔ صدہا سال سے چھائے ہوئے ہیں۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب انکا دور دورہ ختم ہوگا۔

اوپر جو استدلال پیش کیا گیا ہے اس کی روشنی میں ادب اردو پر نظر ڈالنی مقصود ہے کیونکہ اردو ادب میں اور بھی بولنے والی دنیا کی زندگی کے اور شعبوں کی طرح مُردوں کا راج۔ نہیں، مُردوں کا استبداد اس حد تک ہے کہ جو لوگ زندہ ہیں ان کی زبان اور اُن کا قلم بزرگ رفتگاں کی محض نفیری بنے ہوئے ہیں۔ جو لفظ، جو خیال اردو زبان والے زندہ لوگ سوچتے ہیں وہ ان مردہ چیرہ دستوں کی شان اور سند کے بغیر معرضِ اظہار میں نہیں آسکتا۔ ہمارے ہاں کا ہر شاعر اور انشاپرداز جب تک اپنے دماغ میں ان زبردست روحوں کی گونج نہ سن لے اس کی نہ زبان کھلتی ہے اور نہ اس کا قلم اٹھتا ہے۔

ہمارا اردو ادب مُردوں کی ایک چھاونی ہے۔ جہاں یہ عجیب پُرلطف بات ہے کہ جو جسم نہیں رکھتے وہ زندہ ہیں اور صاحبِ جسم زندہ لوگوں کے دل و دماغ اور جسم کے ذریعہ اپنی فرمانروائی کر رہے ہیں۔ اگر اردو ادب کو ترقی ہونی ہے تو لازمی ہے کہ ہمارے قلوب اور نفوس پر سے اس مُردوں کی چھاونی کو اٹھایا جائے اور جو جسم والے اربابِ قلم ہیں وہ در اصل زندہ

بن جائیں۔ محض رفتگاں کی نفیری نہ رہیں ۔ اردو نثر کی اول تو بساط ہی کیا۔ اور پھر اس نثر کی ابتدا حسن اتفاق سے اردو شاعری کی طرح مردوں کے استبداد میں نہیں ہوئی۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت اور زمانہ کے بدلتے تیوروں نے اردو نثر کو بہت کچھ سجا لیا۔ لیکن ادب کی جان شاعری ہے اور نثر کی زبان کی لطافت کا معیار بھی وہی زبان فطری طور پر ہوسکتی تھی جس سے اردو شعرا کام لے رہے تھے ۔ اس طرح اردو نثر بھی۔ جہاں تک ادب کے ظاہری پہلو یعنی الفاظ کا تعلق ہے ان اثرات سے نہیں بچ سکی جنہوں نے اردو شاعری کو محض ماضی کی گونج بنا رکھا تھا۔

زمانہ کسی چیز کو ایک حال پر نہیں رہنے دیتا۔ اردو شاعری بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی جو اردو دان دنیا میں اساسی اور دور رس اثرات پیدا کر رہے تھے۔ اور اردو نثر کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق اردو شاعری سے زیادہ وسیع اور آزادانہ آب و ہوا میں ارتقا دے رہے تھے چنانچہ اردو شاعری بھی — وہ کی وہ نہ رہ سکی جو حالی، اکبر سے پہلے تھی اور جس پر دہلی اور لکھنؤ کو اس قدر ناز تھا کہ ان نامور اور انمٹ استادوں کی زبان کو اب تک دہلی اور لکھنؤ میں ٹکسالی نہیں سمجھا جاتا۔

ان نئی روشنی کے شعرا نے بھی ایک حد تک ہی مردوں کے راج سے نجات حاصل کی تھی۔ ان کی زبان بیشتر وہی تھی جو دہلی و لکھنؤ کے اہل زبان بولتے اور لکھتے تھے ۔ خیالات کی تازگی اور انوکھے پن میں بھی صرف اس حد تک تبدیلی جائز رکھی کہ شاعری کو وقت کی ضرورتوں اور بہاؤ سے روشناس کرایا۔ پرانے سانچوں میں ہی نئی روح ڈھالنی چاہی اس تحریک کا ایک بڑا فائدہ اردو ادب کو یہ ہوا کہ محض خالی خولی لفظوں کی ڈھیٹ بندی اور ہتھکنڈوں سے اردو شاعری کو نجات دلوائی لیکن یہ جو کچھ اصلاح ہوئی پوری آزادی —— سچے ادبی سوراج کی ایک ناکافی قسط تھی۔ جس سے اصلی آزادی اتنی ہی دور ہے جتنی برطانوی حکومت کی سیاسی اصلاحات کی قسطوں سے ہندوستانی سوراج کالے کوسوں پرے ہے۔

آزادی خواہ زندگی کے کسی شعبہ میں ہو مردوں کے استبداد سے نکلنے کا نام ہے۔ بادی النظر میں یہ کلیہ دلیرانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کی صداقت ذرا سے غور سے ظاہر ہوسکتی ہے ۔ اس بدنصیب ہندوستان کی سیاسی آزادی کے مسئلہ کو لیجئے۔ ظاہرا تو یہ واقعہ نظر آتا ہے کہ ہندوستان پر ایک پردیسی قوم سوار ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ پردیسی قوم ہم پر کیوں سوار ہے؟ اس کا اصلی جواب یہی ہوسکتا ہے کہ ہم پر مردوں کا راج ایسی روایات عقائد اور رسومات کی صورت میں مسلط ہے ۔ جو بدقسمتی سے اصلی قومی

(نیشنل) اتحاد سے اسی طرح بیر رکھتی ہیں جس طرح آگ کو پانی سے ہے۔

غرض یہ دکھلانا مقصود ہے کہ صحیح آزادی یہ ہے کہ دل و دماغ کو رفتگان کی جبری حکومت سے جہاں تک ہوسکے رہائی دلوائی جائے اور ہندوستانیوں کی زندگی کے جن جن شعبوں میں اس قسم کی آزادی جس حد تک نمودار ہوگی وہاں اور اسی حد تک ہندوستانی اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ زبان اردو ہندوستان میں مختلف لوگوں کے میل کھانے کا پھل ہے۔ اور یہی ایک ایسی دیسی زبان ہے جسکو ہندوستان کی بہت بڑی آبادی بولتی اور سمجھتی ہے اور اسی کو ہندوستانی بولی کا لقب زیب دیتا ہے۔

اردو بولنے والی دنیا کا یہ کتنا بڑا اور شاندار کارنامہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس اپنی بولی کو ہندوستان کی ملکہ بنا دیں۔ اس کو ادائے خیال کا ایسا ہتھیار بنا دیں کہ سارا ہندوستان اس کا لوہا مان جائے اور اس طرح ہندوستانی اتحاد کا ایک زبردست ستون برپا کردیں۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ اردو ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں سے اس قابل ہوجائے کہ اسکی لطافت عمدگی اور وسعت لوگوں کو مجبور کردے کہ وہ اردو کو اپنی عام دیسی زبان بنالیں اس طرح کی وسعت اور لطافت اس وقت پیدا ہوگی کہ اردو ادب جدت سے لبریز ہوجائے۔ اس کے ارباب قلم محض مردوں کی لکیری نہ رہیں۔ بلکہ اپنی جدتوں سے اس اپنے ادب کو مالا مال کردیں حسین اور کارآمد نفیس اور ہمہ گیر کردکھائیں۔

جدت کرنے کا طریقہ اس مضمون میں یہ عرض کیا گیا ہے کہ رفتگان پیشین کے جوئے کو روح اور گردن پر سے اتارا جائے۔ اور اس کی بہترین صورت اور پہلی سیڑھی یہی ہے کہ پرانے خیالات جو ہم پر چھائے ہوئے ہیں ان کے خلاف سوچنے کی عادت ڈالی جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر پرانی بات کے خلاف سوچیں اس پر فریفتہ عمل پیرا بھی ہوجائیں۔ عمل اپنے آپ ہونے لگتا ہے بڑی ضرورت یہ ہے کہ آپ اخلاصمندی اور صداقت سے سوچنے لگیں۔ پرانی روایات یعنی اپنے دل و دماغ والی رفتگان کی آواز کی گونج سے سہمیں نہیں۔

اس موقع پر اردو ادب کے ظاہری پہلو کے متعلق چند ایسی باتیں جو بزرگوں سے چلی آتی ہیں اور جن کے آگے بڑے بڑے زندہ ارباب خاموشی کے ساتھ سر تسلیم خم کردیتے ہیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان باتوں کے خلاف استدلال بھی نذر کیا جائے گا۔ ہمارے رگ و ریشہ اور دل و دماغ میں جو بزرگ فرمانروا ہیں ان سے ڈر ہی لگتا ہے۔ لیکن اور کچھ نہیں ــــ یعنی حضرات قارئین ان کو مانیں نہیں۔ محض بطور تفنن طبع ان کو ملاحظہ فرمائیں۔

سب سے پہلی چیز جو اردو کے پھیلنے کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس کا چھاپہ بہترین حسین اور سستا ہو جائے۔ اردو میں ایسے روزناموں اور رسالوں کی سستی اشاعت ناممکن ہے۔ جو جلد سے جلد اور باتصویر شایع ہوسکیں۔ یا جن میں فن نقاشی اور فن طباعت کے اعلیٰ نمونے پیش کئے جا سکیں یہ ساری خرابی اس وجہ سے ہے کہ اردو داں دنیا کی سمجھ پر پتھر کے چھاپہ نے پتھر ڈال دیئے ہیں۔ یہ دقیانوسی چھاپہ خانہ اردو کے گلے کا طوق بنا ہوا ہے۔ اس سے نجات اسی طرح مل سکتی ہے کہ متحرک ٹائپ کا چھاپہ اردو کے لئے فراہم کیا جائے جو رسم خط اردو داں دنیا نے انتخاب کر رکھا ہے اس کی خاص شان یہ ہے کہ وہ متحرک ٹائپ کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ یا کم از کم اب تک تو نستعلیق نے یہ صورت اس طرح اختیار نہیں کی ہے کہ ٹائپ خوبصورت ہو اور سب سے بڑی بات یہ کہ کوئی عالی دماغ اس کا بہ نستعلیق کی شان کو باقی رکھ کر اس کا ایسا متحرک ٹائپ بنائے جس میں جوڑ کم ہوں اور جو سستے داموں بازار میں آسکے۔ ایسی ایجاد کی توقع ایک مسلمانوں جیسی مفلس اور غیر مردم خیز قوم سے کرنا ظلم ہے۔ جس قوم میں اب تک غزل جیسی بے معنی بے تسلسل صنف سخن میں قابل لوگ مغز پاشی فرمائیں اور سنجیدہ لوگ ان مغز پاشیوں کی آپے سے باہر ہو ہو کر داد دیں اس قوم سے کسی معقول ایجاد کی توقع واقعی ایک صریح ظلم اور ناانصافی کی بات ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کم سے کم چھاپہ کی حد تک نسخ کا ٹائپ اختیار کر لیا جائے نستعلیق دراصل ایران کی جدت طرازی ہے۔ لیکن ایرانیوں نے چھاپہ میں اس اپنے رسم خط کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ ہم اردو والے نہ جانیں کیوں اس خط کے ایرانیوں سے زیادہ دلدادہ ہیں۔ کہ اسکو آنکھوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ نسخ اپنی مقدس زبان عربی کا رسم خط ہے۔ اور مذہبی پہلو سے ہمارے دلوں کو ہلا دینے والا کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوسکتا۔

اب رہی تیسری صورت۔ اس کے سننے کو سنبھل جائیے۔ اور اپنے اندر والے مردہ زندوں کو بھی قابو میں رکھنے کی کوشش فرمائیے۔

اس وقت انگلستان اور امریکہ نے چھاپہ خانے میں بے انتہا ترقی کر لی ہے۔ اور روز نئی نئی سہولتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وہاں اخباروں رسالوں اور کتابوں کی نفاست عمدگی اور ارزانی پر رشک آتا ہے۔ کیوں ہم یہ نہ کریں کہ انگریزی چھاپہ کا رسم خط اردو کے لئے اختیار کر لیں اور نرا اختیار ہی نہ کریں بلکہ اس میں جو نقائص ہیں ان سے پرہیز کریں اپنے ہاں کے حروف ہجا کی بے ضرورت تعداد کو کم کر دیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو اس انگریزی چھاپہ کے حروف کو صوتیات اور اپنی لسانی ضرورتوں

کی روشنی میں ایک مکمل نظام حروف بنالیں۔ اس کے بعد یورپ کی طباعت کے متعلق کل ایجادوں اور سامان سے ہم اسی طرح فائدہ اٹھاسکیں گے۔ جس طرح اس وقت موٹر کی خریداری سے لطف اور فائدہ ہم اٹھا سکتے ہیں۔ اردو ادب اور صحافت میں ایک زبردست انقلاب ہوجائیگا اور بہت سی جھمیلے قضیے اور جھگڑے یک لخت مٹ جائیں گے۔

رسم خط کے بدل دینے سے زبان نہیں بدلتی فرانسیسی اور انگریزی چھاپہ کے حروف ایک ہی ہیں۔ لیکن جو لوگ انگریزی جانتے ہیں۔ وہ فرانسیسی کے ایک لفظ کا صحیح تلفظ نہیں کرسکتے اسی طرح نستعلیق ایرانی رسم خط ہے محض اردو جاننے والے فارسی کی ایک سطر بھی ٹھیک نہیں پڑھ سکتے۔ سمجھنا تو بہت بڑی بات ہے۔ غرض اردو کے ہوا خواہوں کے غور فرمانے کیلئے یہ بھی ایک پرلطف مسئلہ ہے۔ کیا یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ہمارے معزز قارئین ان مسائل پر اس طرح غور فرمائیں گے کہ بزرگ رفتگان کی اندر والی آواز کو استدلال میں کھنڈت نہ ڈالنے دیں۔

اردو نثر اور نظم خصوصاً نظم کے متعلق بہت سی باتیں غور کے لایق ہیں۔ اور ان پر پرلطف بحثیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ ان میدانوں میں بھی حدت کی بیحد گنجایش اور ضرورت ہے۔ یہ مضمون شیطان کی آنت ہوچکا ہے اس لئے اسکو اور طول دینا مناسب نہیں علاوہ اس کے اردو شاعری کے متعلق ایسی باتیں جنکو ایک حدتک جدت کہہ سکتے ہیں رسالہ اردو اورنگ آباد دکن میں یہ آپ کا خادم لکھ بھی چکا ان کا محض دہرانا بھی ٹھیک نہیں۔

بات یہ ہے کہ اب اردو ادب کی ترقی نری قدامت پسندی اور الٹ پھیر کر پرانی باتوں کو دہرانے سے نہیں ہوگی۔ بڑی ضرورت اردو کی دنیا کو ایسے دماغوں کی ہے جو نڈر ہوں اور واقعی اپنے برتے پر سوچتے ہوں جب تک خیال کو آزادی اور نڈر پن پیدا نہ ہوگا ممکن نہیں کہ اردو ادبیات میں ترقی ہو۔ خیال کا بہاؤ زبان کی ظاہری تبدیلیاں اپنے آپ کردیتا ہے۔ اور پرانی باتوں کے دلدادہ حضرات چیختے کے چیختے رہ جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے ابھی اردو بولنے والے نوجوان بے سہارا نہیں سوچ سکتے نئی راہوں پر قدم رکھتے گھبراتے ہیں۔ مردہ زندوں کی آواز سے سہم جاتے ہیں۔ اور اس طرح گو وہ بلحاظ سن وسال اور شکل وشمائل جوان سمجھے جائیں لیکن دراصل وہ کبرسن ہوتے ہیں۔ اسلئے کہ بزرگ مردوں کی محض نفیری ہوتے ہیں۔ بڑھنے والی قوموں میں جوان اور ہی قماش کے ہوتے ہیں۔ وہ نئی نئی باتوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ اپنی زندگیاں جدتوں کے پیچھے وقف کردیتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں جو لوگ نئی پود کو تعلیم دے رہے ہیں ان کا بڑا فرض یہ ہے کہ

ہمارے نوجوانوں کو صحیح معنوں میں جوان طبیعت بنائیں۔ اسی طرح اردو صحافت کا بڑا فرض یہ ہے کہ جدت پسند دماغوں کو چراغ لیکر ڈھونڈھے اور انکی حوصلہ افزائی کرے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر جدت اچھی یا کارآمد نہ ہوگی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر پرانی چیز بھی ہمیشہ کے لئے اچھی اور کارآمد نہیں ہوسکتی۔ ترقی صرف اسی طرح ہوسکتی ہے۔ کہ جدتیں منڈی دل کی طرح اردو دنیا میں ادبی تنقید ان کو پر کھے موافق اور مخالف اسند لال اخلاصمندی یا غیر اخلاصمندی کے ساتھ ان کو جلنچے۔ نثر اور نظم میں نئے نئے تجربے کئے جائیں۔ قدامت پسند بزرگ زندگاں کی زبان بن کر غل مچائیں اور جدت پسند اپنے آپ کو زندہ بنانے کی ترنگ میں اپنی سی کئے جائیں اب دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ پود اس مردانہ راستہ پر چلنے کا حوصلہ رکھتی ہے یا نہیں؟ ـــ اپنے آپ کو مردہ زندوں کے استبداد سے آزاد کرسکتی ہے یا نہیں؟

باقیاتِ فانیؔ

(از جناب مولانا شوکت علیخاں صاحب فانیؔ بی اے۔ ال ال بی (علیگ)

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے
تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

کچھ نہ کہنا وہ کسی مجبورِ خاموشی کا ہائے
وہ جنازہ پر ترا کہنا خفا کیوں ہو گئے

تو مرے دل کی نہ سن یہ آئینہ ہے اس سے پوچھ
تیری صورت آشنا درد آشنا کیوں ہو گئے

کیا تمہیں اندازۂ دردِ محبت ہو گیا
چشمِ بددور، اب ستم حد سے سوا کیوں ہو گئے

دل کی صورت آکے پہلو سے تمہیں جانا نہ تھا
اور گئے بھی تھے تو جانِ بیوفا کیوں ہو گئے

اور فانیؔ بڑھ گئی بیتابیٔ دل بعدِ مرگ
کیا کہیں مر کر گرفتارِ بلا کیوں ہو گئے

(انتخاب از "باقیاتِ فانی")

کلامِ یگانہ

(از حضرت میرزا یاس یگانہ لکھنوی)

سنگ بر نمے تابم دردِ زیستن تنہا — صبحدم چساں بینم شمعِ انجمن تنہا
ہر گلے و ہر خارے فتنہ ہا بر انگیزد — الحذر دلِ حیراں صد بہار و من تنہا
تا کجا امان یابد از ہجومِ جانبازاں — گوشہ گیر فانوسی بہرِ سوختن تنہا
چارۂ پشیمانی خوشدلی و خوشکامی — توبہ از ریا کاراں خندہ ہا ز من تنہا
رہبرانِ خود گم را جز دعا چہ فرمایم — پا شکستہ و حیراں ماندہ در وطن تنہا
اے کہ کارہا کردی مشئے مہیّا کن — تا کجے نہاں دارد عیبِ من کفن تنہا
طرفہ محشرے دارد از فریب فردائے — زندہ زیرِ پیراہن مردہ در کفن تنہا
ذوق میتواں دانست رنگِ حسنِ نادیدہ — ہست شاہدِ عادل بوئے پیرہن تنہا
صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ — داورا نمی زیبد بال و پر بہ من تنہا
ناخدا ز من بگذر سوئے دیگراں بنگر — کارِ من بدریا در دست و پا زدن تنہا

نکتہ دانِ خود سازم میرزا یگانہ را
دل نمے تواں برداشت لذتِ سخن تنہا

آرٹ

(از جناب شیخ عطاء الرحمن صاحب بی اے (آنرز) ال ال بی پلیڈر دہلی)

فطرت اور انسان کے تعلقات بے انتہا ہیں۔ ان میں سے ایک وہ تعلق ہے جسکی وجہ سے قیام زندگی ممکن ہے مثلاً زراعت ہم خوراک حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم اپنی دوسری ضروریات زندگی پورا کرنے کے لئے کارآمد اشیا بناتے ہیں۔ انہیں ضروریات کے حصول میں ہمیں فطرت سے ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے۔ بھوک اور پیاس کے ذریعہ انسان کا رشتہ فطرت سے وابستہ ہے۔ اسی طرح عقل بھی اپنی ضرورت رکھتی ہے عقل اس اصول واحد کی متلاشی ہے جس کے ذریعہ وہ فطرت کے لا انتہا منتشر تعداد واقعات کو ایک اصول کے رشتہ میں منسلک کردے اور ایک اصول ریاضی اور شکل ہندسہ سے تمام منتشر فطرت کو معقول اور قابل فہم بنادے۔

عقل مائل بہ اختصار ہوتی ہے اس کی مثال جراح کی ہے جو علم الابدان کے چند اصول کی مدد سے تمام اجزائے بدن کی تشریح کرسکتا ہے اور لاانتہا جزوی واقعات بدن پر حاوی ہیں۔ تمام علوم عقل انسانی کی جراحت پر مبنی ہیں۔ چنانچہ علم ریاضی لامتناہی تعداد کا اختصار بذریعہ جذر اور اشکال ہندسہ کرتا ہے الہیات سبب کی تلاش میں کوشاں ہے۔ اور تمام عالم کی حقیقت واحد کا متجسس ہے اسی طرح دوسرے علوم اپنے اپنے شعبوں میں اختصار تعداد و تعین اصول میں مصروف ہیں۔ تعقل کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح فطرت ظاہری سمجھ میں آجائے۔

لیکن جذبات ان تمام حدود و مشکلات سے مبرا ہے عقل کے علاوہ انسان ایک اور شخصیت رکھتا ہے جو عقل سے بالکل جدا ہے۔ یہ شخصیت حقیقت اور جذبات انسانی سے متعلق ہے اور اس کے اظہار استغنا کا نتیجہ آرٹ ہے موسیقی اپنی دل آویزی اور نقاشی اپنی رنگینی اسی سے اخذ کرتی ہے۔ یہ شخصیت اپنے استغنا کی وجہ سے نہ کسی قانون کی پابند ہے اور نہ کسی ضرورت یا مقصد تک محدود ہے۔ ایک اور مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ عقل غیر ذاتی ذہنیت در استدلال پر زور دیتی ہے اور آرٹ ذاتی اظہار سے متعلق ہے اور ان جذبات انسانی کی بہترین جلوہ گاہ ہے جن کا اظہار زبان عقل سے ناممکن ہے۔ زبان عقل ہمیشہ خواب و خیال کی طرح سرد اور غیر حقیقی ہوتی ہے۔ زندگی کی تکلیفیں راحت و عیش کو اپنی سرد

اصطلاحوں کے سایہ میں اکثر انکے جذبات کی حقیقت کو برباد کر دیتی ہیں۔ اکثر اخبارات میں لفظ "جنگ" استعمال ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس لفظ کے پڑھنے سے ہمارے جذبات نہیں ابھرتے بلکہ اس لفظ کے پردہ میں جذبات کا ایک ہیبتناک ڈرامہ چھپا ہے جو کسی ڈرامانویس یا کسی شاعر کی شخصیت اپنے استغنا کی حالت میں ظاہر کر سکتا ہے۔ اسی طرح جتنی اصطلاحیں علوم میں استعمال ہوتی ہیں اپنے انتہا غیر ذاتی ہونے کے باعث حقیقت سے دور ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زبان علم خشک اور بے مزہ ہے اور آرٹ تخیل اور جوش جہات سے لبریز ہے ——!

آرٹ کے نتیجہ اظہار استغنا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آرٹ کے پیش نظر کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ آرٹ بیکار ہے۔ پیالہ جب پانی سے لبریز ہو جاتا ہے اور گنجائش نہیں رہتی تو موتی کی لڑی کی طرح پیالے سے باہر گرنے لگتا ہے۔ اور پیالہ اس کے اظہار کو روک نہیں سکتا۔ جب دل میں بے انتہا اور انسان کی ضرورت سے زیادہ درد ہوتا ہے تو میر کی زبان اپنے اظہار کے لئے پسند کرتا ہے۔ ہر وہ شے جو زائد از ضرورت ہو آرٹ سے تعلق رکھتی ہے۔ جو چیز زائد از ضرورت ہوتی ہے اسکے اصراف میں طبیعت غنی اور بے پروا ہوتی ہے۔

باوجود اس کے کہ انسان کی ساری عمر فطرت سے جنگ رہتی ہے اور پھر بھی وہ اس قدر مالدار اور مستغنی ہے کہ اظہار شخصیت کیلئے موقع پا ہی لیتا ہے۔ کیونکہ عقل دور اندیش کا غلام نہیں ہے اسکی مستغنی ذات عقل کی تمام دور اندیشیوں پر حاوی ہے۔ اور اس سے بالاتر ہے۔ عقل تجربہ پر مبنی ہے ہر وقت یہی پڑی رہتی ہے کہ کہیں فطرت ہماری ہستی نابود نہ کر دے۔ حفظ زندگی لازمی ہے۔ مضبوط اور آرام دہ مکانات بنانے چاہئیں۔ خاص ادویات استعمال کرنی چاہئیں۔ غرضکہ عقل کی ہر ایجاد مصلحت، مفاد، اور باکاری پر مبنی ہے۔ لیکن آرٹ مستغنی اور بے پروا ہے۔ اسے ان تمام دور اندیشیوں سے کوئی سروکار نہیں۔ ایک بنیا جو کوڑی کوڑی پر ساری عمر جان دیتا ہے لیکن بیٹا یا بیٹی کے بیاہ پر تھیلیوں کے منہ کھول دیتا ہے نہ یہ خیال کرتا ہے کہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ اور نہ اُسے تعداد کا احساس ہوتا ہے، پاسبان عقل روپوش ہو جاتا ہے اور وہ استغنا کی دولت سے مالامال ہو جاتا ہے۔ آرٹ میں ایسی ہی آزادی کا اظہار ہوتا ہے۔

آرٹ کی جو چیز ہے وہ زائد از ضرورت —— اور بیکار ہے اور انسان کی عظمت اور استغنا کا ثبوت دیتی ہے بلحاظ عقل کیا ضروری ہے کہ کشمیری شال پر حاشیہ اور پھول بھی ہوں یا ... اس کی تراش نہایت خوشنما ہو یا ...

کا ہو اور اس پر زریں نقش و نگار بنے ہوئے ہوں۔ ہماری آواز بولنے اور ضروری بات چیت کرنے سے تعلق رکھتی ہے کیا ضروری ہے کہ بھیرون، بھاگ، درباری، اور کدارا جیسی راگ راگنیوں کے اظہار کا ذریعہ بنے۔ کیا ضروری ہے کہ زبان میر و غالب کے جذبات کو ظاہر کرنے کا آلہ بنے۔ انسان کی انگلیاں جن کا مطلب از روئے فطرت محض گرفت ہے۔ کیا ضروری ہے ——— کہ ستار، سارنگی اور وائلن جیسے ساز بنائے اور انہیں انگلیوں سے ایسا نرم اور دلگداز ترنم پیدا کرے جو بے چین کر دے۔ اور عقل دور اندیش کے پرچے اڑا دے۔ ان میں موسیقی دربار کی موزارٹ (Mozart) بیٹ ہوون (Beethoven) واگنر (Wagner) اور شوبرٹ (Schubert) کو بھلا نہیں سکتے۔ یہی انگلیاں ریفل (Raphael) کی معصوم و فہیم صورت "مریم"، ڈاونچی (　　　) لاجیو کونڈ (　　　) جس کے شدید اور خوفناک نازک ہونٹ کی ترکیب حرکت سے عظیم الشان گناہوں کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ اور اس تصویر کو دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے۔ کہ سارے جہاں کی معصیت اس ظالم عورت کی نشیلی آنکھوں اور شریر مسکراہٹوں میں بھری ہے۔ والاس کوئنز (　　　) کی "جنگ بریڈا" کی خوبی محض صفائی۔ سبک پن اور چستی چالاکی اور شجاعت کا احساس ہے۔ رینالڈز (　　　) کی شخصی تصاویر اور اس کے شاہانہ رنگ ٹرنر (　　　) کے زرد اور سنہری آسمان، ملٹ (　　　) کی دعائے شام جس کے دیکھنے سے ایک عجیب سکوت اور روحانیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے بنگال سکول کے ماہرین مثلاً نندلال بھوس۔ رابندرا ناتھ ٹیگور کی جاپانی اور مغلئی ترکیب اور رنگ ملی ہوئی بے مثال اور پر جذبہ تصاویر غرضیکہ یہ تمام انہیں انگلیوں کے ذریعہ عالم وجود میں لائی گئیں۔ مگر عقل اور قدرت کی رو سے ان انگلیوں کا یہ مقصد نہیں تھا۔

تمام آرٹ ادب نقاشی، شاعری، مصوری ایکٹری وغیرہ استغنا کا ثبوت اور نتیجہ اور طبع انسانی کی سرمایہ داری ہے انسان باوجود اس فطرتی کشمکش اور مصائب کے دوا یہ تنہیں ہے اس کے پاس کچھ نہ کچھ باقی اپنا بچتا ہی ہے وہ محتاج نہیں ہے۔ اور نہ فطرت سے دبنے والا ہے فطرت انسان کو حیوانوں کی طرح مفلوک الحال نہیں بنا سکتی انسان استغنا سے مالا مال ہے۔

فقیر کے گھر میں بھی جا کر دیکھو تو کچھ نہ کچھ زائد از ضرورت ہوگا۔ بٹن خواہ ٹین کا ہی کیوں نہ ہو لیکن پھول اس پر ضرور بنا ہوا ہوگا۔ کپڑا خواہ گاڑھا یا گاڑھے سے بدتر ہی کیوں نہ ہو لیکن تراش نہایت

موزوں اور خوبصورت ہوگی - اتنا ہر حسن انسان کی ذات سے وابستہ ہے - اور فطرت باوجود اپنے مظالم کے انسان کے استغنا کو برباد نہیں کرسکتی''

آرٹ کی تعریف نہایت مشکل ہے چونکہ آرٹ نہایت ذاتی ہے - البتہ اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر وہ شے جو آرٹ سے تعلق رکھتی ہے زائد از ضرورت اور بے کار ہوتی ہے - ایک اور بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ علوم کا تعلق عقل سے ہے لیکن آرٹ کا تعلق قوت کشفیہ سے ہے جسے انگریزی اصطلاح میں کہتے ہیں کسی خوبی کو محسوس کرنے کے لئے آرٹ کو استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی ناظر اور منظر کے درمیان اور کوئی چیز حائل نہیں ہوتی لہذا احساس فوری ہوتا ہے آرٹ کی رو سے حقیقت ہماری ذات سے علیحدہ نہیں جیسا کہ عقل حقیقت کو غیر ذاتی تصور کرتی ہے علم حقیقت کو محسوس نہیں کرسکتا - علم عقل پر مبنی ہے، اور عقل تجربہ پر - اس لئے حقیقت صرف تجربہ ہے یہ نہیں معلوم کہ حقیقت کیا ہے - لیکن آرٹ ہر قدم پر ہم آغوش حقیقت ہے - اور حقیقت تک رسائی آرٹ ہی کے ذریعہ ممکن ہے -

نقش وفا

(جناب پنڈت بیلا رام صاحب وفا ایڈیٹر بھارت لاہور)

فلک کا نہ چھوڑا، زمیں کا نہ چھوڑا — دل عشق خو نے کہیں کا نہ چھوڑا
وہ دنیا کے بھی اب کہاں رہ گئے ہیں — جنہیں لے بتو تم نے دیں کا نہ چھوڑا

قایم رہے دائم رہے یہ حسن کا عالم — دیکھیں نہ کبھی شام جوانی کی سحر آپ
یہ دن بھی مگر میرے مقدر میں لکھے تھے — کرنے لگے راتیں بسر اغیار کے گھر آپ
کیا مر کے بھی اب جینے نہ دیں گے مجھے اعدا — کیوں آئے مری گور پہ با دیدۂ تر آپ

آدمی کام آ ہی جاتا ہے — ہم سے کیجے نہ اجتناب بہت
لیجئے چل کے کچھ وفا سے صلاح — اس نے دیکھے ہیں انقلاب بہت

ترقیِ معکوس

(از جناب محمود اسرائیلی رکن ادارت روزنامہ ہمدرد دہلی)

وہ مشرق جو ازل سے مظہرِ خورشید خاور تھا
غضب ہے انجم مغرب سے اب طالب ضیا کا ہے

وہ گلشن جس کی زیبائی نہ تھی ممنون فصلِ گُل
ستم ہے اُسکے برگ و بار کو شکوہ صبا کا ہے

وہ دریائے کرم عالم کو جو سیراب کرتا تھا
قیامت ہے کہ اب محتاج وہ ابرِ سخا کا ہے

حیاتِ جاوداں مُردوں کو بخشی جس مسیحا نے
وہ اپنے دردِ دل کے واسطے طالب دوا کا ہے

وہ رہبر مشعلِ رہ بنتے تھے نقشِ قدم جسکے
وہ خود گم کردۂ منزل ہے جویا رہنما کا ہے

وہ بحرِ بیکراں اب دشت بے پایاں ہے مُدت سے
مگر چشمِ توہم دیکھتی ہے اس میں طغیانی

پرِ پروانہ جو سایہ فگن تھا جل چکا پہلے
سرِ محفل خجل ہے شمع کے جلوے کی عریانی

بہار باغ کو خود کر دیا تاراج بلبل نے
صبا اب شاخِ بے گل کی کرے گہوارہ جنبانی

ہوا ایوانِ ملت منہدم معمار کے ہاتھوں
ٹپکتی ہے در و دیوار سے اُس کی پریشانی

یقیں کامل، طلب صادق نہ کچھ ذوقِ عمل ہم میں
خسوف کفر میں روپوش ہیں انوارِ ایمانی



مصر کے چند قدیم یادگار مقامات

(از جناب سید حفیظ الدین صاحب ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا)

مصر کا شمار ان چند خاص ممالک میں ہے جہاں کی دلچسپیاں کبھی ختم ہی نہیں ہوتیں۔ بالفاظِ دیگر اگر یوں کہا جائے کہ دنیا بھر میں مصر ہی ایک ایسا ملک ہے جسے اپنے آثار کی قدامت پر فخر حاصل ہے۔ تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ یہ ملک قدیم الایام سے ایک متمدن ملک رہا ہے اور صنعت و حرفت میں جو حیرت انگیز ترقی اس ملک نے قدیم زمانے میں حاصل کی موجودہ زمانے کا کوئی ملک اس پر فوقیت تو کجا اس کی ہمسری کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتا۔ دنیا میں اول اول اگر کہیں کسی باقاعدہ سلطنت کے انعقاد اور سیاسی مجالس کے قیام کا پتہ چلتا ہے تو وہ مصر ہی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بلحاظِ قومیت مصر سب سے قدیم نہ ہو لیکن یہ یقینی امر ہے کہ مصری تاریخ سب سے قدیم تاریخ ہے اور اس اعتبار سے مصر کا درجہ تمام ممالک پر فائق ہے۔

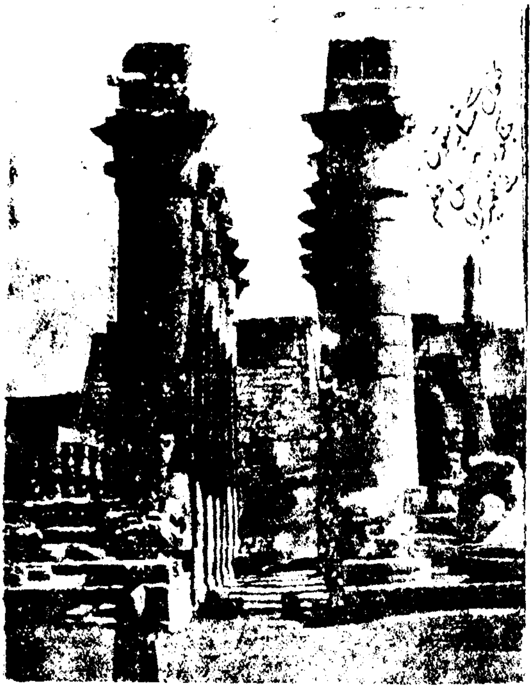
اس نواح کی خوشگوار آب و ہوا۔ اشیاء خوردنی کی افراط اور دیگر ضروریات زندگی کا بآسانی دستیاب ہو جانا۔ ایسے اسباب تھے جنہوں نے اس ملک کو قدیم زمانے سے ہی انسانی آبادی کا اولین مرکز بنا دیا تھا اشیاء خوردنی کی ارزانی کا اندازہ ایک یونانی مورخ ڈایوڈورس کے بیان سے اچھی طرح واضح ہوسکتا ہے۔ جس نے دو ہزار سال قبل مصر کا سفر کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ مصر میں ایک بچے کو سنِ بلوغت تک پرورش کرنے کے لئے ۲۰ درہم سے زیادہ خرچ نہیں ہوتے۔

کثرتِ آبادی اور ارزانی خوراک نے مصر میں مزدوری بھی بہت ارزاں کردی تھی اور مزدوری پیشہ لوگ نہایت کم اجرت پر دستیاب ہوسکتے تھے چنانچہ اہرام مصر جیسی سربفلک اور عظیم الشان عمارتوں

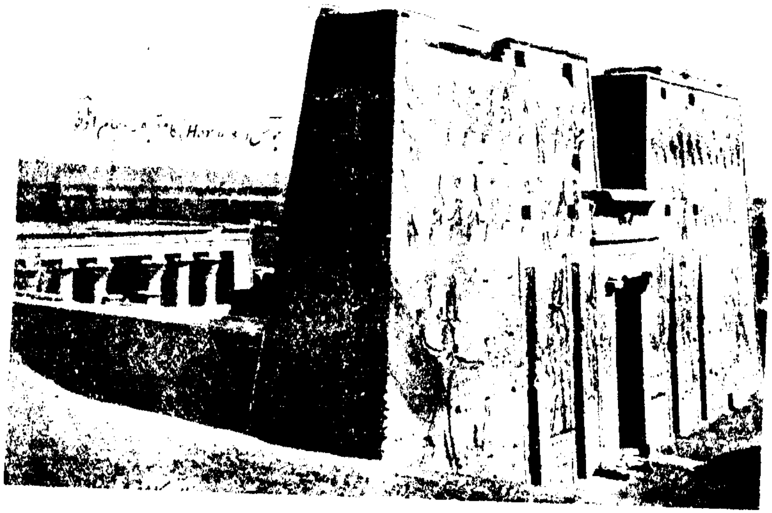
اہرام مصر

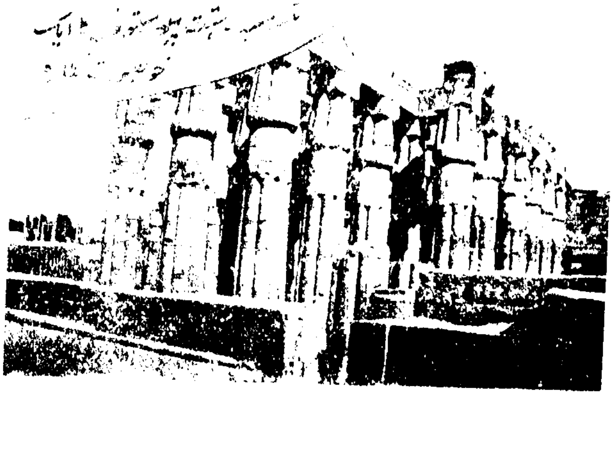
کی تعمیر کا یہی راز ہے۔ یہ مینارے قدیم

۱؎ بیس درہم موجودہ زمانے کے چار ڈالر یا گیارہ روپوں کے برابر ہوتے ہیں۔




لکسر معبد ستونوں کا
ایک اور دلفریب
منظر





مصری تہذیب و تمدن کی ایک زندہ مثال ہیں۔
یوں تو یہ مینار تعداد میں ستر سے بھی زیادہ ہیں لیکن ثمرہ کے تین مینار اپنی عظمت و وسعت کے لحاظ سے بہت بلند پایہ رکھتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مینار ۴۵۰ فٹ بلند ہے اس کا قاعدہ ۷۶۴ فٹ مربع ہے اور بحیثیت مجموعی تیرہ ایکڑ سے زیادہ زمین گھیر رکھی ہے۔ یہ مینار دنیا کی بڑی سے بڑی عمارت سے دوگنا ہے۔ دوسرے مینار کا حجم اس مینار سے نصف ہے اور تیسرا مینار نصف سے کچھ ہی کم۔ ان عمارات کی تعمیر میں نہ تو اہل مصر نے اخراجات ہی کی پرواہ کی اور نہ محنت ہی سے جی چرایا۔ بڑے بڑے پتھر جن کا وزن بعض اوقات پینتالیس ہزار من ہوتا تھا۔ سینکڑوں میلوں سے سلیج گاڑیوں پر لاد لاد کر لائے گئے ایک پتھر کی بابت بتحقیق معلوم ہوا ہے کہ اسے کان سے عمارت تک لانے کے لئے دو ہزار آدمی تین سال تک متواتر کام کرتے رہے۔

مصر کی اکثر قدیم عمارتیں دریائے نیل کے ساتھ ساتھ اوپر کی جانب واقع ہوئی ہیں۔ ذیل کے مضمون میں ہم صرف ان چند عمارتوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو اپنی صنعتی خوبیوں کے لحاظ سے خاص طور پر ممتاز ہیں۔

قاہرہ سے چلیں تو پہلے ایک نہایت وسیع اور شاداب میدان ملتا ہے جس کے ایک جانب کوہ مقاطم کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ دوسری طرف غزہ کے تین عظیم الشان مینار ہیں۔ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ تیسری طرف ذرا بلندی پر سکارا کا مینار دکھائی دیتا ہے اور اس سے نیچے ہی بدرصین واقع ہے۔

اس میدان میں بڑھیں تو جبل طائر پر پہنچ جاتے ہیں جسکی چوٹی پر قدیم زمانے کی ایک قبطی خانقاہ بنی ہوئی ہے اس کے قریب ہی تل العمارنۃ کا میدان واقع ہے یہ میدان کم و بیش دائرے کی شکل میں ہے اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے سلسلے سے گھرا ہوا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں فرعون اخناتن نے ایک جدید

شہر آفتاب

شہر آباد کرکے اسے اپنا دار السلطنت بنایا اور "شہر آفتاب" اس کا نام رکھا تھا۔ یہ بادشاہ پہلے بت پرست تھا۔ مگر اس مذہب کو خیرباد کہہ کر اس نے آفتاب کی پرستش شروع کردی۔ اور شہر طیبہ سے اپنا دار السلطنت نئے شہر میں لے آیا تھا جہاں ایک پرستش گاہ بنوا کر وہ اپنے نئے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کرتا رہا۔ اس مذہب کے اہم مقاصد میں سورج کی پرستش۔ قدرتی مناظر سے دلچسپی اور فارغ البال زندگی بسر کرنا شامل تھا۔

یہ شہر اور مندر پندرہ بیس سال سے زیادہ آباد نہیں رہے کیونکہ اس بادشاہ کے جانشین فرعون تت عنخ آمن نے پھر بت پرستی اختیار کرلی۔ اور اپنے دار السلطنت کو پرانے شہر طیبہ ہی میں لے آیا۔ تل العمارنۃ کے کھنڈرات کو پندرہ سال ہوئے اہل جرمن نے دریافت

کیا تھا اور اخناتن کی ملکہ نیفرتی تی کا ایک نصف مجسمہ بھی وہاں سے برآمد کیا تھا۔ اس کے بعد مزید حفریات ہوتے رہے۔ اور اب قریب قریب تمام شہر دریافت ہو چکا ہے۔ اور مکانات اور سڑکوں اور دیگر عمارات کی عام بناوٹ اور طرز تعمیر واضح طور پر ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

ایک قدیم شہر

رنفس مصر کے نہایت قدیم شہروں میں سے ہے یہاں فرعون رامیس اعظم کے دو شکستہ بت پڑے ہوئے ہیں۔ ان بتوں کی بلند پیشانیاں مغرور آنکھیں، اور منحنی ناک صاف بتا رہے ہیں کہ وہ رامیس کے مجسمے ہیں۔ ان خدوخال کی مطابقت بہ آسانی رامیس کی ممی[1] سے بھی کی جا سکتی ہے۔ جو قاہرہ کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی ہے

چند مقبرے

یہاں سے قریب ہی بدرحینی واقع ہے۔ جہاں شاہ ہوٹپ اور تی کے مقابر بنے ہوئے ہیں۔ ہوٹپ کا مقبرہ حال ہی میں برآمد کیا گیا ہے اور اپنی وسعت کے لحاظ سے مصر میں سب سے بڑا مقبرہ ہے۔ یہاں سفید چونے کی بنی ہوئی ہدسفکس[2] کی ایک نہایت خوبصورت تصویر بھی ہے۔ یہ دونوں مقابر نہایت ہی قدیم زمانے کی یادگار ہیں۔ شاہ ہوٹپ ایک مقتدر سرکاری افسر فراعین مصر کے پانچویں خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ مقبرہ کیا ہے ہوٹپ کی زندگی کا پورا پورا دستور العمل ہے مقبرے کی تمام دیواروں پر تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ کہیں دہاتی لوگ نذرانے لئے آرہے ہیں، کہیں کھیت کاٹتے نظر آتے ہیں۔ کھیت پر سے جانوروں کو ڈرا ڈرا کر اڑا رہے ہیں۔ کہیں شراب کشید ہو رہی ہے، کہیں کشتیاں لڑی جا رہی ہیں۔ کہیں روٹیاں پک رہی ہیں۔ کہیں ناچ گانے کا شغل ہے اور کہیں مویشی چرائے جا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ

شاہ ہوٹپ بہ نفس نفیس یہاں موجود ہے اور کاغذ کی ایک طویل فہرست لئے پڑھ رہا ہے۔ جو غالباً سلطنت کے حساب کتاب سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک خادم اس کے پاؤں کی مالش کر رہا ہے دوسرا اسکے لئے ایک ٹوپی بنا رہا ہے۔ اور تیسرا جواہرات کی پڑتال میں مصروف ہے۔

تی کا مقبرہ بھی ایسے ہی دلچسپ نقوش سے مزین ہے ان مقابر کی تصاویر ایسی واضح۔ زندہ اور اصلیت سے پر معلوم ہوتی ہیں کہ مصر میں اب تک اس سے بہتر صنعت دریافت نہیں ہوئی

مجسمے

بن حسن ایک بلند پہاڑی ہے جس کی چوٹی پر

---

[1] قدیم اہل مصر مردہ اجسام کو مختلف قسم کے مصالح لگا کر گلنے سڑنے سے محفوظ کر لیتے تھے ایسی لاشوں کو ممی ( ) کہتے ہیں یہ مصالح ایسے عجیب تھے کہ مردہ جسم کو کبھی خراب نہیں ہونے دیتے اور ہزارہا سال کے بعد جو لاشیں برآمد ہو رہی ہیں وہ اپنی اصلی حالت میں ہیں۔ یہ مصالح اب کسی کو معلوم نہیں

[2] سفنکس ( ) علم الاصنام میں ایک عجیب الخلقت ہیبت ہے جس کا سر عورت کا اور جسم شیر کا ہے کہتے ہیں کہ جب کوئی مسافر اسکے پاس سے گزرتا ہے تو وہ اس سے عجیب اور مشکل معمے پوچھتی ہے اور جو ان کا صحیح جواب نہیں دے سکتا اسے مار ڈالتی ہے

ایک قدیم چبوترہ بنا ہوا ہے اس چبوترے پہ پہاڑی کو کاٹ کاٹ کر نصف درجن قبریں اور ایک مکان تیار کیا گیا ہے۔ جس کے باہر کی جانب ایک زینہ بھی ہے یہاں دو پہلوانوں کے مجسمے رکھے ہوئے ہیں جن کے اندر بھی اصلیت کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ وہیں ترنج کے درخت کی ایک مصنوعی شاخ بھی بنی ہوئی ہے جس کے دونو جانب دو بارہ سنگے اس طرح ایستادہ کئے گئے ہیں۔ کہ اُنکے اگلے پاؤں شاخ کے اندر جمے ہیں۔ اور منہ نرم نرم کونپلوں کی تلاش میں شاخ کی چوٹی تک پہنچ گئے ہیں ان مقبروں میں ہشت پہلو اور سولہ پہلوؤں والے ستون بھی ہیں ان ستونوں کا تعلق فراعین مصر کے بارہویں خاندان سے ہے جو حضرت مسیح سے دو ہزار تین سو سال قبل مصر پر حکمران تھا۔

خانقاہ

ڈنڈارا کی خانقاہ۔ عمارات میں جس سے دو ہزار سال بعد تعمیر ہوئی۔ یہ خانقاہ نہایت سنگین اور مستحکم بنی ہوئی ہے۔ اور نہایت محفوظ حالت میں ہے بحیثیت مجموعی یہ ایک بھدی سی عمارت ہے جس کے نقش و نگار اور عام بناوٹ میں وہ نفاست اور باریکی نہیں پائی جاتی۔ جو بدر حین اور بنی حسن کی عمارات کو اسقدر ممتاز بناتی ہیں۔ الغرض قدیم زمانے کی خوشنما اور دلفریب طرز تعمیر دیکھنے میں نہیں آتی۔

مصر کا قدیم گورستان

ڈنڈارا کے قریب ہی ابی دوس ایک مشہور مقام واقع ہے جو زمانہ قدیم میں مصر کا عظیم الشان قبرستان تھا کہتے ہیں کہ قدیم مصریوں کا سب سے بڑا دیوتا اوسی رس (Osiris) یہیں دفن کیا گیا تھا۔ مصری علم الاصنام میں اس واقعہ کی تفصیل یوں بیان کی جاتی ہے کہ برائی کے دیوتا ٹائیفون (Typhon) نے اوسی رس کو مار ڈالا اور اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ان کو عام ملک میں منتشر کر دیا۔ اوسی رس کی بیوی آئسس (Isis) نہایت وفادار بی بی تھی۔ اس نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ان ٹکڑوں کو یکجا جمع کرکے ابی دوس کے مقام پر نہایت عزت اور احترام کے ساتھ سپرد خاک کیا۔ یہی وجہ اس مقام کی عظمت کی ہے اور اسی لیے مصر کے معززین اور والیان ملک۔ یہاں مدفون ہونا اپنے لئے عزت اور توقیر کا باعث سمجھتے تھے چنانچہ ان ہی لوگوں کے مقابر اور خانقاہیں اس مقام کی خاص زینت ہیں۔ یہ مقابر دس بارہ میل تک پھیلے ہوئے ہیں ان میں فرعون سیتی اول اور اس کے پوتے رامیس اعظم کے مقبرے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان مقابر پر سفید چونے میں نہایت عجیب و غریب نقش و نگار کھدے ہوئے ہیں۔ جو بہت گہرے تو نہیں لیکن بہت واضح اور صاف ہیں۔ اور ایسے خوبصورت بنے ہیں کہ یونان و اٹلی میں بھی اس پایہ کی صنعت کا ملنا دشوار ہے سیتی کے مقبرے میں نہایت دلچسپ چیز ایک فہرست ہے جس میں ۷۰ فراعین مصر کے نام درج ہیں یہ فہرست ایک

ایک دیوار پر بنی ہوئی ہے اور تاریخ قدیم سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے نہایت ہی قیمتی امداد ہے۔ دوسری عجیب چیز سنگتی کا ایک مرقعہ ہے۔ یہاں وہ حاضر رہا کو پند و نصیحت میں مصروف ہے اور اس کا پوتا جو ابھی بچہ ہی ہے ایک تختی ہاتھ میں لئے اُسکے پیچھے کھڑا ہے تاکہ اگر دادا کہیں بھول جائے تو اسے بتادے

اڈفو کا مقبرہ

اڈفو کا مقبرہ ایک نہایت عالی شان خوبصورت سنگین عمارت ہے۔ مگر باوجود اس استحکام کے نہایت نفیس بنی ہوئی ہے۔ اور اس صنعت نے اس عمارت کو ایک عدیم المثال یادگار بنا دیا ہے۔ اس عمارت کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر طرح مکمل و محفوظ ہے۔ اور زمانہ کی دستبرد اسے کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکی مقبرے کی دیواریں اور اوپر اور نیچے کے زینے۔ تمام دکمال مختلف قسم کی تصاویر اور عبارات سے بھرے پڑے ہیں۔ عبارتوں میں روزانہ عبادات اور نماز وغیرہ کے طریقے اور یادداشتیں درج ہیں ان کا مقصد غالباً یہ تھا کہ سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے یہ عبارتیں ہر وقت ساکنین مقبرہ کے زیر نظر رہیں اور فرائض مذہبی کو فراموش نہ ہونے دیں۔

ایک شاہین

یہ عمارت ہورس کی پرستش کے لئے وقف تھی۔ اور اس میں سب سے عجیب چیز ہورس کا ایک غیر معمولی بڑا شاہین ہے۔ یہ شاہین قریباً ۴ گز طویل ہے اس پر از سرتاپا نہایت نفیس نقش و نگار کھدے ہیں اور آنکھیں ایسی خشمناک ہیں کہ ادھر دیکھنے سے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔

لکسر میں بہت سی قدیم عمارتیں ہیں جنمیں ایک

معبد قدیم

قدیم معبد خاص طور پر ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک وسیع اور دلکشا عمارت ہے جس میں بیشمار ستونوں والا ایک ہال کمرہ اور ایک ستوندار برآمدہ بنا ہوا ہے۔ جو شمالی صحنوں کی طرف چلا گیا ہے۔ داہنی جانب ایک اور ستونوں والی خوبصورت عمارت ہے یہ آئسس (Isis) کی عبادت کیلئے وقف تھی۔ یہ عمارت نہایت خوش وضع اور بہت باترتیب ہے۔ اور طرز تعمیر میں اپنی آپ ہی مثال ہے اس عمارت کو فرعون امن ہوتپ ثالث نے بنوایا تھا لیکن اس کا شمالی حصہ رامیس اعظم کے عہد حکومت میں تعمیر ہوا۔ دروازوں، دیواروں اور ستونوں پر رامیس اور اسکی بیویوں کی تصاویر بنی ہوئی ہیں کہیں گھریلو زندگی کے مناظر دکھائے ہیں کہیں وہ دشمنوں سے برسرپیکار ہے اور کہیں مصروف عبادت نظر آتا ہے الغرض عمارت کا کوئی حصہ ان دلچسپ تصاویر سے خالی نہیں۔

لکسر میں دلچسپی کی دوسری جگہ فرعون توت انخ امن کا مقبرہ ہے اس مقبرے کے حالات اور وہاں سے برآمد شدہ عجائب روزگار اشیا کا مفصل بیان اس شرح و بسط سے اخبارات اور رسائل میں آچکا ہے کہ اسکے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ اس مقبرے کے تفصیلی حالات ہم بھی اپنے دو مضامین میں قلمبند کر چکے ہیں۔ جو بالترتیب رسالہ ہمایوں ...... بابت اکتوبر ۱۹۲۲ء اور "بہارستان" بابت فروری ۱۹۲۶ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

تیتری

(از جناب میاں محمد رفیق حسین صاحب خاور (لاہور))

موجِ صبا پہ ایک منقش حباب ہے ہلکا سا یا فضائے چمن پر سحاب ہے
لیلائے گل کا خیمۂ رنگیں طناب ہے یا شاہدِ بہار کا طرفہ نقاب ہے
دانوں سمیت یا کوئی صیادِ باکمال
دوشِ ہوا پہ ڈال گیا اک نفیس جال

ہے زیورِ عروسِ بہارِ چمن نشیں یا قشقۂ جبینِ پری چہرگانِ چیں
تمغائے زیبِ خلعتِ حورانِ مہ جبیں یا دکمۂ قبائے حسینانِ نازنیں
پُر زور مے ہے رہ نہ سکی جو ایاغ میں
گل نے شگوفہ چھوڑا ہے یا صحنِ باغ میں

ہلکی سی ایک قوسِ قزح ہے سرِ سحاب یا مطربِ بہار کے کاندھے پہ اک رباب
کچھ عرصہ کھیل کود کے اک طفلِ شوخ و شاب بالینِ گل پہ رکھ کے سر اپنا ہے مستِ خواب
یا سوئے ساکنانِ چمن ترکِ کار کا
پروانہ آگیا ہے خدیوِ بہار کا

طیارۂ فضائے گلستاں کہیں اسے پشتارۂ خطوطِ حسیناں کہیں اسے
گہوارۂ مشجرِ طفلاں کہیں اسے سیپارۂ صحیفۂ یزداں کہیں اسے
دوشیزۂ بہار کا اک مستِ خواب ہے
یا نو عروسِ گل کا پریدہ شباب ہے

ننھا سا اک مجسمۂ مستیٔ شباب سرتابہ پا مرقعِ قدرت کا انتخاب
یا زندگی کی مایۂ عشرت ہے جو کتاب اس میں ہے حسن و عشق کا رنگیں ترین باب
تزئینِ فرقِ گل کے لئے ایک شانہ ہے
یا داغہائے عشق کا مجمل فسانہ ہے

حسرتِ تعمیر

(از مسٹر محمد سلیم الحق دہلوی بی، اے علیگ)

یوں تو خیر خدا کا شکر اور احسان ہے۔ کہ میری زندگی خاصے لطف اور آرام سے گذری لیکن وہ چند گھنٹے جو میں نے کئی سال گذرے ملک فرانس میں گذارے تھے اس درجہ مسرت خیز اور ایسے سبق آموز ہیں کہ ہمیشہ میرے دل پر نقش رہیں گے اور کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ وادی جورا، موضع شگنول سے دور صنوبر کے خشک و خزاں رسیدہ غیر مختتم جھنڈ میں واقع اور نواح ایلپس کے تمام دیگر مواضعات و قصبات سے زیادہ سرسبز و شاداب مقام ہے۔ یہاں ہر وقت ایسے دلچسپ اور شاندار مناظر پیش نظر رہتے ہیں جو کبھی کسی دوسری جگہ دیکھنے سننے میں نہیں آئے۔ سلسلہ ایلپس میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جو بالکل چٹیل میدان اور بے برگ و گیاہ ویران پڑے ہیں۔ جہاں کنکروں، پتھروں اور قرمزی سنگلاخ چٹانوں کے سوا سبزی اور ہریاول کا کہیں نام نہیں۔ لیکن یہ وادی وہ جگہ ہے یہاں پہنچ کر یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ بلاشبہ یہ مقام قدرت ایزدی کی صناعی و مصوری کا بہترین منظر ہے اور یہ کہ اس سلسلہ کی چھوٹی چھوٹی صنوبر سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کے لاتناہی سلسلہ میں وہ عمیق و خوش آہنگ نغمہ و ترنم موجود ہے جس کا پہلا مضراب کوئی دم جاتا ہے کہ ان فصیل نما پہاڑیوں میں زور شور سے بجنا شروع ہوگا۔ لیکن ابھی غالباً ان پر عظمت سروں کے تار کھینچے نہیں گئے اور اسی لئے کوئی راگ راگنی پیدا نہیں ہوئی۔

ایلپس کی کنگرہ دار چوٹیاں اس طرح سلسلہ وار پرہ جمائے کھڑی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ متموج و متہیج سمندر کی ہیبت فزا موجیں سطح سمندر سے علیحدہ ہو کر ایک نہایت خاموش اور بسلاست رواں دواں دریا پر دور تک لہراتی چلی گئی ہیں۔ لیکن باوجود اس ہیبت و خوف آفریں حالت کے جورا میں ایک خاص دلفریبی و رعنائی نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہ مضرت رساں اور مہلک طاقتیں جو اس کوہستان کے وسطی سلسلہ میں پائی جاتی ہیں، جورا میں کہیں نام کو بھی نہیں۔ اور نہ جورا کے سرسبز و شاداب میدانوں میں منجمد برف کا کوئی دریا کہر اور پالے کی شدت میں گرد و غبار آلودہ راستوں سے ہوکر بہتا ہے۔ نہ یہاں کسی خراب و مسمار منہدم عمارت کی شکست و ریخت کے انبار اور تودے

اس دیدہ و زیب سرسبز وادی کی خوبی و خوشنمائی میں داغ لگتے ہیں، اور نہ کوئی زرد مٹیالا دریا ان پہاڑیوں میں متلاطم ہوتا اور شور کرتا یا رسعت ہر طرف لہراتا ہوا بہتا ہے۔ بلکہ بخلاف اس کے جو اس کے دریاوں اور نالوں کی سلسلہ وار صاف شفاف سبز موجیں نہایت سلامت اور سلامت روی سے تمام معلوم و معروف مقامات سے گذرتی ہیں۔ ان ساکت اور بے جان و روح صنوبروں کے سایہ تلے ایسے ایسے بہجت افزا اور خوش رنگ پھول کھلے رہتے ہیں کہ خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ اور مجھے تو یاد نہیں کہ دنیا میں پھولوں سے زیادہ کوئی اور مفید مطلب اور کار آمد نعمت میں نے دیکھی ہو۔

جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں بہار کا موسم تھا اور لاتعداد رنگ برنگ کے پھول اپنی رنگینی و بوقلمونی سے اس وادی کو تختۂ ارم بنائے ہوئے تھے بظاہر ان گلہائے رنگ رنگ کو ایک دوسرے سے بیحد محبت تھی۔ اور یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ایک لمحہ بھی ایک دوسرے سے جدا ہو سکیں۔ وادی میں ان سب کے لئے کافی جگہ موجود تھی۔ لیکن محض اس وجہ سے کہ وہ سب باہمدگر قرب و مواصلت کے خواہاں تھے، ان کے سبز سبز پتے نہایت عجیب اور محیر العقول گلبتیوں میں الجھ رہے تھے۔ گویا کہ باہمدگر دست و گریباں تھے، صدہا گل لالہ اپنی ستارہ نما شکلوں میں دور دور تک وادی میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور سماوی ستاروں کی طرح حد نظر سے دور ہو جانے پر دھندلے اور بے نام و نشان ہو جاتے تھے۔ گاؤدیدہ کے تختے کے تختے اس طرح قطار در قطار کھڑے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ماہ مئی کے مسرت آگین دہاتی جلوس نکل رہے ہیں۔ تاریک غار اور ضخیم چٹانیں ان پھولوں سے لدی پڑی تھیں اور ان کے کنارے کنارے رزائی یا لحاف کی مغزی کی مانند عشق پیچاں کی ہلکے انگوری رنگ کی بیلیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں کہیں گل بنفشہ اور گل گاؤزبان لہلہاتے تھے۔ کہیں کھلے کھلے میدانوں میں پالی گیلا مرز یوں کھرنی اور استبری کے خوش رنگ پودے گہرے زرد دلفریب منظر!! میں اتفاقی ٹہلتا ٹہلتا وادی کے ایک سرے پر پہنچ گیا اور یکایک صنوبر کی شاخوں پر خوشنما چڑیوں کے سریلے چہچہوں کے ساتھ ساتھ پہاڑی نالوں کا خوفناک و متین شور میرے کانوں تک پہنچا۔ میرے سامنے وادی کے اس سرے پر قرمزی رنگ کی پہاڑیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ اور ان کی ایک بلند فلک رفعت چوٹی کے قریب ایک شکرہ نہایت متانت و آہستگی سے مصروف پرواز تھا درآنحالیکہ اس کے بازو گویا دامن کوہ سے ٹکرا رہے تھے۔ اور اس کے رنگین پروں پر صنوبر کے پتوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔

اس شکرہ سے قریباً چار سو ہاتھ نیچے سبز رنگ دریا میں صدہا گرداب پڑ رہے تھے۔ ضیاء خورشید سے یہ چمکتا دمکتا دریا نہایت لاپرواہی اور متانت سے موجزن تھا۔

اس وقت اس خاموش سکوت افزا دلفریب منظر کی رنگینی و مسرت آفرینی کے سوا کسی اور متعلقہ دلچسپی کا خیال دل میں آنا محال تھا۔ لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں نے اس پہاڑ اور ان تمام رنگینیوں کے اس قدر بے حس و سرد مہر ہونے کا اصلی سبب دریافت کرنے کی غرض سے صرف ایک ہی منٹ کے لیئے اس منظر کو امریکہ کے کسی سنسان اور وحشت خیز جنگل میں واقع تصور کیا تو دیکھا کہ اس مقام پر جو لمحہ بھر پہلے صدہا دلفریبیوں اور ہزارہا رنگینیوں کا مخرج و منبع تھا۔ ایک خاص بے رونقی اور خاص وحشت و نحوست برسنے لگی چشم زدن میں ان پھولوں کی تمام رنگینی اور اس دریا کا وہ سامع نواز راگ یک قلم مفقود ہوگیا۔ پہاڑیوں پر تکلیف دہ ویرانی چھاگئی۔ تاریک و غیر آباد جنگل پر ایک خاص وحشت طاری ہوگئی۔ اور یہ ظاہر ہونے لگا کہ در حقیقت یہ تمام خوبی و خوش نمائی، اور یہ تمام لطافت و رنگینی محض اس ذی روح ذات کے احساسات و جذبات کے باعث ہے جسے انسان کہتے ہیں۔ اور جو ان تمام بے جان غیر ذی روح اشیا سے بالاتر اور قطعاً غیر ہے۔ اسی ایک لمحہ میں مجھ پر یہ بھی روشن ہوگیا کہ تمام غیر فانی یا دائم التغیر مخلوقات کی ظاہری شان و شوکت زیادہ تر ان ہستیوں کے سبب معرض ظہور میں آتی ہے۔ جن کی یاد بھی (باوجود تصاریف دہر اور مرور زمانہ کی بیرنگیوں کے) ان تمام غیر ذی روح اشیا سے کہیں زیادہ قیمتی اور قابل قدر ہے۔ وہ ہمیشہ کھلنے والے پھول وہ ہمیشہ بہنے والے ندی نالے، سب محض اس لیئے خوش نما اور دلآویز نظر آتے تھے کہ وہ بشری صبر و ضبط انسانی ہمت و جرات اور بشری جوہر و نیکخوئی کے مستقل اور گہرے رنگوں میں رنگ دیئے گئے تھے۔ وہ سیاہ افخم پہاڑیاں جو قریب شام آسمان کی نیلاہٹ کے خلاف ایک خاص لطافت و رنگینی کی مظہر تھیں محض اس لئے ہی قابل وقعت او ر لایق پرستش تھیں کہ ان کا عکس مشرق کی جانب ہاں سے بہت دور جور کی آہنی دیواروں اور کرینین کے ربع مسکوں پر پڑتا تھا۔ اور یہ مقامات نسل انسانی کے ایک خاص مقتدر طبقہ کے مولد و مسکن تھے۔

چونکہ محض فن تعمیر ہی کی بدولت انسان کے دل میں تقدس و تحریم اور نیکی و پارسائی کی لہر دوڑتی رہتی ہے اور چونکہ محض اسی کی بدولت ہم اپنے خیالات و جذبات کو زمانۂ ماضیہ کی طرف منتقل کرتے اور اپنے اپنے اجداد و اسلاف کے کارہائے نمایاں کو

اور جذبات کو زمانۂ ماضیہ کی طرف منتقل کرتے ہیں اور اسلئے یہ فن نہایت وقیع اور باعث صد فخر و افتخار سمجھا جانا چاہئے کیونکہ ہم مکانات و عمارات سے باہر جنگل بیابان میں بھی زندگی گذار سکتے ہیں۔ مکانات سے باہر جنگل ہی میں عبادت و پرستش بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ کہ بغیر کسی عمارت یا کسی قسم کی کسی اور نشانی کے ہم کوئی اگلا پچھلا واقعہ یا حادثہ یاد رکھ سکیں، ناممکن ہے اور بالکل ناممکن! غور کیجئے کہ ساری تاریخ اور تمام کتابیں، اس تاریخ اور ان واقعات کے مقابلہ میں جو کسی زندہ قوم کے افراد نے زیب قرطاس نہ کی ہوں اور جو کسی بے داغ بے لوث سنگ مرمر پر کندہ نہ ہوں کس قدر پھیکی اور بے لطف نظر آتی ہیں میرے خیال میں یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ اہالیان بابل کی تمام تر خواہشات اور تمنائیں زیادہ تر صرف اسی صنف فن کی طرف مائل و مبذول رہیں، کیونکہ انسانی سہو و نسیان اور حافظہ اور یاد کی خرابی کو صرف دو ہی چیزیں دور کر سکتی ہیں۔ اور وہ چیزیں نظم اور عمارات ہیں۔ موخر الذکر میں نظم کا ایک شائبہ موجود ہے۔ لیکن یہ شائبہ اپنی اصل سے بھی زیادہ وقیع اور نہایت اہم ہے۔ ہمیں صرف انہی باتوں کے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں جو ہمارے آباؤ اجداد نے دیکھی یا محسوس کی ہونگی، بلکہ ہمیں ان چیزوں کی بھی احساس کرنا چاہئے جو ہمارے بزرگوں کے ہاتھوں پایۂ اتمام کو پہنچیں ان کے زور بازو سے مکمل اور تمام ہوئیں۔ اور مدت العمر شبانہ روز انکے پیش نظر رہیں۔

ہومر کے زمانہ کے واقعات و حالات پر غفلت کا پردہ پڑا ہوا ہے اور خود اس کا وجود بھی ہدف شک و شبہ ہے لیکن پیریکلیس کے زمانہ کی بابت کہیں شک و شبہ کی گنجایش نہیں۔ اور ہم اس کا حال بمقابلہ ہومر کے زیادہ وثوق اور تیقن سے بتا سکتے ہیں۔ وہ دن کچھ زیادہ دور نہیں جب کہ ہمیں یہ علانیہ اقرار کرنا پڑے کہ ہمیں ملک یونان کا زیادہ تر احوال وہاں کی شکستہ او منہدم عمارات اور سنگیں و پختہ مورتوں اور اصنام کے ذریعہ معلوم ہوا ہے نہ کہ خوش گلو یونانی مغنیوں اور مطربوں یا مشہور دلاور جانبازوں کے خود نوشتہ کارناموں اور گیتوں سے۔ اگر واقعی ہمارے لئے زمانۂ ماسبق کی باتیں اور واقعات یاد رکھنا، یا زمانۂ آئندہ میں اچھے نام سے یاد کیا جانا کسی خاص خوشی یا مسرت و فرحت کا باعث ہو سکتا ہے۔ اور ہے، تو قومی عمارات کی بابت ہمارے صرف دو اہم فرض ہیں جن کی حقیقت و اہمیت کو کسی پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ فرائض کیا ہیں۔

اول تو یہ کہ جتنی عمارتیں موجودہ زمانہ میں تعمیر ہوں سب اس طریق اور اس طرز پر تعمیر کی جائیں کہ وہ سب تاریخی حیثیت رکھنے لگیں۔

دوم یہ کہ زمانۂ سلف کی جتنی عمارات در شکستہ یا صحیح سالم ہمیں کہیں دکھائی دیں ان سب کو ہم ایک بیش بہا اور نادر الوجود ترکہ سمجھ کر مزید ویرانی و بربادی سے محفوظ و مامون کریں۔

ونعمیرِ اماکن ومساکن کو تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے سبب ہی قوت حافظہ کو فنِ تعمیر کا چھٹا کر یا اصول کہا جاتا ہے کیونکہ قومی عمارتیں اور سکونتی مکانات صرف اسی صورت میں مکمل اور حقیقتاً بے عیب کہے جا سکتے ہیں جب کہ وہ سنگین اور مستحکم بنے ہوں، ان کی آرائش وزیبائش معروف تاریخی حیثیت رکھتی ہو اور ان کی عمارت ایسی دیدہ زیب و دلفریب ہو کہ خواہ مخواہ آستان بوسی اور ناصیہ سائی کو دل چاہے لیکن سکونتی مکانات کی بابت تعمیر کنندگاں کے قومی ارادوں اور قدرت تکمیل و تعمیر پر بھی انہی اصولوں کا کہ ہماں قیود اور پابندیوں کے ساتھ اطلاق ہونا ضروری ہے اور اگر یہ مکانات ومساکن ایسے بودے اور کمزور ہوں کہ ایک نسل سے زیادہ کی حفاظت وصیانت نہ کر سکیں تو میرے نزدیک یہ قومی و ملی تنزل وتباہی کی نشانی ہے۔ کیونکہ ہر پاک طینت نیک نفس شخص کے مکان پر وہ خیر و برکت اور وہ تقدس وحرمت چھائی رہتی ہے جو اس مکان کے شکستہ ریختہ آثار پر تعمیر شدہ مکان میں ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال ہے کہ سب نیک نفس پاک طینت انسان اس بات سے بخوبی واقف ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان مکانوں میں بکمال فرح و فرحت اور بہ تمامی جاہ و مراتب سکونت پذیر رہتے کے بعد ان بزرگوں کو اس خیال سے ضرور صدمہ اور قلق ہوتا ہوگا کہ ان کے یہ مکانات جو اتنی مدت تک اُن کے شریک رنج و راحت رہے اور جو ان کی تمام خوشیاں ترقیات مدارج و اعزاز، اور جملہ مصائب و شدائد کے شاہد و ناظر رہ چکے ہیں۔ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی خراب و مسمار کر دیئے جائیں گے۔ ان کو یہ خیال بھی ضرور تکلیف پہنچاتا ہوگا۔ کہ ان کے گوشۂ قبر آباد کرتے ہی، ان مکانات کی کوئی قدر و قیمت نہ رہے گی۔ اور ان کی اولاد کو اس سے کوئی فائدہ یا آرام نہ پہنچ سکے گا۔ یہ بات بھی ضرور ان بزرگ حضرات کے سوہان روح کا باعث ہوتی ہوگی کہ گو عبادت گاہوں اور معابد میں ان کے نام کے پتھر نصب کر دیئے جائیں اور مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے انکی یادگاریں قائم کی جائیں لیکن خود ان کے سکونتی مکانات کوئی عمدہ اور مستقل یادگار پیش نہ کر سکیں گے۔ اور جو چیز انہیں خصوصیت کے ساتھ مقبول اور مرغوب تھی وہی ان کی گمنامی اور محو از یاد ہونے کا باعث ہوگی۔ یہی نہیں بلکہ عوام الناس اور خود ان کی اولاد کو ان مکانوں سے جہاں انہوں نے گرم و سرد عالم سے محفوظ و مصئون رکر با امن و امان زندگی بسر کی ہے، دلی نفرت ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ ایک دن یہ عمارات زمین کے بالکل برابر کر دی جائیں گی۔

میں سمجھتا ہوں ہر بھلے مانس شریف النفس انسان کو یہ باتیں ضرور ناگوار گزرتی ہونگی۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان بزرگوں کی اولاد بھی ان کی طرح نیک نفس دردمند

ہوتو وہ اپنے اماکن و مساکن پر یہ ظلم و ستم ہرگز روا نہ رکھے۔
یہ میں خوب جانتا ہوں کہ اگر انسان انسانوں کیطرح
اوقات بسر کرنے لگے تو یقیناً اس کے مکانات بھی مساجد
و معابد کیطرح مقدس متبرک اور ہمیشہ کیلیئے یادگار و محفوظ
ہو جائیں اور ایسے محفوظ و مامون کہ ان کو ذرا سا بھی
نقصان پہنچانے کی کسی میں جرأت نہ ہو اور ان میں
سکونت پذیر ہونا بھی ہماری ذات و شخصیت کو محترم و
مقدس بناتا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اپنے ہی استفادہ
کیلیئے مکان تعمیر کرنا چاہیے تو یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے
کہ درحقیقت اسے اس مکان سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ
جو فائدہ وہ اس مکان سے حاصل کر سکتا ہے، اور جو
بات اسکے والدین اُسے تلقین کر گئے ہیں اُسے بھی وہ دل
سے بھلا چکا ہے۔ بلاشبہ ایسا شخص اپنے والدین کی عزت
و حرمت یا ان کی جاہ و مرتبت کا صحیح طور پر حامل و پاسدار
نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کے تعمیر کردہ مکانات کی بھی اس
کی اولاد کے دل میں کوئی قدر و منزلت ہوگی، میری نگاہ
میں تو وہ چونے گچی کے پشتے (جو ہمارے دارالخلافہ کے
گرد اگرد اپنے سابقہ ساکنین کی داستانِ حیات زبانِ حال
سے سنا رہے ہیں) لکڑی کے وہ پتلے پتلے نازک اور شکستہ
تختے اور وہ ترشے ہوئے پتھر (جو ادھر اُدھر منتشر پڑے
ہیں) نیز وہ قطار در قطار یکساں طرز کے مکانات (جو
اپنے تعمیر کنندگان کے خیالات و عقاید کے صحیح مظہر ہیں۔
اور جو بے مونس و یار و بیکس و تنہا اپنی اپنی جگہ ایستادہ اور
قایم ہیں) یہ سب کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اور میں ان
سب کو نفرت و حقارت سے دیکھتا ہوں، مجھے ان مکانات
کو دیکھ کر نہ صرف ان کی تباہی و ویرانی کا ہی افسوس
ہوتا ہے، بلکہ میں اس احساس سے بھی کانپ اُٹھتا
ہوں کہ جب اپنے ہی ملک اور اپنی ہی سرزمین میں
ایسی ایسی ناپایدار غیر مستحکم عمارات ایستادہ ہیں تو
یقیناً ہماری ملکی اور قومی عظمت و جبروت اور اسکی
اصل و فروع کو زبردست گھن لگ چکا ہے۔ بلاشبہ یہ
خراب و خستہ عمارات اس عام بے چینی اور افلاس کا
پتہ دیتی ہیں جو وبا کی طرح انگلستان میں پھیل رہا ہے
یہ تمام باتیں اس وقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جب
کہ ہر شخص اپنے فطرتی اور پیدائشی ماحول سے متجاوز ہو کر
کسی اعلیٰ و ارفع ماحول کی تلاش کریگا۔ جب کہ وہ اپنی
گذشتہ زندگی، اور حالات کو نفرت و حقارت سے یاد
کریگا۔ جب کہ ہر شخص صرف اس غرض سے مکان تعمیر کریگا
کہ وہ اپنے بعد مٹی کا ایک کثیر انبار اپنے پیچھے چھوڑ جائے
اور کوئی اس کا نام لیوا پانی دیوا دنیا میں باقی نہ رہے۔
یہ سب باتیں بلاشبہ اس زمانہ کو یاد دلاتی ہیں جبکہ لوگ
ایک دوسرے سے بے خبر اور بے واسطہ ہو جائیں گے
امن و امان، آرام و آسایش اور خیر و برکت اس طرح
اڑ جائینگی جیسے ہوا میں خاک یا بھوسہ، اور غریب
محتاج مزدوروں اور کاریگروں کے چھوٹے چھوٹے مختصر
سے مکان، بدوؤں اور خانہ بدوش صحرائیوں کے خیمہ و خرگاہ

سے بالکل مشابہ ہونے لگیں گے۔ اور فرق اگر ہوا بھی تو صرف اس قدر کہ ان مکان والوں کو خیمہ والوں کی طرح کھلی اور صاف ہوا میسر نہ آسکیگی۔ نہ یہ مکان اس قدر عمدہ اور دلپذیر مقامات پر مل سکیں گے جیسے ڈیرہ خیمہ نصب کرنے کیلئے بآسانی مل جاتے ہیں اور نہ ان مزدوروں کاریگروں کو تشفی یا آرام و آسائش مل سکیگی اور نہ ان کے مکانات ہی مستحکم اور مضبوط ہونگے بلکہ حقیقتاً ان مکانوں میں رہ کر وہ اپنی پیدائشی آزادی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اور جو فرحت و بہجت نقل مکان اور تبدیلی مقام سے حاصل ہوتی ہے اس سے بھی ہمیشہ کیلئے محروم ہو جائیں گے۔

مذکورۂ بالا واقعات کوئی معمولی یا بے نتیجہ بات نہیں، بلکہ حقیقتاً سدہا سنگین، متعدی مہلک اور خوفناک مصائب و شدائد میں سے ایک نہایت عبرتناک مصیبت ہیں۔ کیونکہ جب ہمیں اپنے مکانوں سے محبت نہ رہے۔ اور ہم اپنی دہلیز کو عزیز نہ رکھیں تو ظاہر ہے کہ ہم خدا کے وجود اور اس کے ہر وقت ہر جگہ موجود ہونے کے بھی قائل نہیں رہے۔ خدائے عز وجل نہ صرف سانوں آسمانوں اور جملہ اجرام فلکی کا ہی بادشاہ و مالک ہے بلکہ وہ ہمارے دلوں اور ہمارے مکانوں پر بھی حکمران ہے۔ اور اسی لئے عمدہ مضبوط، پائدار اور خوشنما مکان بنانا نہ صرف آنکھوں کو فرحت اور دل کو سرور و انبساط بخشتا ہے بلکہ حقیقتاً ہمارا محنت، ذوق، کاوش و کاہش، صبر اور ہمانگاہی سے مکان تیار کرانا ----- اور ایسے مکان بنانا جو کم از کم تمام مقامی دلچسپیوں اور خیالات و تمدن وغیرہ کے ہر ممکن الوقوع تغیر و تبدل کے متحمل ہو سکیں ----- ان اخلاقی فرائض میں سے ہے جنہیں صرف اہل بصیرت اور نہایت مدبر و مدمغ اصحاب ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ خیال کہ کوئی مکان عمدہ نہیں کہلایا جا سکتا جب تک کہ وہ نہایت وسیع، عالی شان، فراخ اور کشادہ نہ ہو، موجودہ زمانہ کی ایک مضحکہ خیز بلند پروازی تخیل ہے اور بالکل وہی معنی رکھتی ہے۔ جیسا کہ یہ کہنا کہ وہ تصویر ہی تاریخی تصویر نہیں، جس میں اصلی قد و قامت اور حجم و ضخامت کے انسان یا چیزیں منقوش نہ ہوں۔

بدیں وجوہ میں چاہتا ہوں کہ آیندہ سے ہمارے موجودہ سکونتی مکانات نہایت خوشنما اور مضبوط بنائے جائیں۔ اور اندر باہر سب طرف سے بحد امکان بہترین نقش و نگار اور انتہائی فرحت و بہجت کا مخرج و مصدر ہوا کریں۔ ان مکانات میں ایک دوسرے سے صرف اسی قدر تمیز و تخصیص ہونی چاہئے جتنی کہ تعمیر کنندگان کے عادات و اطوار، ان کے کام اور پیشے اور ایک حد تک ان کی داستان حیات کو بخوبی ظاہر و واضح کرنے کے لائق و مناسب ہو، ان تمام باتوں کا خیال سب سے پہلے تو تعمیر کنندہ کو ہونا چاہئے۔ اور اس کے بعد اس کی اولاد کو بھی اس خیال کی قدر کرنی چاہئے۔ بلکہ بہتر تو یہ

ہو گا کہ ہر مکان میں مختلف اور مناسب مقامات پر کچھ ٹکڑے پتھر کے خالی چھوڑ دیئے جائیں۔ تاکہ ہر نسل اور ہر مقیم اپنی زندگی کے مختصر حالات اور اپنے تمام تجربات و مشاہدات ان پتھروں پر کندہ کرا دے۔ اس طرح میرے خیال میں، ہر عمارت ایک چھوٹی سی مستقل یادگار بن جائے گی۔ اور ایک دیرینہ رسم کو جو بعض ممالک میں اب تک جاری و ساری ہے زیادہ دلچسپ اور مفید سبق آموز بنا دے گی۔ یہ رسم ان چند مخصوص مختصر کلمات سے تعلق رکھتی ہے جو زمانہ ماضی میں ایک محفوظ و مامن مکان بنانے اور اس پر قابض و متصرف رہنے پر نہایت مناسب و شیریں الفاظ میں خدائے رحمٰن و رحیم کی رحمت و عطا کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے ہر تعمیر کنندہ کی زبان یا قلم سے نکلتے تھے۔ اور یہ الفاظ ایسے دلکش اور اس قدر دل آویز ہوتے تھے کہ غالباً اس ناچیز کے تتمہ اور اختتام پر ان کا اعادہ بیجا نہ ہو گا۔ میں یہ عبارت ایک نو تعمیر مکان کے حصہ پیشین سے نقل کرتا ہوں اور یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ مکان اس سرسبز و شاداب میدان میں واقع ہے جو گرینو اللہ سے شروع ہو کر برفِ منجمد دریا تک پھیلا ہوا ہے۔

مسج "م" اور "م۔ ر" نے یہ مکان نہایت طمانیت قلب اور راحت دماغی و جسمانی کے عالم میں تعمیر کرایا۔ اور ہماری دعا ہے کہ خدائے رحیم و کریم ہمیں ہر آفت، خطرہ اور رنج سے مامون و محفوظ رکھے (آمین) نیز دعا ہے کہ خدا اس مکان کو اس وقت تک قایم و سالم رکھے جب تک کہ ہم اس دار الجبر سے گزر کر دار القرار تک نہ پہنچ جائیں۔ وہاں ہمارے پیشرو نیک اور خدا ترس بندگان خدا مقیم و مسکون ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ خدائے بزرگ و برتر بہشت جاودان میں ان سب مقدس روحوں کو دوامی "صبر و سکون" اور "ابدقرار راحت و عیش" کا زریں تاج عطا فرمائے گا۔

(انشاء اللہ تعالیٰ)

تخیلات

(از جناب محمد حمید الحسن صاحب دہلوی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ وکیل)

دور رہ اہلِ کرم سے گر حمیت دل میں ہے — ننگِ خودداری ہے وہ زر جو کفِ سائل میں ہے

رہ نوردانِ طلب کی دیکھ تن آسانیاں — راحتِ منزل خیالِ دوریٔ منزل میں ہے

اک قیامت ہو بپا، ہو رازِ ہستی آشکار
گر میں لے آؤں زباں پر جو کہ میرے دل میں ہے

مجبورِ گناہ

(از ابوالمعالی حضرت مولانا خلیقی دہلوی)

وہ روز آتے ہیں، اور میرا مضحکہ اڑا جاتے ہیں۔

میرے کمالِ موسیقی کی پرکیف تعریف، مگر میرے پیشے کی تضحیک، میرے حسن کی پرشوق مدح، لیکن میری عریانیوں کی طویل مذمت، میرے وفائے جنسی کی پُر از احترام ثنا، مگر میرے ہرجائی ہونے کا تلخ ترین۔ گلہ یہ ان کا روز کا مشغلہ تھا۔

پھر کیا میں ان سے ناراض ہوگئی! نہیں

کیا میں نے کبھی ان کی جسارتوں کو روکا؟ نہیں!

کیوں ——— ؟

ان کے اندازِ خطاب میں کچھ سنجیدگی کی اس طرح آمیزش ہوتی تھی کہ مجھے کچھ بھی کئے نہ بنتا تھا ——— وہ سب کچھ کہتے، اور میں اس لطفِ مجبور سے تباہ ہوتی تھی ———

انہوں نے میری خاموشی کو فریبِ متانت کہا، کیا میں سمجھتی نہیں؟ ——— نہیں ——— سمجھی!

انہوں نے میری تقریرِ شگفتہ کو پیامِ تصنع کہا کیا مجھے اس سے تکلیف نہ ہوئی ——— نہیں ——— ہوئی!

میرے تپاک پذیرائی کو انہوں نے طلسمِ آداب کہا، میں نے سنا، مگر کس طرح ——— ناچار!

میرے حسنِ التفات کو انہوں نے عقدۂ طمع سے تعبیر کیا، میں دیکھا کی مگر ——— کس دل سے۔

——— بہ خاطرِ مجبور ———!

پھر ———؟ حقیقت تو یہ ہے اخلاص کے اس عمل سے میں پریشان تو ضرور ہوتی تھی، مگر ناراض ہو جانے اور سچ مچ بگڑ بیٹھنے کا جذبہ کبھی پیدا نہیں ہوا

——— ہاں حریف نہ بن جایا کریں تو کیا ہی اچھا ہو!!

——— بھری محفل میں جب میری دزدیدہ نگاہوں کا کوئی ہدف ہوا ——— تو وہ بھی منہ پھیر کر پکار اُٹھے "میں بھی"!

——— میں نے اطمینان سے جب کسی کو دومنٹ دیکھا، بس انہوں نے چپکے سے کہہ دیا "اب تو بس کرو"

——— میں نے ذرا فکر و تفحص سے نگاہیں نیچی کیں اور کچھ سوچنے لگی وہ معًا کہہ اُٹھے، خدا کرے "انفعال ہو"

———"

ان کی ان بڑھتی ہوئی بلیغ شوخیوں کو دیکھ کر

——— مجھے انہیں متنبہ کر دینا چاہئے تھا، مجھے انہیں روک دینا چاہئے تھا، وہ میرے رجحاناتِ طبع، اور میلان

خاطر، کو جس جد و جہد کے ساتھ بوجھنا چاہتے، اور پھر اس کے ساتھ ہی کسی خاص سمت کو جو وہ میرے داعیاتِ حیات کا رخ پھیر دینا چاہتے تھے تو مجھے لازم تھا ان کی اس حریفانہ سعی کو فوراً روک ٹوک میں سے آتی! اور یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ میں ہمیشہ ایسے مواقع، تعرض و تھتک پر بگڑ بگڑ بیٹھتی ہوں ——— مگر خدا ہی جانتا ہے، کیوں اول ہی روز سے، ان کے اس استہزائے فصیح سے مانوس ہوتی گئی، اور کبھی جرات نہ ہوئی کہ میں ان سے کہہ دوں "بس صاحب بس" تاہم ایک خلش درونی تھی اور وہ یہ کہ آخر یہ کیا ہے کہ

"وہ روز آتے ہیں، اور میرا مضحکہ اڑا جاتے ہیں"

ہر چند کہ میرے گرد و پیش کے حالات، اور میرے ناز و نعمت کے اہتمامات مجھے اس قسم کی گہری چٹکیوں کے نیل، سہ لینے پر مجبور نہ کرتے تھے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ آہستہ آہستہ، اندر ہی اندر، میں کسی مخفی تحریک سے متاثر ضرور ہو رہی تھی، میری آنکھیں، میرے مضحکہ اڑانے والے کا پرخلوص احترام کرنے لگی تھیں، ہاں کچھ ایسا احترام کرنے لگی تھیں، جو اس سے پہلے کسی کا بھی نہ کر چکی تھیں۔

میرا دل۔ حافظہ کی امداد سے ان کی محبت پذیر باتوں کا، ان سے دور ہو کر بھی لطف اٹھانے لگا تھا، اب تو اس ایک گونہ شکستِ پندار کا بھی احساس کم ہونے لگا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میری خود داری میری جمیل تمکنت اس تذلیل گوارا اس تحقیر منظور کی عادی سی ہو گئی ہے۔

آہ بالضرور میرے اندر اک ایسی قوت پیدا ہو گئی تھی جو مجھے اس قسم کے انداز کلام و طرز خطاب کی جانب مائل کرتی رہتی تھی۔ آہ کسے معلوم ہے کہ "وہ جو روز آتے ہیں اور میرا مضحکہ اڑا جاتے ہیں" وہی میرے اندر ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کر دینے کے ساعی ہیں اور کون ہے جو نہ جان جائے گا کہ ان کی ان حسین کوششوں میں، ان کا کوئی بلیغ مدعا تو پنہاں نہ تھا ———!!

میری حیاتِ رقص و نغمہ، آہ میری ہستی عریاں و رسوا، مجھے تسلیم ہے میرے فطرتی گداز و ترنم کو مسخ و پامال کر چکی میں نے کسب معیشت میں سعی مجبور کی میں نے اکل و شرب کے لئے ناچار قدم بڑھایا، تاہم یہ صحیح ہے کہ میری فطرت اس اقدام سے زخمی ہو گئی اس سے میری شعریت داغدار ہو گئی۔ مگر سہیل اس پند و نصیحت سے فائدہ؟ غالباً تمہیں اعتراف کر لینا پڑے گا، کہ عورت جب پایۂ عصمت سے گر پڑی، پھر ساری عمر وہ سوسائٹی میں سچی عزت کی مستحق نہیں سمجھی جاتی، اس کو اغوا و فریب ہی سہی، لیکن ایک مرتبہ ہی دھوکا کھا لینا ساری عمر کے انفعال و ندامت کیلئے کافی ہے ——— وہ ماں باپ یا خاوند کے گھر سے اگر ایک گھنٹہ بھی بلا طمانیت غائب ہوئی پھر کہیں ٹھکانا نہیں ———"

ہاں یہ کیا کہا "صنوبر! تم حسین ہو اور ایسی حسین
جو مردانہ قوتوں پر صحیح علمداری کر سکو، تم جمیل ہو اور اتنی جمیل
جو کسی پاک خلوت کا سکون، جو کسی معصوم دل کا آرام
بن سکو، تعجب ہے تمہاری سی حسین لڑکی ان آوارگیوں
میں مبتلا رہے۔ حیرت ہے تمہاری جیسی پاکیزہ صورت
اپنے اندر اس قدر تاریکی پوشیدہ رکھے ——"

سہیل بے شک تعجب کرو اور جس قدر چاہو
ملامتیں بھیجو۔ لیکن کیا تم کوئی معقول جواب اس بات کا
دے سکتے ہو کہ ملک کی مسلسل قحط سالیوں، اور اقتصادی
مصائب کے ہاتھوں کوئی شریف گھرانہ تباہ ہو جائے اور
ایسے خاندان کی کوئی لڑکی امتداد زمانہ سے ٹھوکریں کھاتے
کھاتے اس شرافت فروش طبقہ کے ہاتھوں پڑ جائے اور
پھر وہ اسی طبقہ میں حیات رسوا بسر کر دینے پر مجبور ہو۔ اب
یہ علامتیں کہاں تک صحیح ہیں ملک نے تباہ حال خاندانوں
فاقہ نصیب انسانوں کیلئے اپنے کس شریف جذبہ کی آج
تک مستقلاً نمائش کی؟

حکومت نے انسداد فواحشات میں کونسی نمایاں
کارروائی کی شہروں کے بڑے بڑے بازار عصمت فروشی
کے مرکز بنے ہوئے ہیں۔ اور مخفی و پوشیدہ صرف ظاہر بین
نگاہوں سے اوجھل ہزاروں چکلے ہیں جہاں انسانیت
ذبح ہو رہی ہے۔ ان تاریکیوں میں ہزاروں معزز گھرانوں
کی تباہیاں، فلاکت وعسرت کے ہاتھوں روزانہ عزتوں کی
پامالی اور رسوائی سے خوش ہونے والوں کے آگے ڈالی
جاتی ہیں ——!

صنوبر وہ ایک ذلیل لڑکی جس کی خاندانی شرافتیں
مسلم جس کی عزتیں مشہور اگر آج اس ذلیل طبقہ سے
نکلنا بھی چاہے تو بتاؤ سوسائٹی فراخ حوصلگی سے اسکو
قبول کرنے کے واسطے کہاں تک تیار ہے؟

آپ یاد کر لیجئے مجھ سے اپنی ساری عریاں زندگی
میں صرف ایک مرتبہ غلطی ہوئی ہے اور پھر وہ بھی مجبور
—— "اگر میرا حریف میری زار نالی پر ذرا دل دکھا
لیتا —— میری التجاؤں پر ذرا توجہ کر لیتا تو میں ساری
عمر کے لئے عصمت اور عزت کو بچا لیتی" ——
اب نہ مجھے ماں باپ کا گھر قبول کر سکتا ہے، اور نہ اشتراک
جنسی کیلئے کوئی عزت حاصل ہو سکتی ہے۔ سہیل میری روح
تاریک نہیں ہے۔ میری حسیات مردہ نہیں ہیں۔ مجھے نہ
ستاؤ، مجھے نہ چھیڑو، مجھے زیادہ ذلیل نہ کرو ——
ہاں میں تمہارے شریفانہ جذبات سے اپیل کرتی ہوں کہ
اگر مرد ہو تو ہندوستان کے تباہ حال گھرانوں کو نکہت و
فلاکت کی اس آخری ذلت تک پہنچنے سے بچا لو، ہمارے
ملک کی روزانہ مالی نزاکتوں اور اقتصادی مشکلوں نے
ہماری عفیفہ اور باعصمت بچیوں کی عزت پر بربادی ہے
یہ فواحشات کی کثرت اور زنا وحرام کے مخصوص مقامات کی
بے رونق، اور خفیہ آوارگیوں کی یہ زیادتیاں آخر کب تک تمہاری
توجہ کو اپنی جانب نہ مائل کر سکیں گی"! اب زیادہ دم نہیں
تم ملک کی اس تکلیف، اپنے معاشرت کے اس زخم سے

اغماض کرو اس کے بعد اگر عزت کی وہی نگاہ ہے میرے واسطے مخصوص کر سکتے ہو جو اک باعصمت خاتون کا حق ہے۔ تو آؤ میرا ہاتھ پکڑ لو، مجھے رقص و نغمہ کی زندگی سے اٹھا لو، مجھے بوالہوسوں کے حسن سلوک اور فریب مطامع سے بچا لو۔ میرے حسن کو نمائش مذموم کی عادت ثانیہ سے سبکدوشی بخشو، عورت ہاں ممثل حجاب ہے اس کی فطرت بدل نہیں جاتی، ایک ذرا سا سہارا دو وہ پھر تجدید عہد کرتی ہے۔ اس کو موقع دو کہ وہ وعدہ کی شان ایفا پھر پیش کر سکے۔

سہیل اگر چاہتے ہو تو صنوبر کو، جس کا اصل نام صغریٰ ہے تم ذرا سی امداد میں اسکو قعر ذلت سے نکالکر عزت و فراغت کی بلند ترین جگہ پر بٹھا سکتے ہو،"

محبت و پرستاری کا مفہوم تو میں نہیں جانتی طاعت و بندگی کے اسباب سے ہاں میرا سینہ معمور ہے کیا تم اس کو، اس متاع حقیر کو خرید لوگے؟

فخر جنسی، اور غرور فطرت مجھ سے میری قسمت نے لے لیا ہے، اگر تم چاہو تو زخمی دل اور منفعل جبات پیش کر سکتی ہوں۔

اقتدار محبت اور دل پر حکمرانی میں اب نہ کر سکونگی مگر ساری عمر کیلئے اشکبار آنکھوں کی سنت موجود ہے۔ اور خجلت آثار جبیں کے سجدے، میرے پاس سے ابھی کہیں نہیں گئے ——" کچھ کہو، کچھ فیصلہ کرو، خدا کے واسطے مجھے یہ کہنے کے قابل بنائے رکھو کہ —— "

"وہ روز آتے ہیں، اور میرا مضحکہ اڑا جاتے ہیں"

یہ تفصیل تھی اس اختصار کی، جس کا اختصار میری اس تفصیل کا محتاج نہیں جب کہ میں اس اخلاص عمیق کا اس آزمائش عظیم کا چار سال مسلسل مقابلہ اور مطالعہ کرتی رہی" اور وہ آہ

"روز آتے ہیں، اور میرا مضحکہ اڑا جاتے ہیں"

آپ یقین کیجئے، اب مجھ میں اس مذاق کی برداشت کی زیادہ قوت نہ تھی اس قدر بسیط امتحان کے بعد کچھ اور دنوں میں مزید آزمائشوں کیلئے آمادہ نہ تھی، جب کہ ایک روز شام کو وہ آئے، اور میرے خیالات میں ایک طوفانی تموج پیدا ہو گیا۔ میں بخار میں مبتلا تھی۔ ان کی عیادت، آہ بیماری - سے آگاہ، جتنی کہ عیادت ستم برپا کر گئی۔ جبکہ میرے آنسوؤں کی فراوانی نے ان کو بیتاب الم کر دیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئے۔ خادمہ چلی گئی۔ سب لوگ ہٹ گئے میں نے کہا سہیل —— یہ چار سال کے مصارف کی مسلسل برداشت اور یہ بے غرضانہ سلوک، اخلاص آخر اپنی ضیاعت کی کوئی غرض بھی رکھتا ہے؟

بوالہوسوں کے انداز صرف سے ہمیشہ تم نے بلندی دکھائی اور اس مکان کی مالک بڑی بی سے کبھی تم نے وہ نہ کہا —— جو ظہور کہتا ہے —— "

اچھا پھر آسان تھا اور اسی میں میری مسرتیں بھی پنہاں تھیں۔ کہ کہدیتے شائد تم مجھے نگہ لطف سے دیکھتے ہو" لیکن آہ میری نظروں کا آشیانہ یوں بھی تاراج

ناکامی ہی رہا۔ ——— پھر بتاؤ تم کو اس طرح جینے میں کیا لطف ہے۔ اور میرے مرجانے میں اب کیا روک ہے؟

یہ حقیقت ہے ہذیان نہ کہو، یہ پیغام موت ہے اسکو بخار نہ سمجھو، کاش اس آخری لمحۂ حیات میں تم مجھے اپنی پاک محبت کا پیغام دے سکتے۔ آہ ——— دیدیتے"

بخار کی شدت اور ضعف نے مجھے بیہوش کردیا اور نہیں معلوم ہے کب تک بیہوش رہی ———

مگر ہوش میں آنے کے بعد پہلے جس خواب کو میں نے دیکھا یہ تھا کہ سہیل نہایت مضطرب و پریشان میری مسہری کے پائین میں بیٹھے ہیں۔ اور میرے پیروں پر ان کا سر ہے۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں ——— تاکہ بیداری کی پہلے توثیق ہوجائے۔ آہ فرشتہ نے گنہگار عورت کے دونوں پاؤں چشمۂ کوثر کے سے پانی کے قطروں، آہ، اپنے پاک آنسوؤں سے تر کر دیئے۔ مجھے ایک برقی اضطراب نے اٹھا کر بٹھا دیا۔ اور میری آغوش سنبرحم انداز کے ساتھ وا ہوگئی ———" دنیا شاید نہیں جانتی کہ محبت کا خمیر آنسوؤں کے پانی سے گوندھا گیا ہے"

میرے کان اس تقریر کی لذت سے اب تک سرشار ہیں۔ اور میری حالت اس اعلان شرافت کی شاہد موجود جو اس وقت سہیل کے انقلاب عمل سے پیدا ہو کر رہ گیا۔

صنوبر! پاک خیال صنوبر، مجسمۂ حسن و شرافت صنوبر، تم ماں باپ کی صغرٰی، اپنے پرستار کی صنوبر!!

تم، باور کرو، میں تمہارے واسطے جہاد کرتا ہوں۔ اور اپنی لازوال محبت کا اعلان، مجھے تسلیم ہے سوسائٹی بھی فرضی عزتوں کے گورکھ دھندے میں مبتلا ہے اسکے ہاں اصلاح مفاسد کی عملی تدبیر مذموم ہے! تاہم مجھے پروا نہیں، یہ چار سال کی خاموشی۔ اور یہ صرف جائز اس بنا پر روا رکھا کہ میں تمہارے کیریکٹر کا مطالعہ کرلوں۔ اور زیر باری اس واسطے کہ تم پر فریب طمع کے ہاتھوں جو مصیبتیں نازل ہونی ہیں ان سے محفوظ رہ سکو۔

شکر ہے، تمہاری دلپذیر صورت نے جو نقش قایم کیا تھا اس کو تمہاری جمیل سیرت نے اور مستحکم اور گہرا کردیا۔

میں ملک کے ان لفظی اصلاح کی چیخ و پکار کرنے والوں کے سامنے تمہارے الفاظ کے ساتھ اپیل کروں گا کہ وہ خدارا بیدار ہوں۔ اور ہماری معاشرتی تلخیوں عسرت و فلاکت سے تباہ ہونے والوں کی حالت پر متوجہ ہوں۔ ایک عالمگیر بیت المال کی طرح ڈالنا چاہیئے کثرت سے دار الیتامیٰ ہونے چاہئیں اور ہر وقت امداد دینے کے بہت سے انتظامات، جس نے نکبت و عسرت ہماری قوم سے دور ہو۔ فلاکت و فاقہ زدگی سے جو مصیبتوں کا ارتکاب انسان سے ممکن ہے اس سے قوم محفوظ رہ سکے مرد، آزاد مرد، جو بے حس، اور بعض مواقع در دیہ حقیقتاً زندہ ثابت ہوتا ہے، خدارا سوسائٹی کے نظام امن کو درہم برہم نہ کرے، وہ نہیں جانتا کہ اس کی شیطنت اسکی سیہ مستی۔ اس کی معصیت، اس کا فریب جنس نازک کے

حق میں بعض اوقات کیسا ناقابل تلافی ظلم ثابت ہوتا ہے علی الخصوص اس کی وہ ابلیسانہ جسارت جب کہ وہ حسن نسائیت کے برباد کر دینے پر جری ہو جائے!

آہ عورت ایک مرتبہ بہک جانے سے پھر کسی قابل نہیں رہتی!

اور مرد، اے نابکار مرد، تو روز مشغول معصیت رہے اور پھر سوسائٹی تجھے اپنے میں سے باہر نہیں نکالتی۔

اس کمزوری اس احتساب نفس سے احتراز سے ایک جنس فائدہ اٹھائے، اور دوسری جنس، رسوائیوں، ذلتوں اور مصیبتوں کی زندگی بسر کرے۔ شرم شرم!!

صنوبرا پیاری صغرا! میری جانب سے تیرے واسطے وہی عزتیں ہیں جو پاک دامنوں کا حصہ ہیں۔ میرا دل اور اسکی محبت پختہ پیمان وفا کے ساتھ تیرے حضور پیش ہے تو قبول کر تو نے جہاد علی النفس کیا ہے۔ تو نے مرد کے مظالم کی پاداش میں مصیبتیں جھیلی ہیں۔ تو نے سوسائٹی کی غفلت سے درندوں میں عمر بسر کی ہے۔ تو نے ملک کی مشہور زدہ جس آبادی کو پیغام توجہ دے دیا ہے۔ تو نے گنہگار طبقہ میں رہکر اس شے کی حفاظت کی، جس کی حفاظت پر تو قطعاً قادر نہ تھی۔

سترہ سال کی نازنین عمر میں، تنہا جس مضبوط کیرکٹر کا تو نے نمونہ پیش کیا ہے آج وہ ستر سال کے معمر مرد سے ناممکن ہے۔

ہیں تیرا وہ راز جو مخصوص نباہی کے ہاتھوں تیرے خاندان سے وابستہ ہو گیا ہے، ہاں ہیں ایک خاندان کی وہ رسوائی جو ان کی لڑکی کے چھ سال کی عمر میں غائب ہو جانے سے تیرا بھید بن گئی ہے۔ کبھی کسی پر ظاہر نہ کرونگا ———— صنوبر اس وقت میرا وعدہ تو اپنی تشفی کا ذریعہ بنا، بہت جلد میں اور تو وہ ہونگے، جس کا مجھ کو اور تجھ کو اشتیاق ہے، ————"

میں محبت کیساتھ تیرا احترام کرتا ہوں ————"

اور ہمیشہ کروں گا۔

کیفیات

(پنڈت سوہن لال صاحب ساحر بی۔ اے اسسٹنٹ ایڈیٹر "دھیتیم" لاہور)

ہو نہ ہو کچھ ان کو راز زندگی معلوم ہے
مسکراتی ہیں امیدیں مجھکو بیدل دیکھ کر

جستجو میں کیوں نگاہ شوق آوارہ رہے
خود کھنچے آتے ہیں جلوے جذب کامل دیکھ کر

وہ بھی دن تھے ہر قدم پر منزل آتی تھی نظر
اب یہ صورت ہے پلٹ آتا ہوں منزل دیکھ کر

اب میری بیچارگی منت کش درماں نہیں
مسکرا دیتا ہوں اب مشکل کو مشکل دیکھ کر

زندگی خاموش ہے ٹوٹا پڑا ہے ساز عشق
دل تڑپ اٹھتا ہے یہ سامان محفل دیکھ کر

مسکراتی آرہی ہے پھر کوئی تازہ امید
سر د آہوں کو دعا کیساتھ شامل دیکھ کر

خدا

مسلسل

(اٹلی کے نامور فیلسوف جوزف میزینی کی کتاب "فرائض انسان" سے)

مترجمہ

(جناب صاحبزادہ محمد سعید خاں صاحب شوق (علیگ) جائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "ہمدرد")

پروٹسٹنٹ (ایک عیسائی فرقہ کا نام ہے) کے عقیدہ کے اصول کے متعلق مبالغہ آمیزی کر کے (حالانکہ اصول مذکورہ سے خود پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگ اکتا چکے ہیں۔) اور صرف انفرادی آزادی کے متعلق اپنے خیالات سے نتائج اخذ کر کے تم کہاں پہنچے ہو؟

(۱) نراج (انارکی) کی منزل میں یعنی تم کمزوروں پر ظلم کرنے لگے۔

(۲) سیاست میں آزادی کی منزل پر پہنچ گئے۔ —— یعنی کمزوروں کی تضحیک پر! وہ علم و وقت اور ذرایع کے نہ ہونے کی وجہ سے اپنے واجبی حقوق و اختیارات سے بھی کام لینے سے عاجز و مجبور ہیں۔

(۳) اخلاقیات میں انانیت اور خود ستائی کی منزل میں —— یعنی کمزوروں کی مصیبت اور تباہی جو تنہا اپنی مدد آپ نہیں کر سکتے۔

ہمیں مجلس کی ضرورت ہے لیکن یہ مجلس کس طرح باطمینان بنائی جاسکتی ہے۔ اس کی ایک ہی تدبیر ہے کہ جو بھائی رہنمائی کے عام اصول پر یقین رکھیں متحد الخیال ہوں ایک ہی نام پر قسم کھا سکیں وہ کام کریں۔

ہمیں تعلیم کی ضرورت ہے یہ تعلیم کس طرح دیجاسکتی ہے، اور حاصل کی جاسکتی ہے۔ صرف اس طرح کہ ہم اپنے مشترکہ عقیدہ کے اصول کے ماتحت اس دنیا میں انسان کی پیدائش اور اس کی زندگی کی اصلی غرض سیکھ اور سمجھ سکیں!

ہم مشترکہ تعلیم چاہتے ہیں —— یہ تعلیم بغیر مشترکہ اصول و عقاید کے نہ حاصل کی جاسکتی ہے، اور نہ دی جا سکتی ہے۔

ہم ایک قوم بننا اور رہنا چاہتے ہیں —— لیکن یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہم مشترکہ مقاصد اور مشترکہ فرائض کو تسلیم نہ کرلیں۔ اگر خدا کے متعلق اور خالق و مخلوق کے رشتہ کے متعلق ہمارے خیالات و عقاید مشترک نہ ہوں تو پھر ہم مشترکہ فرائض کا احساس بھی نہیں کر سکتے۔ بے شک انتخاب اور نمایندگی کا عام حق بہت اچھی بات ہے یہی وہ آئینی ذریعہ ہے جس سے ایک ملک خطرناک اور نازک حالات کے اندیشہ کے بغیر اطمینان سے

حکومت کرسکتا ہے۔

انتخاب کا عام حق اچھی بات ہے۔ لیکن جس ملک میں ایک عقیدہ اور ایک مشرب کے لوگ ہوں وہاں یہ حق ایک نعمت ہے کہ اس سے قوم کے ارادہ اور رغبت کا اظہار ہوگا۔ لیکن جس ملک میں مشترکہ عقیدہ اور مشرب نہ ہو وہاں جو لوگ زیادہ تعداد میں ہونگے انکو مصائب و مظالم برداشت کرنے ہونگے

ایسے ممالک میں جہاں کوئی خاص مذہب نہیں ہے یا مذہب کو اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ وہاں تمام سیاسی اختلافات صرف ذاتی حرص وطمع اور خودغرضی کیلئے آلہ کار ہوا کرتے ہیں۔ سوا ان اصلاحات کے اور کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ گذشتہ ۵۰ سالہ تجربہ نے تو یہی سکھایا ہے۔ جو لوگ تم سے کہیں کہ آسمان الگ ہے اور زمین الگ۔ دین علیحدہ چیز ہے اور دنیا علیحدہ چیز ہے ان سے کہدو کہ آسمان اور زمین۔ دین اور دنیا کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ ہم سے نہ کہو کہ زمین کی اصلیت تو وہ خاک سے زیادہ نہیں ہے یہ زمین بھی اللہ کی زمین ہے اور اسی کی مخلوق ہے۔ اور ہم اس ہی زمین سے (اپنے اعمال صالحہ کی بدولت) خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ بے شک یہ دنیا رین بسیرا ہے اور فانی سرائے ہے۔ لیکن یہ دنیا ہی ہمارے لئے ایسی منزل مقرر کی گئی ہے جہاں ہم اپنے افعال و اعمال سے ایک اعلیٰ مرتبہ تک پہنچ سکتے۔ اور انفرادی حیثیت سے بھی ترقی کرسکتے ہیں۔ یہ دنیا فی الحقیقت کشت عمل ہے۔ جس کا ثمرہ عقبیٰ میں ملنے والا ہے۔ خدا نے ہمیں خیال آرائیوں کیلئے ہی پیدا نہیں کیا ہے۔ بلکہ ہماری تخلیق کا حقیقی مقصد عمل ہے۔

خدا نے ہمیں اپنے نور سے پیدا کیا ہے اور ہمارے اعمال و عبادات سب کچھ اسی کے لئے ہیں۔

نہیں اس کے وجود کے متعلق کوئی خیال ایسا نہیں ہے جو بجائے خود ایک عمل نہ ہو۔ ہمارا قول ہے کہ ہمیں دنیا کی تمام چیزوں سے نفرت کرنی چاہئے اور دنیوی زندگی کو حقارت سے ٹھکرا دینا چاہئے تاکہ پھر ہم روحانیت اور مذہب ہی کے ہو جائیں۔ لیکن یہ دنیوی زندگی بھی تو روحانی زندگی کا دیباچہ اور تمہید ہے۔ یہ دنیوی زندگی بھی روحانی زندگی کی منزل میں ایک قدم ہے چوبی زینہ کی آخری سیڑھی کی طرح ہے۔ دنیوی زندگی بھی ہم سب کے لئے خدا تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم اس زندگی کو مکروہ خیال کرتے ہیں۔ اور اس طرح ہم اپنے صحیح راستہ کی قطع و برید کر لیتے ہیں۔ ایک روح کی زندگی اپنی ہر منزل میں یکساں مقدس ہے۔ خواہ وہ دنیوی منزل ہو یا دوسری پیش آنے والی منزلیں ہوں پس ہر منزل سے گذرنے کے بعد ہم دوسری منزل طے کرنے کیلئے تیاری کرتے ہیں۔ ہر عارضی ترقی غیر فانی زندگی کی اس اعلیٰ ترقی میں مدد دیتی ہے جس سے خدا تعالیٰ نے ہم میں سے ہر ایک کو منور کر دیا ہے۔ اس لئے انفرادی ترقی

اجتماعی انسانیت کی ترقی کا سبب ہوتی ہے۔

خدا نے تم کو اس دنیا میں رکھا ہے۔ اس نے تمہاری طرح ہی کے کروڑ ہا انسان تمہارے اردگرد پیدا کئے ہیں۔ اُنکے دماغ تمہارے دماغوں سے تربیت و تقویت حاصل کرتے ہیں۔ اُن کی ترقی تمہاری ترقیوں کی مرہونِ منت ہے۔ اور اُن کی زندگی کا خوشگوار ہونا تمہاری زندگی سے ہے۔ تجرد اور تنہائی کی زندگی کے عذاب اور خطرات سے محفوظ رکھنے کیلئے اس نے تمہیں ضروریات سے جکڑ دیا ہے۔ ان ضروریات کو تم خود دوسروں کی امداد کے بغیر پوری نہیں کر سکتے۔ اور زبردست احساسات تم کو وحوش سے ممتاز کر دیتے ہیں۔ موخر الذکر میں یہ احساسات ہوتے تو ہیں، لیکن وہ ظاہر نہیں کر سکتے۔

(باقی)

غزل

(از اختؔر شیرانی)

لے آئے انقلاب سپہر بریں کہاں
اللہ ہم کہاں وہ ثریا جبیں کہاں

در ہے، نہ آستاں، نہ حرم ہے، نہ بتکدہ
یارب مچل پڑی ہے ہماری جبیں کہاں

دامن کش نظر ہے بہار "آشیانہ" کی
دنیا میں آگئی ہے بہشتِ بریں کہاں

آنکھوں نے ذرہ ذرہ پہ سجدے لٹائے ہیں
کیا جانے جا چھپا مرا پردہ نشیں کہاں

سورج کی سب سے پہلی کرن خوشنما سہی
لیکن تری نظر کی طرح دل نشیں کہاں

کوثر پلا کے ہم سے نہ حوریں کریں مذاق
ہم رند تلخ نوش کہاں، انگبیں کہاں

ہاں، دل کی "حسرتوں" کا تو ماتم کریں گے ہم
لیکن وہ خونفشانیٔ چشم حزیں کہاں

زاہد تری بہشت میں حوریں سہی مگر
ہم جس پہ مرتے ہیں وہ ثریا جبیں کہاں

ساقی کی مست آنکھوں کا صدقہ ہے ورنہ شیخ
اختؔر کہاں، یہ شعلۂ مینا نشیں کہاں؟

تشنۂ محبت

(از حضرت غریب جہاں آبادی)

(۱)

بلقان کی شہزادی نازنعمت کی پلی ہوئی میراندہ کے دل میں جو ایک لہر آئی۔ شاہی محلات سے نکل کھڑی ہوئی۔ آزادانہ زندگی کا شوق دنیا میں سب سے مل جل کر بسنے کا خیال اُسے یکایک جاہ و جلال شاہی کی پابندیوں سے نکال کر بسیط دنیا میں لے آیا۔

جو واقف حال ہیں انہیں یاد ہوگا کہ ایک زمانہ میں نہ صرف لندن میں بلکہ چاروں طرف میراندہ کے یکایک غائب ہو جانے پر کس قدر چرچا پھیلا تھا۔ ایک شب تو لندن کے تھیٹر میں وہ اپنا کمال موسیقی دکھا کر دنیا کو مسحور کر رہی تھی۔ دوسری شب ایسی بے پتہ ہوئی کہ کسی نے آج تک اس کا ذکر نہیں سنا اخباروں میں جو اس کے غائب ہو جانے پر شور و شغب پھیلا تھا وہ بھی اکثر لوگوں کو یاد ہوگا۔ کیا کیا باتیں من گھڑت مشہور ہوئیں۔ کہ معاذ اللہ کسی نے کہا، اسکی یادداشت خراب ہوگئی" کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کا حسن ماند کر دیا" اسے کوئی اڑا کر لے گیا۔ ایک طرف یہ بھی سنا گیا کہ میراندہ نے اپنی شہرت پھیلانے کی غرض سے کچھ دن کے لئے غائب ہو جانے کی چال کھیلی ہے۔ تھوڑے دن میں وہ خود واپس آجائیگی۔

لیکن وہ پھر تھیٹر میں واپس نہیں آئی اس کا حال مجھ سے سنو یہ واقعہ سچا ہے مجھ سے خود ماری بل نے بیان کیا۔ اور اس نے وہ ٹرنک بھی دیکھا تھا جس کے استر میں سے شاہی معرکہ تراش کر نکالا گیا تھا۔ ماری بل میراندہ سے اب تک واقف ہے۔ اس کے مکان کا پتہ بھی جانتا ہے مگر مایوسی اور ناکامی اسے اب وہاں جانے کی اجازت نہیں دیتی۔

ماری بل کے ہم سب دوستوں کو بخوبی معلوم ہے کہ وہ میراندہ پر عاشق تھا، میراندہ سٹیج کی عجیب پری جن کی دیوی دراصل شہزادی میراندہ والی سلاوینیا کی لخت جگر تھی۔ ماری بل کو بھی یہ حال اسی دن معلوم ہوا جس کے بعد وہ عمر بھر سٹیج پر نہیں آئی۔ ماری بل اس پر مرا جان سے فریفتہ تھا۔ مگر وہ خاموشی کے ساتھ اسکے شعاع حسن سے راحت و سکون حاصل کرتا تھا۔ اور منہ سے کچھ نہ کہتا تھا۔ نہ وہ جادۂ محبت سے ٹل سکتا تھا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ بلقان کے کسی گوشہ میں میراندہ کے دل نے ایک دن یہ فیصلہ کر لیا کہ سونے کا پنجرہ مجھے کبھی راس نہ آئے گا۔ نہ میں اسمیں سما سکتی ہوں۔

شاہی رسوم و آداب کی پابندیں اسے ایک ڈھکوسلا معلوم ہوتی تھی۔ علو و جاہ کی جگمگاتی آرائشیں ایک آن نہیں بھاتی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ عامہ خلائق کی طرح بے قید زندگی گذارے۔ دوستوں سے برابر مل سکے اور سب کے ساتھ رنج و راحت میں یکساں شریک رہے۔ اس لئے اس نے پنجرہ کا دروازہ کھولا اور نامعلوم دنیا میں داخل ہو گئی۔

بلغاریہ کے ایک اخبار میں جو مارسی بل کے پاس موجود ہے لکھا ہے کہ شاہزادی میرانڈہ کے غائب ہوجانے کی افواہیں سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔ شہزادی ہنوز دار الریاست سے لمبی چھٹی منانے کے لئے بیرونجات میں تشریف لے گئی ہیں لیکن خوشامدی اخبار ایسا لکھا ہی کرتے ہیں۔

یہ لمبی چھٹی لنڈن کے محلہ بونڈ سٹریٹ میں شروع ہوئی جہاں حوائج دنیا سے مجبور ہو کر میرانڈہ نے ماماگیری کی نوکری کر لی تھی۔ یہاں عوام الناس نے اس کی زندگی فراغت و بے تکلفی سے بسر ہونی دشوار کر دی۔ وہ بیشک نہایت خوبصورت تھی، یہی بیش بہا نعمت اسکے پاس تھی تھی اور اسی کی بدولت اُسے زحمت پہنچتی تھی۔

بہرحال وہ آزادانہ زندگی سے خوش تھی۔ ابنائے جنس سے مانوس تھی۔ اور اپنا کام ختم کر کے شام کو تفریحاً گلیوں میں ٹہلنے نکلتی تھی۔ اسکا کوئی رفیق یا مددگار نہ تھا اسلئے وہ جس رات ایک راہ گیر نے اسکے حسن پر فریفتہ ہوتے کا مزا چکھاتا پھر رہی تھی، چلتے پھرتے ایک شخص نے اسے ٹوکا۔ میرانڈہ لرزتی ہوئی جلدی سے آگے بڑھی۔ گلی میں سناٹا اور رات اندھیری تھی۔ اس شخص نے جونہی میرانڈہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی زبان سے چیخ نکل گئی۔ اجنبی نے کہا بھولے پن سے بیوقوفی مت کرو میں کیا تم کو کھا جاوٗں گا۔ کیا تم خوبصورت نہیں ہو

میرانڈہ نے پھر مدد کے واسطے آواز بلند کی اور سامنے کے دروازہ سے ایک نوجوان نکل آیا۔ یہ شخص ایک لڑکا سا معلوم ہوتا تھا۔ تن و توش بھی کچھ نہ تھا لیکن سچی بات کا حامی ہمیشہ فتحیاب ہوتا ہے۔ میرانڈہ کی نگاہ سے بیکسی کے آثار دیکھ کر وہ غصہ سے بیتاب ہو گیا۔ اس نے اجنبی کے ہاتھ کو جھٹکا دیکر کہا "انہیں چھوڑ کر الگ ہو جاوٗ"

اجنبی۔ میاں لونڈے! لو اپنی دخل در معقولات کا مزا چکھو۔ یہ کہہ کر نوجوان کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا۔ جو اس کی آنکھ پر کیا لگا کہ ستارہ میں بنی لگ گئی۔

مارٹن گریب یعنی نوجوان جو شہر کے کسی دفتر میں منشی تھا۔ فوراً پینترہ بدل کر مقابلہ کے لئے مستعد ہو گیا۔ کچھ تو اسے اپنی بات کے ہلکا ہونے کا [illegible] اور اس سے زیادہ تنہا اور بیکس عورت کی [illegible] پاس اس نے اپنے مخالف کی خوب [illegible] وہ شخص ذرا مہلت ڈھونڈھتا تھا [illegible] اس کی ناک پر رسید کیا جس سے [illegible]

گالی نکل گئی۔

میرانده بہت بدحواس ہوگئی اور چاروں طرف مدد کیواسطے نگاہ کرتی تھی۔ یہ دونوں شخص زمین پر ایک دوسرے سے خوب گتھم گتھا ہو رہے تھے کہ یکایک اسے خوب سوجھی

میرانده۔ اے لو پولیس والا آگیا۔ میں اسے بلائے لاتی ہوں۔

اسکی یہ بات اس لڑائی میں گہری چوٹ رہی۔ ان تینوں میں ایک شخص کو سرکاری آدمی سے ملاقی ہونے کی کوئی خواہش نہ تھی وہی گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور بھاگ نکلا۔

وہاں پولیس والا کہاں تھا۔ میرانده اور مارٹن کھڑے کھڑے ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے میرانده اس کی بہادری کی معترف بنی ہوئی تھی۔ اور مارٹن اس کی صورت اور پھر اس کی سمجھ پر لٹو تھا۔ اسکا سادہ مگر نہایت شفاف لباس اور تصویر دار ٹوپی اس پر خوب سج رہی تھی۔ منت پذیری آنکھوں میں بسی ہوئی تھی۔ غرض کہ رونق حسن اس کشمکش میں دوبالا ہوگئی تھی یکایک مارٹن اسے شہزادی کہکر مخاطب ہوا۔

میرانده۔ نہیں نہیں! مجھے اس خطاب سے کیوں پکارتے ہو

مارٹن۔ گھبرا کر ہنس پڑا۔ اور بولا آپ تو شہزادی ہی [illegible] ہیں

اپنے ملازم کا خیال کرکے پولیس والے کا نام لینے سے ایسا فرار ہوگیا تھا جیسے لاحول سے شیطان۔ دونوں کو ہنسی آگئی۔ مارٹن بولا۔ گلیاں شہزادیوں کے تنہا سیر کرنے کے قابل نہیں ہوتیں۔ چلیے میں آپ کو مکان تک پہنچا آؤں۔

یہ واقعہ کوئی ایسا اہم نہ تھا۔ لیکن قطب شمالی کوئی بڑا ستارہ نہیں دکھائی دیتا تاہم سب سیارے اسکے گرد قربان ہوتے ہیں۔ گلی کے ایک ادنیٰ واقعہ سے شہزادی اور غریب منشی کی جان پہچان ہوگئی۔ اور چھ مہینے کے اندر دونوں شادی کرکے ایک مکان میں آ بسے۔

(۲)

مارٹن بھی اس کے شان انداز دیکھ کر سمجھے ہوئے تھا کہ میں نے ایک بیگم بیوی سے شادی کی ہے۔ نئی بیوی بھی اس سے بے انتہا خوش تھی۔ اور کبھی اپنے گذشتہ عروج کا خیال بھی دل میں نہ لاتی تھی۔ اصل واقعہ اسے کبھی معلوم بھی نہ ہوتا لیکن ایک دن بیوی اپنا صندوق کھول بیٹھی۔ اس کے استر میں شاہی معرکہ دیکھ کر جیسے وہ بھولی ہوئی تھی خیال آیا۔ اس رہے سہے نشان امارت کو بھی دور کرو۔ صندوق کو صحن میں لے آئی۔ اور وہاں استر کو نشان کی جگہ سے کترنے میں مصروف تھی کہ یکایک مارٹن کی آواز دروازے سے اس کے کان میں آئی۔

"پیاری بیگم۔ تم آج کیا نیا کام کر رہی ہو؟"

میرانده گھبرا گئی اور شرمندہ ہو کر بولی "کچھ نہیں"

بعض دفعہ انسان کے ضعیف دل میں اپنی بیوی کی سابقہ زندگانی کی طرف سے شکوک پیدا ہو جانے کا موقع ہو جاتا ہے - یہ تو ظاہر تھا کہ میرانده پروسین تھی لیکن اس نے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ میں انگلستان میں نوکری کی خاطر آئی تھی - اس کا وطن سیلودینیا میں تھا جس کا نام بھی مارٹن نے نہیں سنا تھا - نہ اسے نئی شادی کے چاؤ چوچلے میں زیادہ تفتیش کا کبھی خیال آیا - وہ اس تصور سے بہت نازاں تھا - کہ میرانده میری ملکیت ہے - اور اپنی خوش قسمتی پر فخر کرتا تھا - مارٹن کا خود کوئی کنبہ قبیلہ نہ تھا - نہ اپنی بیوی کے عزیزوں کا اسے خیال آیا - لیکن میرانده اب سمجھی کہ مجھے اپنا پورا حال کہنا ہی پڑیگا - مارٹن نے تعجب سے پوچھا -

تم اس جامدانی کو کیوں کتر رہی ہو - یہ کہکر وہ آگے بڑھا اور میرانده کو بوسہ دیا - نزدیک سے جب اس نے کترن کو دیکھا تو بولا کہ یہ سنہری نشان کیا چیز ہے - کیا تم کو پسند نہیں - کیا یہ صندوق تمہارا نہیں ہے؟

میرانده بولی، نہیں مجھے اچھا نہیں لگتا - یہ کہکر چپ ہو گئی مگر سمجھ گئی کہ مارٹن کے دل میں شک پیدا ہو گیا ہے - مارٹن بولا "پھر کیا تم کسی اور کا صندوق چرا لائی ہو"

اس بات نے تازیانہ کا کام دیا - میرانده مارٹن کا نام لیکر ہنسی اُسے اپنے پاس بٹھا لیا اور اپنا سارا قصہ سنایا - کہ میں کون ہوں، کیوں گھر سے نکل پڑی تھی اور یہ کہ اب میں واپس گھر جانا نہیں چاہتی کیونکہ مجھے بڑی نعمت ہاتھ لگ گئی ہے - یعنی ایک عزیز مرد کی دلی محبت!

مارٹن بولا - میرانده، تم شہزادی ہو - اور میں ایک غریب محرر - یہ کیا ماجرا ہے؟

میرانده نے اسے اپنے سینہ سے لگا لیا - اور اسکے لبوں کو پیار کر کے بولی - خیر اب اس بات کو بھول جاؤ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو میرا راز معلوم ہو - اسی واسطے وہ سنہری نشان کتر کر پھینک رہی تھی - اب تو میں مارٹن صاحب کی بیوی ہوں - یہ القاب میرے لئے لاکھ شاہانہ خطابوں سے بڑھ کر ہے - اور یہ گھر ہزار بادشاہی محلوں سے زیادہ ہے!

یہ بات تو یہیں ختم ہو گئی، لیکن مارٹن اُسے چلتے پھرتے - کھانا پکاتے ہوئے تاڑنے لگا - اکثر اس کی پیشانی پر بل آجایا کرتا تھا - اصل ماجرا سن کر اُسے چکا چوند ہو گئی گھڑی گھڑی اُٹھ کھڑا ہوتا، بیوی کا ہاتھ بٹاتا - اور تعجب کرتا کہ وہ شاہزادی ہو کر غریب گھر والیوں کی طرح گھر کا دھندا کرتی ہے - اسی رات سے وہ ہکا بکا سا ہو گیا اور ایک ہی خواب گاہ میں ایک شہزادی کے ساتھ سونے بیٹھنے سے اسکو حیرت سی پیدا ہو گئی - جب تک میرانده سو نہ جاتی وہ کمرے میں قدم نہ رکھتا - غرض کہ مارٹن اس معاملہ سے مرعوب سا ہو گیا - اسکے تنگ

نکتۂ خیال میں محلہ کی لڑکیوں یا برابر والیوں سے ہنس بول لینا بڑی بات تھی۔ ایک شہزادی کے اسکے گھر میں رہنے سہنے کے خیال نے اُسے سمادیا۔ اب وہ اپنی قدیم آزادانہ طرز معاشرت بھول گیا۔ میراندہ اسے یہ جتا نہ سکی۔ کہ میں تمہارے ہم رتبہ بن جانے سے خوش ہوں۔ تمہارے لئے شہزادہ بن جانا ضرور نہیں سمجھتی۔

بیچارہ ادنیٰ منشی، نا تجربہ کار دل میں حیران اور پریشان رہا کرتا۔ اُسے اپنی بیوی سے پہلے کی طرح اختلاط اور ہنسنے بولنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اب وہ اس سے ادب و لحاظ سے پیش آتا۔ چند روز میں وہ پہلی سی گہما گہمی اور خلا ملا بھول گیا۔ دل اسی آزاد روش کا جویاں تھا۔ مگر ایک سد سکندری اس کے خیال میں ایسی حائل ہو گئی تھی جس سے گذرنا دشوار تھا۔

اب مارٹن گھر سے باہر زیادہ رہنے لگا۔ کبھی دفتر کی کسی لڑکی کے ساتھ چا پینے چلا جاتا۔ کبھی وہ تماشہ گاہ اور سینما میں جاکر اپنا وقت کاٹتا۔ یہ سب باتیں وہ اپنی سیدھی سادھی کھلی روش سے کیا کرتا تھا۔ مگر میراندہ سے اسکا ذکر بھی کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے ہی طبقہ اور طریقہ کے لوگوں میں دل بہلانے کے مشاغل ڈھونڈنے لگا۔ یہاں تک کہ میراندہ کے دل کو یقین ہوگیا کہ اب ہم دونوں کا ساتھ اور نباہ مشکل ہے اس نے ناچار ایک تھیئٹر میں ملازمت کرلی اور بغیر کہے سنے گھر سے چلی گئی۔ مگر ایک خط محبت وسلوک آمیز اپنے خاوند کے نام لکھ کر چھوڑ گئی

(۳)

میراندہ کو سٹیج پر دن دونی رات چوگنی شہرت اور ترقی نصیب ہوئی۔ تین چار برس کے اندر سب نے اسکی افضلیت کو تسلیم کرلیا۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جن سے اسکی واقفیت نہ ہوگئی ہو۔ بڑے بڑے لوگ اس کے تعارف پر فخر کرنے لگے۔ ماری بل بھی ان اشخاص میں سے تھا۔ لیکن میراندہ نے اسے یا کسی اور دوست کو اپنی کہانی نہیں سنائی۔ ماری بل نے ایک مرتبہ شادی کی درخواست کی تھی جس کے جواب میں وہ رونے لگی۔ اس کا دل اصلی خوشی کیلئے تو وہ حسرت بن گیا تھا۔ اور شاید یہی چیز کمال فن حاصل کرنے میں اسکی مددگار ہوئی اس کی شہرت روز افزوں تھی۔ ماری بل تبت تک گیا اور واپس آگیا۔ میراندہ اب تک پرنس تھیٹر میں موجود تھی۔ تھیٹر کا نام بھی اس کے لئے مطابق اور موزون تھا۔ میں ماری بل کے ہمراہ ایک شب میراندہ کو "وقت گذشتہ" کے تماشہ میں بیوی کا پارٹ کرتے دیکھنے گیا تھا۔

میراندہ نے "وقت گذشتہ" کے تماشہ میں اپنے کمال کو عروج پر پہنچا دیا۔ اس تماشہ کا قصہ کچھ کچھ اسکے حال سے ملتا تھا۔ خلاصہ یہ تھا کہ گھر بھر کے سب گھنٹے گھڑیاں ایک ساعت بھر ساکت کردی گئی تھیں

میاں بیوی

میں جھگڑا ہوگیا تھا۔ سب گناہ طرفین سے معاف ہو کر صفائی بھی ہوگئی۔

تماشہ میں خاوند کہتا ہے۔ بیوی تم مجھے معاف تو ضرور کر دوگی۔ مگر اس خطا کو بھولوگی نہیں۔ اور بیوی جواب دیتی ہے۔

"میں ضرور بھول جاوں گی"

یہ کہکر بیوی گھر بھر کے سب گھنٹے گھڑیوں کو ایک گھنٹہ پیچھے کر دیتی ہے۔ اور کہتی ہے دیکھ لو یہ گھنٹہ ابھی نہیں گذرا۔ چلو اسے مٹا ہی ڈالیں۔

میرانڈہ کو اس شب بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ سارا اسٹیج اس کی تعریف سے گونج اٹھا۔ بہت لوگ اس سے ملنے کو گئے اور اس کے کمال کے سامنے سر جھکا کر واپس آگئے۔

ماری بل سب سے زیادہ اس تماشہ کی تعریف و توصیف میں رطب اللساں رہا۔ میری بغل میں ہاتھ ڈالکر مجھے سٹیج کے دروازہ تک لے گیا۔ کہ چلو میرانڈہ کو اپنی موٹر کار میں سوار ہوتے دیکھ لیں

وہ شہزادی ہوگی تو خیر مگر آج وہ اپنی ننھی سی سلطنت کی ملکہ بنی ہوئی تھی۔ خلقت کا ہجوم تھا سب اسکی تعریف کر رہے تھے۔ میرانڈہ سب کی طرف مسکراتی باہر نکلی تو میں نے ایک شخص کو جو میرے پیچھے تھا دیکھا۔ جب میرانڈہ نے اسکی جانب دیکھ کر اپنے ہاتھ کو بوسہ دیا وہ دم بخود ہوگیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہی شخص مارٹن گریب یعنی اس کا خاوند ہے اور اپنی بیوی کو دور سے دیکھ رہا ہے۔

ماری بل نے بعد میں مجھے سارا قصہ سنایا۔ مارٹن اس بیش بہا جوہر کو اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھا تھا۔ گویا اس نے موتیوں کی بھری مٹھی خاک میں پھینک دی تھی جب وہ گھر سے نکل گئی تو مارٹن کا دل پھر اس کی طرف مائل ہوا۔ اب اس کی یاد ستانے لگی وہ روز تھیٹر میں جاکر دیکھا کرتا میرانڈہ نے اپنا حال اس سے کبھی پوشیدہ نہیں رکھا وہ اسے اب نئی زندگانی میں ابھارے گئی۔ مارٹن اسکے درجہ و مرتبہ تک آپہنچا۔ اب میرانڈہ اس کے نزدیک ایک مذہبی دیوی بن گئی تھی۔ جس کی وہ دور سے پرستش کیا کرتا تھا۔ مگر پاس جانے کی ہمت نہ تھی۔ اپنی بیوی سے بات کرنے کے خیال سے مارٹن کو لرزہ آتا تھا۔

جس دن وہ تھیٹر نہیں جاتا تو رات کے مدرسہ میں جاکر تعلیم حاصل کرتا۔ گھر پہ تنہائی میں بڑی رات تک پڑھا کرتا اور اپنی قابلیت بڑھانے کی فکر میں لگا رہتا۔ اسے تماشہ کا ہر مصرعہ اور غزل جو میرانڈہ گایا کرتی تھی حفظ ہوگیا تھا۔ بلکہ جو الفاظ میرانڈہ کے ہم مشرب ایکٹر اس سے تماشہ میں کہا کرتے تھے وہ رات کو مارٹن کے منہ سے سوتے میں رواں ہوجاتے کئی مرتبہ وہ سٹیج کے دروازہ پر جاکر کھڑا رہا۔ اس کا اچھلتا ہوا دل اور بھڑکتی ہوئی امنگ درد فراق سے گھائل ہوتے جب وہ اپنی شہزادی کو تھیٹر سے سوار ہو کر جاتے ہوئے دیکھتا بعض اوقات ماری بل میرانڈہ کے ہمراہ ہوتا تھا

ماری بل کو اس کی شادی کا حال معلوم نہ تھا نہ میرانڈہ نے اس سے ذکر کیا تھا۔ غالبًا وہ اس شخص کی دلی حالت سے واقف تھی اور سمجھتی تھی کہ یہ سارا حال سنکر آنا جانا بھی ترک کر دے گا۔ اسکی دوستی بے غرضانہ نہ تھی۔

اب آخری شب کے تماشہ کا حال سنو۔ تین شخص جو میرانڈہ کی ذات سے وابستہ تھے اس شب تماشہ میں شریک تھے۔ ان میں ایک ماری بل تو اول درجہ میں بیٹھا تھا۔ دوسرا شخص مارٹن آخری درجہ میں تھا تیسرا شخص وزیر ریاست سلوینیا درجہ خاص میں تھا۔ یہ اپنی ریاست کے کسی کام کو انگلستان آیا تھا۔

پہلے ہی ایکٹ میں سفیر نے میرانڈہ کو پہچان لیا کہ وہ میرے بادشاہ کی بیٹی ہے۔ جسکے غائب ہونے پر قصر شاہی میں عجیب کہرام مچا تھا۔ اور ریاست میں طرح طرح کے افسانے مشہور ہو گئے تھے۔

تماشے کے درمیان میں ماری بل نے بھی اپنی محبوبہ سے ملاقات کرنے کا قصد کیا۔ اس خیال سے کہ شاید زمانہ گذر جانے سے اب اس کا دل میری جانب مائل ہو گیا ہو۔ بہرصورت وہ ایک دفعہ اور اس سے گفتگو کرنے کا مشتاق تھا۔ آخری درجہ میں غریب مارٹن ایک ایک حرف پر کان لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے دل میں میرانڈہ سے ملنے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔ مگر ہونٹ خود بخود تماشہ کے ہر لفظ کو دوہرا رہے تھے۔

میرانڈہ دل میں بہت جز بز ہوئی جب اسکے پاس سفیر سلوینیا کا کارڈ پہنچا۔ پرانا وقت اسے یاد گیا۔ سوچی کہ ملنا تو ضرور پڑے گا۔ اس لئے تماشہ ختم ہونے پر سفیر صاحب کو بلا بھیجا۔

میرانڈہ (مسکرا کر) سفیر صاحب۔ آپ سے ملنا وطن سے اس قدر فاصلہ پر تعجب سے خالی نہیں۔

سفید بال والے سفیر نے جس کے سینے پر چکدار تمغے آویزاں تھے ادب سے جھک کر میرانڈہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور بولا، شاہزادی بیگم آپکی والدہ ماجدہ موجود ہیں۔

میرانڈہ۔ بھلا خیریت سے تو ہیں۔

سفیر۔ وہ اور بھی خوش ہو جائیں گی۔ اگر جناب والا بھی محلات شاہی میں اُن کے پاس ہوں۔

میرانڈہ۔ جناب سفیر صاحب! اب میں کبھی واپس نہیں جاؤں گی۔ اگر والدہ صاحبہ کو مجھے ملنے کا اشتیاق ہو۔ تو کہیں بھی مجھ سے مل سکتی ہیں۔ مجھے بھی ان کے دیدار کی آرزو ہے۔ اب مجھے وطن کے سب حالات سناؤ۔ میں کچھ حال تو اخباروں سے معلوم کر لیتی ہوں۔ میری بہن کیتھرن اور بھائی روڈولف کیسے ہیں۔ باوا جان کس طرح ہیں۔

سفیر۔ سلوینیا میں سب اچھی طرح سے ہیں۔ مگر آپ کو سب یاد کرتے ہیں۔ اور عجیب افسانہ مشہور ہو گئے ہیں۔

میرانڈہ۔ ان افسانوں کی کچھ پروا نہیں۔

سفیر۔ مگر لوگوں کو آپ کی واپسی کی آس لگی ہوئی ہے۔

میراندہ۔ اچھا سب سے کہہ دینا۔ میراندہ خوش ہے ..... خوش ہے۔ مگر اس کے چہرہ پر افسردگی ضرور تھی

سفیر۔ لیکن یہ تماشہ..... حضور کے لایق نہیں آپکی شان سے بعید ہے۔ آپ ایک شاہی خاندان کی شہزادی ہیں اور عام لوگوں کے سامنے تماشا کرتی ہیں حضور والا......

دروازہ کھل جانے پر سفیر خاموش ہوگیا۔ اور ملازم ایک ملاقاتی ماری بل کو ساتھ لے آئی۔ اس نے سفیر کے آخری الفاظ سن لئے تھے۔ اور ضرورت وقت سے آشنا تھا لیکن سر دست اسکے حواس باختہ ہوگئے۔ میراندہ آگے بڑھی۔ اسے سوچ بچار فضول معلوم ہوا۔ دونوں کا تعارف کرایا۔ ہز ایکسیلینسی سفیر وزیر خارجہ ریاست سلوینیا میں جو میرے باپ کے زیر حکومت ہے۔ ماری بل اور بھی متعجب ہوا۔

میراندہ بولی۔ ہاں میرے دوست۔ میرے باپ کی ریاست یہ بات میں کبھی افشا کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن میں شاہ الگزینڈر والی سلوینیا کی بیٹی ہوں سیر و سیاحت کے شوق سے تم خوب واقف ہو۔ میں بھی وہاں سے چلی آئی۔ کیونکہ سنہری پنجرہ مجھے پسند نہ تھا۔ میرے ملک کو میری ضرورت نہ تھی شاہانہ بھڑک۔ آداب و رسوم۔ خالی خولی تعظیم سے میری طبیعت مانوس نہ تھی۔ مجھے دنیا کی سیاحت کی تمنا ابھار لائی۔

سفیر۔ حضور والا ضرور واپس تشریف لے چلیں۔ یہ کہکر اس نے طیش میں آکر میز پر مکہ مارا اور کہا یہ رنگ و روغن یہ تماشہ کا لباس ایسی عالی خاندان شہزادی کو زیبا نہیں......

میراندہ۔ قہقہ مار کر بولی سفیر صاحب میں نے آپ کا طرز معاشرت برسوں سے ترک کر دیا۔ میں لندن کی ایک دکان میں بطور خدمتگار ملازم رہی۔ ہمیشہ میرا حال ایسا درست نہ تھا۔ مجھے آج کل اسی قدر روپیہ مل رہا ہے جو میرے والد شاہی خزانہ سے مجھے عنایت کرتے تھے اور میری شادی بھی ہوگئی ہے۔

دونو مرد بولے۔ شادی ہوگئی۔

میراندہ۔ ہاں لندن کے ایک منشی سے میرا عقد ہوگیا ہے جسکی آمدنی میرے جدا ہونے کے زمانہ تک ۳ پونڈ فی ہفتہ سے زیادہ نہ تھی۔

ماری بل۔ آپ نے اُسے چھوڑ دیا۔

میراندہ۔ ہاں ایک شہزادی کے ساتھ رہنا اُسے دوبھر ہوگیا۔ لیکن دنیا میں سب سے زیادہ تمنا مجھے ہے تو یہ کہ پھر اس کے پاس چلی جاؤں۔ اس کے ساتھ چند روز میں نے بسر کئے بہت چین سے گزرے ماری بل میں اپنے خاوند سے بہت محبت کرتی ہوں اس کے بعد تمہاری دوستی کا مجھے اعتراف ہے۔

مارسی بل - تو میں اسے آپ کو تلاش کر دوں گا۔

میرانده - نہیں وہ بات اب شاید گئی گزری ہوئی وہ خوشنما خواب - وہ سادہ بے لوث زندگانی - خیر اگر میرے یہ دن پھرے تو آپ سے آپ پھر جائیں گے -

اُسے معلوم نہ تھا کہ دن پھرنے کا وقت آپہنچا ہے سیلیچ کے دروازہ پر حسب معمول خلقت کا اژدہام تھا میرانده سب کی طرف دیکھ کر حسب معمول مسکرائی - مگر جب مارٹن کی طرف نگاہ پڑی تو رکی، ایک پاؤں موٹر کی رکاب پر دوسرا زمین پر تھا - مارٹن کو دیکھے ہوئے کئی برس ہوگئے تھے - بغیر لحاظ مجمع عوام وہ مارٹن کو پکار اٹھی - مارٹن نے جواب تو دیا، پھر چپ کھڑا رہا اس کے پاس آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی - میرانده موٹر چھوڑ کر اس کی طرف مڑی اور اپنا ہاتھ مصافحہ کیلئے بڑھایا اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ ملایا -

میرانده - تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو - نہیں تو اس طرف کیوں آتے ؟

مارٹن - ہاں ہاں ! ضرور، بیشک

میرانده - تو آؤ مجھ سے باتیں کرو - (یہ کہہ کر اُسے موٹر میں بٹھا کر ساتھ لے گئی) اب ہم کس طرف چلیں تم کہاں رہتے ہو

مارٹن - وہی قدیمی مسکن -

میرانده کو پتہ معلوم تھا، موٹر چلانے والے کو پتا بتا دیا - یہ بڑی موٹر کار لندن کے مشہور بازاروں میں سے گذر کر اس پتہ پر روانہ ہوئی، راستے میں دونوں دیر تک خاموش رہے - میرانده مارٹن کی طرف نیچی نظروں سے دیکھ رہی تھی - وہ اب نیا آدمی معلوم ہوتا تھا - کوئی نئی بات اس میں معلوم ہوتی تھی یعنی تحمل، دبدبہ یا غیر معلوم اثر - میرانده ایک دفعہ ہی بول اٹھی - مارٹن تمکو یقین ہے کہ تمہیں میری ضرورت ہے؟

مارٹن نے فوراً جواب نہیں دیا - پہلے آہستہ سے میرانده کا ہاتھ پکڑا تھوڑی دیر چپ رہ کر بولا پیاری ذرا ٹھیرو جب تک گھر نہ آجائے - پیاری کا لفظ سن کر میرانده کا دل باغ باغ ہوگیا -

مارٹن نے گھر پہنچ کر دروازہ کھولا - میرانده کو پہلے گھر میں جانے دیا اس نے دروازہ کے اندر کھڑے ہو کر گھر کی طرف ایک دفعہ نگاہ کی اس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی تھی چار پانچ برس گذر چکے تھے میرانده کو اپنا جانا کل کی سی بات محسوس ہوئی -

مارٹن اس کے پاس آیا - میرانده کے ہاتھ پکڑ کر بولا -

مارٹن - مجھ سے خطا ہوئی - مگر تم ضرور مجھے معاف کردو گی - میں نے تمہاری جدائی کے زمانہ میں بہت کچھ پڑھا لکھا اور سیکھا - اب میں زیادہ سمجھدار ہوگیا ہوں - تمہاری زندگانی میں مخل ہونا نہیں چاہتا - گذشتہ چار سال میں سوائے تعلیم اور غذا کی

بندگی کے میں ہر طرح مردہ بنا ہوا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو تمہاری دوستی کے لایق بنا لینے کی کوشش کی ہے۔ کیا اب دوبارہ محض دوستانہ قایم نہیں ہو سکتا

میرانده کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ وہ ایک دیوی کی مانند آہستہ سے اس کی طرف ہاتھ پھیلا کر بڑھی اور بولی، دوستی کیا چیز ہے۔ میرا دل، میری محبت میری جان سب تمہارے واسطے ہیں اور ہمیشہ سے تمہارے لئے ہیں میں گھر سے اس خیال سے نکل گئی کہ میں نے سمجھا تم کو میری حاجت نہیں ہے۔ جب تم چاہتے میں ہر دم واپس آنے کو تیار رہتی میں تو تمہی تھی اب تم مجھے نہیں بلاؤ گے۔

مارٹن۔ کیا پھول کو آفتاب کی ضرورت نہیں میرانده تمہاری باتیں عجیب ہیں لیکن من آنم کہ من دانم تم شہزادی، میں ایک ادنیٰ منشی، میں کیونکر تمہارے لایق ہو سکتا ہوں۔ کیسے تمہاری برابری کر سکتا ہوں؟

میرانده۔ مسکرا کر بولی۔ لیکن میں تو تمہاری برابری میں آسکتی ہوں اور تمہاری زندگی میں شریک ہو سکتی ہوں۔ اور تمہارے لایق بن سکتی ہوں۔

ایک لمحہ کے اندر دونوں ایکدوسرے سے گلے مل گئے میرانده پھر سٹیج پر کبھی نہیں گئی بلکہ خاوند کی مرضی پا کر سب مال و دولت بھی خدا کے نام خیرات کر دیا اور اسی معمولی حالت میں زندگی ختم کر دی

زندگی اور دل

(از جناب دیوان کیشو داس صاحب عاقل بی اے (آنرز))

دل کی وسعت میں ہی پنہاں اک جہانِ زندگی — دل زمینِ زندگی، دل آسمانِ زندگی
دل میں دردِ جستجو جس کے ہی وہ ہے زندہ دل — زندہ دل جو ہے وہی ہے کامرانِ زندگی
ہم نشیں کیا چیز ہے معمورۂ دل کچھ نہ پوچھ — میری دنیا ہے جنوں میرا جہانِ زندگی
خونِ دل سے رنگ بھر تصویر ہست و بود میں — یعنی رنگیں کر تو اپنی داستانِ زندگی
زندگی آئینہ دار دل ہے، دل کی قدر کر — دل ہے زینت زندگی کی دل ہی شانِ زندگی

راحتِ جاوید کا آغاز ہے انجام رنج
خارزارِ زندگی ہے گلستانِ زندگی

ادیبِ شہیر سید سلطان حیدر صاحب جوش (علیگ) کا خط (اختر شیرانی کے نام)

یہ خط جسے ایک ضروری اور دلچسپ امر کی بنا پر اب سے بہت پہلے شایع ہونا چاہئے تھا، افسوس ہے کہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے شایع نہ ہو سکا، جس کے لئے ہم سید صاحب اور ان کے "بے تکلف دوست" سے معذرت خواہ ہیں۔ اگرچہ "بہارستان" صاحب "آئندہ التذکر" کی "فی البدیہہ نظم" سے خائف نہیں ہے۔ (اختر)

کرمفرمائے تغافل شعار! السلام علیکم،

دس روز سے زیادہ کا عرصہ ہوتا ہے کہ آپ کے عنایت نامہ اور مولانا تاجور کے گرامی نامہ کے جوابات کیساتھ "بہارستان" کے لئے ایک مضمون "لبنیٰ نوازی" ارسال کر چکا ہوں، غالباً پہنچ گیا ہوگا۔ مجھے خوف تھا کہ آپ کی اور مولانا تاجور کی ضد کے سامنے مجھے تعمیل ارشاد میں ہتیار ڈال دینا ہوگا اس لئے باوجود اس تحریر کے میں اس فکر میں مبتلا رہا کہ کسی نہ کسی طرح آپ کی فرمایش بھی پوری ہو جائے اور مجھے خود لکھنا بھی نہ پڑے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں خلاف امید اس میں کامیاب ہو گیا۔ اس اجمال کی تفصیل یوں سمجھئے کہ اسی مدت میں مجھے عزیزی وحید احمد صاحب (سابق اڈیٹر رسالہ "نقیب مرحوم") سے ملنے کا اتفاق ہوا اور بر سبیل تذکرہ انہوں نے آپ کی فرمایش پوری کرنے کا پختہ وعدہ کر لیا۔ وہ میرے متعلق ایک مختصر نوٹ لکھنے کے ہر طرح اہل بھی ہیں۔ اور اس خدمت کو انجام دینے کے لئے تیار بھی ہیں ان کی اس آمادگی کا باعث دراصل مکرمی سید محفوظ علی صاحب بی۔ اے ہیں۔ جو دنیائے صحافت میں آدم ثانی (کم از کم ہندوستان شمالی میں) سمجھے جاتے ہیں۔ بہرحال اب میں اس تقاضائے شدید سے بھی سبکدوش ہوتا ہوں میاں وحید صاحب کا ارشاد ہے کہ آپ سوالات قایم کریں اور وہ ان کے مختصر جواب آپ کو ارسال کرینگے میری متعدد تصاویر بھی ان کے قبضہ میں ہیں اس لئے وہ ایک تصویر بھی روانہ کر سکتے ہیں۔ اب یہ آپ فرمائیں کہ یہ نوٹ کب تک پہنچنا چاہئے؟ یہاں تک تو وہ امر ختم ہوتا ہے جسکی بابت خود از سرِ نو سلسلہ جنبانی کر رہا ہوں۔ ورنہ بظاہر تو میں آپ کو راضی کر چکا تھا۔ اور آپ بھی سکوت اختیار کر چکے تھے۔

اب دوسری گذارش سنئے جو دراصل اس عریضہ کے ارسال کی وجہ ہے اس کو سخندۂ تقدیر کہئے یا مکافات عمل، کہ برٹش گورنمنٹ نے میرے شوق مضمون نگاری کو ختم کرنے کے لئے مجھے وہ چیز عنایت فرمائی جو ممکن ہے کہ بظاہر مسرت انگیز معلوم ہو۔ مگر میرے لئے یک قلم فرصت کش ثابت ہوگی۔ ۷ اگست کے گزشتہ

ہیں مجھے ڈپٹی کلکٹری عنایت فرما کر میرا تمام وقت فرصت چھین لیا گیا۔ ظلم یہ ہے کہ فوراً چارج لینے کا حکم صادر ہو گیا۔ اور تقرری ہوا تو کالے کوسوں یعنی جونپور بر حال ناحق بہ رضائے حکم آج کل چارج دے رہا ہوں اور چار روز کے اندر جونپور روانہ ہو رہا ہوں، گویا کل میری تحصیلداری کی جھول خدا خدا کر کے اتری ہے۔ دیکھیے یہ نیا روپ کیسا ثابت ہو۔ لہٰذا بر کثرت کار کے لحاظ سے یہی چھوڑے دیتا ہوں

اب یہ "بہارستان" کا پرچہ بھی اور آپ کے گرامی نامے بھی ہیں۔ بہتر ہے کہ خدا آپ کو جواب کی توفیق دے (زیارت سے ہو جائے گا)، جونپور ایک ڈپٹی کلکٹر کے نام آنا چاہئیں ایسا نہ ہو کہ تمام تحریرات بسیلپور کا طواف کرنے کے بعد جونپور پہنچا کریں۔

ہاں جناب یہ تو فرمائیے یہ "مطلع" (پہلے اس نے مس کیا۔ پھر توح کیا پھر بل کھایا[1]) آپ کے ہاتھ کہاں سے لگا؟ بندۂ خدا! یہ مطرف مجھکو حاصل نہیں۔ یہ میرے ایک نہایت بے تکلف دوست اور حلقۂ احباب میں مشہور ہستی کا کلام ہے۔ مجھے خوف ہے کہ ان کو مجھ پر سرقہ کا گمان نہ پیدا ہو جائے۔ ان حضرت کا اسم گرامی امیر حسن صاحب ہے اور وہ ہردوئی میں اگریکلچر سپرنٹنڈنٹ ہیں [illegible] تخلص کرتے ہیں اور ہمیشہ اس صنف میں طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ اُن کا کلام اُن کے تمام اہلِ [illegible] لگا تار رہتا ہے۔ چنانچہ مجھے بھی کچھ یاد ہے۔ اُن کے بعض بعض مصرے سہل ممتنع اور جدت آفرینی میں اپنی مثال خود ہی سمجھے جاتے ہیں۔ ایک شعر یاد آ گیا۔ فرماتے ہیں (مقطع ہے)

عشق گھوڑے کا ہوا جب سے کہ بلبل کو امیر
تانگۂ دل کو لئے پھرتی ہے منقار کے بیچ

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے ؎

زندگی خاک نشینوں کی بھی ہوتی ہے عجیب
چڑھ کے سیڑھی پہ بناتے ہیں مسیحا کا مزار

اور سنئے۔ صرف ایک مصرع یاد ہے :-

خاک ہو جاتا ہے اس غم میں پریزاد کا نر

اب فرمائیے کہ آپ نے ایک ایسی لازوال ہستی کے کلام بے بدل کو میرے نام کے ساتھ منتہی کرنے میں کس قدر فحش غلطی کی ہے؟ مجھے ڈر ہے کہ وہ حضرت کوئی فی البدیہہ (کیونکہ قلم برداشتہ لکھنے کا اُنکو مرض ہے) نظم "بہارستان" کی شان میں لکھ ماریں اور مجھ پر سرقہ کا الزام نہ تھوپ دیں۔ فوراً اس کی معذرت کیجئے ورنہ آپ جانیں اور آپ کا کام والسلام!

اور زیادہ لکھتا، مگر آج کل پارٹیوں اور دعوتوں میں کے مزے لوٹ رہا ہوں۔

---

[1] دوسرا مصرع اس طرح "ظالم نے مستقبل کے ٹکڑے کر دیئے"۔ سید صاحب کی طرف منسوب کیا گیا تھا۔ آختر

۱۲ مارچ کا دن نوٹ کر لیں

ناظرین کو یاد ہوگا

۱۲ مارچ کا دن نوٹ کر لیں

کہ پچھلے سال مارچ میں امرت دھارا کی سلور جوبلی کس دھوم دھام سے منائی گئی تھی مختلف اجلاس کی صدارت جناب راجہ نرندر ناتھ صاحب۔ خان بہادر شیخ عبد القادر بیرسٹر ممبر کونسل۔ مہاتما ہنسراج جی۔ پروفیسر شو دیال جی ایم۔ اے۔ رائے بہادر ڈاکٹر مہاراج کشن صاحب اور مسیح الملک محمد اجمل خان صاحب جیسے برگزیدہ اصحاب کی۔ سر ڈاکٹر میاں محمد شفیع۔ ڈاکٹر گوکل چند نارنگ۔ ڈاکٹر نند لعل صاحب۔ سردار سردول سنگھ کویشر۔ مولوی محبوب عالم جیسے اصحاب کی تقاریر ہوئیں۔ نیا پن تھے۔ نمائش ہوئی شہر کے لوگوں نے پارٹی دی مشاعرہ ہوا طبی کانفرنس ہوئی۔ اسی واسطے تو اخباروں نے لکھا تھا۔ کہ

امرت دھارا کی سلور جوبلی لاہور میں ایک تاریخی واقعہ ہوگیا ہے

اسی واسطے فیصلہ کیا گیا ہے کہ **۱۲ مارچ کا دن** جو سلور جوبلی کا خاص دن تھا ہمیشہ کی یادگار رہنا یا جاوے۔ دفتر میں اُس دن تعطیل ہو جلسہ ہو اور تمام مہربانوں کو اس خوشی میں شامل کرنے کے واسطے صرف ۱۲ مارچ کے دن کے لئے وہی سلور جوبلی کی رعایت کی جاوے۔

یعنی امرت دھارا اور اسکے مرکبات ۳/۴ قیمت پر اور باقی ادویات و کتب نصف قیمت پر

اسکی ترکیب یہ ہوگی کہ دنیا کے کسی حصہ سے بھی ۱۲ مارچ کو جو خط لکھکر ڈاک میں ڈالا جاویگا۔ وہ چاہے ہمارے پاس کسی دن پہنچے اُس پر حسب بالا رعایت ہوگی لاہور شہر کے خریداروں کے واسطے ۱۲ مارچ کو ایک لیٹر بکس باہر رکھا جاویگا جو صاحب اسمیں خط ڈال جاویں۔ وہ اس رعایت کے مستحق ہونگے۔ بجز اس کے کسی دن اگر اس خط میں لکھی ادویات حاصل کر سکتے ہیں جوبلی کے دنوں میں جو خاص رعایت یہ رکھی گئی تھی۔ کہ جو صاحب نقد روپیہ جمع کر دیں وہ اس روپیہ کے ختم ہونے تک ہر وقت یہ رعایت حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ رعایت بھی قایم ہوگی۔ اسکے واسطے بھی روپیہ ۱۲ مارچ کو ہی آرڈر کر دینا چاہئے

اب ناظرین کو چاہئے

کہ ۱۲ مارچ کا سلور جوبلی ڈے اپنی ڈائریوں میں نوٹ کر لیں۔ اور جن کے پاس فہرست ادویات و کتب نہیں ہے وہ پہلے ہی اس کو منگوا کر جو جو چیز کی ضرورت ہو اس کو نوٹ کر لیں۔ اور ۱۲ مارچ کو خط ضرور ڈال دیں۔ اس کو

نہ بھولیں

خط کا پتہ اتنا کافی ہے:۔ **امرت دھارا ۶۹ لاہور**

المشتہر

مینیجر امرت دھارا۔ امرت دھارا بھون۔ امرت دھارا اسٹریٹ۔ امرت دھارا ڈاکخانہ۔ لاہور

عمل تسخیر القلب ہر کس رجسٹرڈ

منترِ ہٰذا ہمیں سالہا سال کی تلاش و جستجو کے بعد ایک رنگ تجربہ کار عامل کامل بنگالی صاحب سے صدہا خدمات کے صلہ میں مرتے وقت عطا ہوا ہے جو نہایت سہل الحصول زود اثر پُر تاثیر اور مجرب المجرب ہے خوبی یہ ہے کہ صرف تین روز میں مراد حاصل ہوتی ہے۔ بشرطیکہ نجست پاک ہو اور عامل کو گھر سے باہر جانا نہیں پڑتا نیز مطلوب چاہے کیسا ہی سنگدل کیوں نہ ہو۔ طالب کا مطیع و تابعدار بن جائیگا۔ اور جتنک ملاقات نہ کریگا کسی پہلو سے قرار نہ آئیگا۔ قیمت پیشگی پانچ روپیہ چار آنہ

عمل تسخیر ہمزاد } عمل ہٰذا چند روز ہوئے ایک فقیر سے ہمارے ہاتھ لگا تھا۔ ہمارا ارادہ اسکو مشتہر کرنیکا نہ تھا۔ مگر عمل تسخیر القلب ہر کس کے خریداروں نے ایسے عمل کا انتہائی اشتیاق ظاہر کر کے شائع کرنے پر مجبور کیا۔ قیمت پیشگی پانچروپیہ چار آنہ بذریعہ وی پی پانچروپیہ آٹھ آنے۔ اور پچاس روپیہ بعد کامیابی کے۔ مگر پانچروپیہ چار آنہ کے ہمراہ پچاس روپیہ کا اقرار نامہ ضرور آنا چاہیئے۔ **نوٹ** ۔ صرف سات یوم میں کامیابی ہوتی ہے۔

ترکیب بغض } بھی ہمارے پاس تیر بہدف ہے۔ قیمت پیشگی پانچروپیہ چار آنہ۔ رازداری کی قسمیہ تحریر کا آنا لازمی ہے۔

نوٹ ۔ مندرجہ بالا عملوں سے جو صاحب کسی ایک کو بھی جھوٹا ثابت کر دینگے انکو ہم دگنی قیمت واپس دینگے اگر انکار کریں تو بذریعہ عدالت چارہ جوئی کر کے وصول کر سکتے ہیں نیز انکو یہ بھی اختیار ہوگا کہ ہماری نسبت شکایت جس پرچہ میں چاہیں درج کرائیں۔ مکرر از روئے ایمان۔

ع۲ ہر ایک عمل کی قیمت پانچروپیہ چار آنہ پیشگی۔ اور پانچروپیہ آٹھ آنہ کا وی پی مگر جو صاحب ایک سے زیادہ عمل ایک ساتھ طلب فرمائینگے۔ ان سے صرف پانچروپیہ فی عمل کے حساب سے پیشگی لیجا دینگے۔ ع۳ صرف وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جسکو کہ خاکسار اجازت دیگا۔ دوسرا ہرگز کامیاب نہ ہوگا۔

ع۴ ہر عمل کسی کو نہ بتانیکی حلفیہ تحریر آنے پر روانہ ہوگا۔

سارٹیفکیٹ } (۱) عالیجناب ٹھاکر شیو راج سنگھ صاحب زمیندار مراد آباد محلہ لنگلھر سے رقمطراز ہیں بعد تکریم بندہ تسلیم۔ آپکے منتر نے مجھے کافی امداد دی۔ اور میں اپنے کام میں کامیاب ہوگیا۔ لہٰذا مبلغ پچیس روپیہ بطور نذرانہ ارسال خدمت ہیں۔ قبول فرمائیے۔

(۲) عالیجناب ٹھیکیدار کالیخاں صاحب رام گھاٹ ضلع بلند شہر سے تحریر فرماتے ہیں بعد سلام تسلیم۔ آپکے عطیہ کا تہ دلسے شکریہ ادا کرتا ہوں کیونکہ وہ اپنے اثر میں نہایت پُر تاثیر ثابت ہوا۔ بدیں خیال اسکا نذرانہ اسکے اوصاف کے مقابلہ میں بیحد قلیل ہے۔ میرے عرض کرنیسے میرے چند احباب بھی اسکے بہت معتقد ہوگئے جنہوں نے آج مجھ سے تذکرہ کیا ہے کہ ہم نے بھی اسکا نذرانہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کر دیا ہے۔ میں خدا کی ذات سے اُمید کرتا ہوں کہ آپکے اس نایاب فیض سے بہت سے لوگ مستفیض ہو کر آپکے شکر گذار ہونگے۔ ایسے ہی سینکڑوں موجود ہیں۔ مگر چونکہ ہمیں مشتہر کرنیکی اجازت نہیں دی اسلئے مجبور ہیں۔

ملنے کا پتہ۔ منیجر کارخانہ دلربائے عالم جنتری رجسٹرڈ امروہہ۔ یو۔ پی۔

فقیری طلائے اعجاز

جن صاحب کو وقت پر مایوس ہونا پڑتا ہو۔ یعنی معشوق کے پاس محبت کے ارادہ سے جاتے ہوں۔ اور کسی سبب سے بوجہ ناکامی اس کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو کر واپس ہوتے ہوں۔ تو وہ اس طلاء کو استعمال کریں۔ اسکے لگانے سے صرف چند دن میں قوت باہ کا زور ہو جاتا ہے۔ اسکے علاوہ ممسک و ملذذ اس درجہ کا ہے۔ قیمت فی ڈبیہ پانچ روپیہ۔ محصولڈاک ۷ر

اقرارنامہ

ہم اقرار کرتے ہیں۔ کہ مندرجہ ذیل مشتہر کردہ ادویہ میں سے کوئی دوا استعمال کرنیکے بعد جو صاحب اپنے ایمان دہرم سے تحریر فرمائینگے۔ کہ بموجب ترکیب دوا استعمال کنگئی مگر فائدہ نہوا۔ تو ہم انکی رقم معہ محصولڈاک واپس کردینگے۔ خریداران اصحاب کو چاہیئے کہ فرمائش کے ہمراہ قیمت روانہ کریں۔ ورنہ پارسل بذریعہ وی پی بھیجا جائیگا۔ (۱) محصولڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔ مگر جو صاحب پیشگی روانہ کرینگے انکو معاف (۲) پرچہ ترکیب دوا کے ہمراہ ہوگا۔ (۳) بعض کوتاہ اندیش آرڈر دیکر وی پی واپس کردیا کرتے ہیں جس سے کارخانہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس لئے ارسال انکے واسطے یہ انتظام کیا گیا ہے۔ کہ ان کا نام مع پورے پتہ کے اشتہارات کیساتھ اول تو اخبارات میں شائع کرایا جاوے۔ دوسرے بشرط ضرورت باقاعدہ چارہ جوئی کیجاوے

فقیری طلائے مراد

اس کے چند روز کے استعمال سے آپکی وہ تمام شکائتیں جنکے بتلانے اور تحریر کرنے سے آپ شرماتے ہیں سُستی۔ کمزوری۔ لاغری ناہمواری۔ رگوں میں خراب رطوبت کا بھر جانا وغیرہ وغیرہ دور ہو کر طبیعت میں قوت و تیزی اور اُمید و امنگ پیدا ہو جائیگی۔ پھر لطف یہ ہے کہ آبلہ چھالہ وغیرہ کچھ نہیں پڑتا۔ باوجود اسقدر خوبیوں کے قیمت بہت کم ہے۔ یعنی فی شیشی صرف دو روپے آٹھ آنہ۔ محصولڈاک ۷ر

فقیری اکسیر معدہ ۔ چونکہ جملہ امراض جسم انسان میں معدہ کی خرابی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسلئے جب تک معدہ کی اصلاح نہ کیجائے تندرستی غیر ممکن ہے۔ لہذا جو صاحب ہمیشہ تندرست رہنا چاہیں۔ وہ اکسیر ہذا کا استعمال رکھیں۔ اسکے استعمال سے درد پیٹ ضعف معدہ فتور ہضم کمی اشتہاء کھٹی ڈکار آنا۔ طبیعت کا مالش کرنا۔ مثانہ کی گرمی کا کم ہونا۔ بواسیر۔ اسہال ہچکی۔ ہیضہ غذا کیوقت بدن کا گرم ہونا پیشاب کا باربار آنا ضعف دماغ ضعف بصر وغیرہ امراض دور ہو کر بھوک بڑھتی اور غذا ہضم ہوتی ہے۔ قیمت صرف ایکروپیہ فی اونس محصولڈاک ۷ر

فقیری حبوب مردمی مردانہ طاقت زائل شدہ کو واپس لانیوالی۔ مایوسیوں کو امید دلانیوالی سُست کو مرد اور مرد کو جوانمرد بنانیوالی اگر کوئی دوا ہو سکتی ہے تو یہی۔ اگر طلائے اعجاز کا بھی اسکے ہمراہ استعمال کیا جائے تو سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔ قیمت ہم گولی ۱۲ محصولڈاک ۷ر۔ دونو دوائیں ایک ساتھ طلب کرنیوالوں سے صرف للعہ۔

فقیری خاک نمایاں پرانا کیسا ہی سوزاک ہو۔ اس خاک کے صرف ۷ یوم استعمال سے آرام ہو جاتا ہے۔ اور سوزش تو پہلی ہی خوراک میں کم ہو جاتی ہے۔ قیمت فی پیکٹ ۸ محصولڈاک ۷ر

ملنے کا پتہ۔ مینیجر کارخانہ فقیری حب پارہ امروہہ یو۔ پی

خوبصورتی اور جوانی کا لطف

آپ اٹھانا چاہتے ہیں۔ تو ذیل کے مجربات جو ہمارے خاندانی آزمودہ ہیں آزمائیے۔ یا ہماری فہرست مفت طلب فرمائیے۔

پری جمال صابن (رجسٹرڈ) والی خوشبو سے چہرے اور بدن کو مہکا کر چہرے کے مہاسے داغ۔ دھبے جھائیاں دور کر کے چہرے اور بدن کو خوبصورت اور حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ فی بکس تین ٹکیہ معہ صابن دانی۔ ایک روپیہ۔ جوانی پیاری صحت اور درست کر دیتا ہے۔

زنانہ سنگھار بکس (رجسٹرڈ) یہ بکس مستورات کی زینت بڑھانے کیلئے خوشنما ڈبے کا تیار کیا ہے۔ اسمیں پانچ چیزیں اور انعام ہے۔ (۱) پری جمال ٹکیہ (۲) پری بہار شیشی ۱ تولہ (۳) پان کی بہار اڈیہ۔ (۴) مسی ۱ تولہ (۵) بال صفا صابن آمیہ اور ۶ ماشہ سرمہ نور نظر مفت فی بکس ایک روپیہ۔ علاوہ محصول ڈاک۔

طلاء لطف زندگی حضرات اس طلاء میں دنیا کی لذتیں جمع کر دی ہیں۔ اس طلاء سے مرد کو عورت سے الفت اور عورت کو مرد سے عشق ہو جاتا ہے۔ گھنٹوں لطف آتا ہے۔ فی شیشی ۳ ماشہ ایک روپیہ۔

حب مرکس ہماری عجیب و غریب کیس بل بڑھانے والی گولیاں واقعی اکسیر ثابت ہوئی ہیں۔ لذت و رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ ایک مرتبہ کھا کر بہار دیکھئے۔ فی شیشی ۱۲ عدد ۱۲ ؍

شریف بچیوں کیلئے

دس موتیوں کی مالا

یہ مالا کیسی ہے۔ جس نام کی اور کس تعلق کی ہے۔ سنئے اس کا نام: زنانہ بستہ ہے۔ اسمیں دس علمی موتی ہیں۔ جو ہو بیٹیوں کو نور علی نور بنا دیتے ہیں (۱) بسم اللہ کی کتاب (۲) کہانیوں کی کتاب (۳) کھیل کی کتاب (۴) لکھنے کی کتاب (۵) نماز کی کتاب (۶) کھانا پکانے کی کتاب (۷) تندرستی کی کتاب (۸) تہذیب کی کتاب (۹) پردے کی کتاب (۱۰) دلہن کا اصلی جہیز۔ یہ دس کتابوں کا بیش بہا مجموعہ فی جلد ایک روپیہ۔ مجلد ایک روپیہ ۴ ؍

پتہ

منیجر شہرت ایجنسی دہلی

المشتہر حکیم محمد یعقوب خاں مالک دواخانہ نورتن دہلی پری جمال منزل



ڈیرہ اسمٰعیلخاں صوبہ سرحدی کا قدیمی مشہور و معروف

سرمہ رفیق البصر رجسٹرڈ

یہ قیمتی اجزاء سے مرکب سرمہ جملہ امراض چشم کے لئے تریاق اکبر اور باریک بینوں کیلئے تحفہ بے بہا ہے۔ دھند۔ غبار۔ درد۔ سرخی۔ ککرے۔ آشوب چشم خارش وغیرہ امراض کو جڑ سے اکھیڑنا اس کا ادنےٰ سا کرشمہ ہے بغیر پرہیز۔ بچہ۔ جوان۔ بوڑھا مرد عورت مریض سب کیلئے یکساں مفید ہے۔ آنکھوں کو ٹھنڈک و تازگی بخشنے میں بےنظیر ہے۔ بینائی کو تیز کرتا ہے۔ کوئی گھر اس کی موجودگی سے خالی نہ رہنا چاہئے۔ قیمت صرف ۸ ؍ فی شیشی

ملنے کا پتہ

کارخانہ سرمہ رفیق البصر رجسٹرڈ ڈیرہ اسمٰعیلخاں صوبہ سرحد

پبلشر منشی محمد صادق مزنگ لاہور

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں

عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

اُردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ماہوار مجموعہ

بہارستان

مرتبہ

(ابوالمعانی) اختر شیرانی لافغانی

سالانہ چندہ
پانچروپے
صہ

ششماہی
تین روپے
سے

دفتر رسالہ "بہارستان" مزنگ لاہور

رشحات بهارستان جلد



میرزا عبدالحسین ... صاحب آیات بدایع

یونس سنه

۲۱

رسالہ "بہارستان" لاہور



ابو الفخر نازش رضوی ایڈیٹر "بہارستان" لاہور

جلد ۲ — نمبر ۶

فہرست مضامین بابت ماہ جون ۱۹۲۷ء

تصاویر

(۱) جناب میرزا یاس یگانہ لکھنوی

(۲) ابو الفخر نازش رضوی

ضروری نوٹ:۔ کاتب کی غلطی سے صفحہ ۱۶ کے بعد، الغایت ۲۲ کی بجائے صفحہ ۲۵ لغایت ۳۰ غلط چھپ گیا ہے۔ ناظرین تصحیح فرمائیں

...ہسپتال روڈ لاہور میں طبع ہوا۔

بہارستان سبھا

خدا کے فضل سے یوں تو "بہارستان سبھا" کے ارکین متلونین کی تعداد نہایت معقول اور ہر طرح سے تسلی بخش ہے لیکن مقام مسرت ہے کہ وقتاً فوقتاً اس بزم کے ممبروں میں اکثر اضافہ ہوتا رہتا ہے، چنانچہ اسی سلسلے میں جناب کے۔ اے۔ حمید بی۔ اے (لندن) بیرسٹرایٹ لا کا اسم گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ آپ کا ایک محققانہ اور پُر معنی مضمون "پردہ اور اسلام" کے عنوان سے قارئین کی نظروں سے گزریگا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک عمدہ اور قابل قدر مضمون ہے لیکن ہمارے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم صاحب مضمون کے ہر ایک خیال یا رائے سے متفق ہوں۔ جناب حمید کی آمد پر ہم تمام ارکین سبھا کی خدمت میں ہدیہ مبارک باد پیش کرتے ہوئے امیدوار ہیں کہ صاحب موصوف آئندہ بھی بہارستان سبھا میں رونق افروز ہوا کرینگے ؎

اے خوشا روز کہ آئی و بصد ناز آئی۔ بیجابانہ سوئے محفل ما باز آئی

خدا بخشے مولانا فطرت انصاری مرحوم و مغفور جو سبھا کے معزز ارکین میں سے تھے آہ اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس یگانہ روزگار ہستی کا ماتم جسقدر بھی کیا جائے کم ہے اور اس ناگہانی مرگ پر جتنا بھی اظہار تاسف کیا جائے تھوڑا ہے حضرت اختر شیرانی جو مرحوم کے مخلص ترین احباب میں سے ہیں۔ انہوں نے ماتم دوست کے عنوان سے کچھ سپرد قلم فرمایا ہے جو ماہ جولائی کے پرچہ میں شایع ہوگا۔

ہمیں مرحوم فطرت صاحب کے پسماندگان عزیز و احباب سے دلی ہمدردی ہے ؎ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

جناب میرزا واجد حسین صاحب یاس و یگانہ لکھنوی بہارستان کے دیرینہ کرم فرماؤں میں سے ہیں آپکا کلام دنیائے ادب میں لازوال شہرت و مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ حال ہی میں آپکا مجموعہ کلام "آیات وجدانی" کے نام سے شائع ہوا ہے جس پر کسی آئندہ نمبر میں مفصل لکھا جائیگا۔ آپکی تصویر بھی شریک اشاعت کی جاتی ہے۔

کچھ دنوں سے بہارستان کے متعلق چند غلط اور بے بنیاد افواہیں سننے میں آ رہی ہیں حقیقت حال یہ ہے کہ چند در چند وجوہات کے باعث سابق مالک نے "بہارستان" کے تمام حقوق ایک خاص معاوضہ پر احقر کے سپرد کر دئے ہیں۔ چنانچہ ماہ جون سے تمام جدید ذمہ داریاں بندہ انجام دے رہا ہے۔ سابق مالک و مینجر کا بہارستان سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ رسالہ کا دفتر بجائے "مزنگ" کے بازار سید مٹھا میں تبدیل ہو چکا ہے اسلئے تمام خط و کتابت و ترسیل زر مینجر بہارستان بازار سید مٹھا لاہور کے پتہ پر ہونی چاہئے۔

حضرت اختر شیرانی بدستور سابقہ اپنی تمام خدمات بہارستان کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ بہارستان کے بہی خواہ مطمئن رہیں۔

آئندہ نمبر سے بہارستان کی تیسری جلد کا آغاز ہوگا۔ پروردگار اس آغاز کا انجام بخیر کرے آمین ثم آمین ✦ نازش رضوی

حُسن و عشق اَور تاج و تخت

رومانیہ کا تخت شاہی ایک فتنہ گر حُسن کے رحم پر

قیس کی داستان لیلیٰ کی زبانی

از "الہلال" کلکتہ

اس وقت دنیا کے کسی ملک میں بھی وہ عجیب صورت حال درپیش نہیں ہے۔ جو ایک برس سے رومانیا کو ایک سخت داخلی اضطراب میں مبتلا کئے ہوئے ہے ملک میں ہر وقت خانہ جنگی اور خونریزی برپا ہو جانے کا اندیشہ ہے نہیں کہا جا سکتا حالات کی یہ نازک صورت حال کس حد تک پہنچ کر رکیگی؟

یہ تمام اضطراب و اختلال کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ پرنس کارل سابق ولی عہد رومانیا پر کماندارِ عشق کا بے پناہ تیر چل گیا اور وہ ایک فتنہ گر حُسن کی نگاہ برق پاش کا مقابلہ نہ کر سکا۔

عشق ازین بسیار کردست و کند!

دوران جنگ میں جب جرمن فوجیں سنجارست (دارالحکومت رومانیا) پر قابض تھیں، تو یہ شہزادہ اپنی فوج کے ایک افسر کی لڑکی پر فریفتہ ہو گیا اور اس سے اوڈیسا میں خفیہ شادی کرلی لیکن جنگ کے بعد دونوں رومانیا واپس آئے تو بادشاہ پر یہ رشتہ گراں گذرا اور اس نے علیحدگی کا حکم دے دیا۔ ملکہ اور بھی زیادہ سخت تھی۔ عرصہ تک کشمکش جاری رہی بالآخر شہزادہ کو مجبور ہو جانا پڑا اور اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ ایک شیر خوار بچہ اُس کی گود میں تھا۔ طلاق کے بعد مع اپنے بچے کے رومانیا سے جلاوطن کر دی گئی۔

اس کے بعد شہزادہ کی شادی یونانی شہزادی ہیلینا سے کر دی گئی۔ اُس وقت عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ اب ولی عہد مطمئن ہو کر شاہی زندگی بسر کرے گا۔ اور یہ ناگوار حادثہ فراموش ہو جائے گا۔ لیکن واقعات اس کے برخلاف ثابت ہوئے۔ چند ہی دنوں بعد شہزادہ کو اپنی نئی بیوی سے نفرت ہو گئی اور اُس نفرت نے عشق والفت کا ایک نیا محل ڈھونڈ نکالا۔ دسمبر ۱۹۲۵ء کی صبح کو اچانک معلوم ہوا کہ شہزادہ سنجارست سے پوشیدہ نکل گیا

ہے۔ اور میڈم لوبسکو نامی ایک عورت بھی اس کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔ شہزادہ کی ایک تحریر اُس کی نشست کے کمرہ سے ملی۔ اس میں لکھا تھا کہ میں اب ولی عہدی سے دست بردار ہوجاتا ہوں۔ جس ولی عہدی سے مجھے اپنی زندگی کی ابتدائی راحت بھی نہیں مل سکتی، بہتر ہے کہ اُسے کسی دوسرے کے لئے چھوڑ دوں!

اس واقعہ نے تمام یورپ میں ہلچل مچا دی ۴ جنوری ۱۹۲۶ء کو رومانی پارلیمنٹ کا جلسہ ہؤا اور اُس نے طے کیا کہ شہزادہ کا پانچ برس کا لڑکا جو پرنس ہلینا کے بطن سے ہے ولی عہد مقرر کیا جائے۔ ساتھ ہی اعلان کیا گیا کہ دس برس کے لئے پرنس کارل کا داخلہ رومانیا میں ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔

پرنس پر یہ کاندہ دائی شاق گزری اب وہ اپنے ملک میں واپس آنا اور اپنا حق واپس لینا چاہتا ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک دو گروہوں میں بٹ گیا ہے حلقۂ حکومت پرنس کے خلاف ہے، مگر رعایا کی اکثریت اس کی حمایت پر تلی ہوئی ہے۔ پرنس کی مخالفت میں سب سے زیادہ سرگرم خود اس کی ماں ہے۔ اس ملکہ کی سختی اس حد تک پہنچ گئی ہے۔ کہ اُسے دل میں خنجر رکھنے والی ماں، کے لقب سے خود رومانی پکارنے لگے ہیں۔

ولی عہد کی موجودہ روش کی تمام ذمہ داری اس کی نئی محبوبہ میڈم لوبسکو کے سر ڈال دی گئی ہے۔ یورپ کے اخبارات اس کے خلاف مضامین شایع کر رہے ہیں۔ اور اُسے خوفناک ساحرہ" اور "قزاق" کا لقب دیا جا رہا ہے۔ وہ سال بھر تک تو خاموش رہی، لیکن اب پہلی مرتبہ زبان کھولی ہے حال میں ایک انگریز اخبار نویس خاتون اس سے پیرس میں ملی تھی۔ اس خاتون نے اپنی ملاقات کی سرگذشت حسب ذیل بیان کی ہے۔

"میں نے رومانیا کا تخت شاہی نہیں ہلایا۔ نہ پرنس کارل میری وجہ سے تخت شاہی سے دست بردار ہؤا ہے جیسا کہ دنیا نے ہمارے دشمنوں کے کہنے سے یقین کر رکھا ہے۔ میں نہ تو ساحرہ ہوں نہ قزاق ہوں میں محض پرنس کی ایک مخلص دوست ہوں۔ میں پرنس کے فرائض کی راہ میں کبھی روک نہیں بن سکتی"

"میں نے پرنس کارل کو تخت شاہی سے علیحدہ نہیں کیا" میڈم نے کہا "میں اُنہیں بادشاہ بننے سے ہرگز نہیں روکتی۔ میں تو محض اُن کے رنج میں شریک اور جلاوطنی کی رفیق ہوں۔ اس سے زیادہ میری کوئی حیثیت نہیں،،

انگریز خاتون لکھتی ہے۔ مڈم لوبسکو پیرس کے مضافات میں مقیم ہے مکان اچھا خاصہ دو منزلہ ہے۔ مکان کے گرد آہنی احاطہ ہے۔ اور اس میں مضبوط دروازے لگے ہیں۔ ہمیشہ خفیہ پولس کے دو آدمی نگرانی کرتے ہیں پھاٹک کی کنجی ایک وفادار دربان کے پاس رہتی ہے وہی کھولتا اور بند کرتا ہے۔

مکان کے اندر میں نے ہر چیز آرام دہ اور گھریلو

پائی۔ نرم ریشمی فرش بچھا تھا۔ جا بجا نفیس کرسیاں رکھی تھیں۔ خوبصورت گلدستے قرینے سے میزوں پر چنے تھے۔ غرضکہ گھر کی مجموعی ہیئت صاف بتا رہی تھی کہ اس میں کوئی باسلیقہ عورت رہتی ہے۔

میرے لئے دروازہ کھلا۔ میں معترف ہوں کہ میڈم لوبسکو کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر میں دم بخود رہ گئی یہی وہ سُرخ سر والی ساحرۂ حُسن ہے جس نے رومانیا کی پوری سلطنت اپنی چشم و ابرو کے ایک اشارہ سے ہلا ڈالی! یہی وہ شہرۂ آفاق مگر پُر اسرار عورت ہے جسے بہت کم آدمیوں نے دیکھا ہے۔ مگر سب نے اُس کے بارے میں خیال آفرینی کی ہے! اسی کی نسبت مشہور ہے۔ کہ اس کی جانستاں اداؤں نے مستقبل کے ایک بادشاہ سے اُس کا تاج و تخت چھڑوا دیا! میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں نے اس کی جو تصویر اپنے ذہن میں کھینچ رکھی تھی، وہ اس سے بالکل مختلف نکلی۔

یہ ایک نہایت حسین عورت ہے۔ عُمر بیس برس سے بھی کم ہوگی۔ بال سُرخ نہیں ہیں۔ جیسا کہ عام طور پر مشہور ہوگیا ہے۔ اُس کے بالوں کا رنگ پکّے گیہوں کا رنگ ہے۔ جب ڈوبتے ہوئے سورج کی زریں شعاعوں سے وہ چمکدار ہو جاتا ہے۔ چہرہ کے گرد گھنے، ریشمیں، سُنہری، بالوں کا ہجوم ہے بال نہایت شاندار ہیں نئے فیشن کے خلاف اپنی پوری درازی رکھتے ہیں۔ وہ عورت نہیں ہے۔ گلاب کا نازک، تازہ، شگفتہ، خنداں، اور دلفریب پھول ہے!

اُس نے مجھے دیکھتے ہی جوش کے ساتھ کہا۔

"میرا نام ایلن ہے" ایلن واقعی اپنے پورے معنوں میں منظرِ جمال ہے قد درمیانی، جسم سڈول، نہ فربہ نہ لاغر، ہاتھ پاؤں تناسب واعتدال کا نمونہ۔ اُس کا رنگ صاف بتا رہا تھا کہ یہودی نہیں ہے جیسا کہ مشہور ہو گیا ہے۔

میرے خیال میں اُس کی سب سے زیادہ عجیب چیز اُس کی آنکھیں ہیں۔ سچ مچ کو سحرکار، جادو بھری آنکھیں، نہ چھوٹی نہ بڑی، صاف اور سُنہری، دراز پلکوں کے نیچے ساکن لطیف ابروؤں کے سایہ میں مطمئن، لیکن ہزاروں معانی و مطالب حُسن سے لبریز!

اپنے خندۂ جانستاں سے بجلیاں گراتی ہوئی میرے استقبال کو بڑھی۔ رسمی سلام و کلام کے بعد ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور بغیر کسی انتظار کے اپنی باریک، ٹھنڈی، مگر سنجیدہ آواز میں گفتگو شروع کر دی۔

"اَب مجھے بے لاگ حقیقت کا اعلان کر دینا چاہیئے" اُس نے کہا "میں بہت دن خاموش رہی لیکن کب تک خاموشی کے ساتھ دنیا کی تہمتیں برداشت کرتی رہوں؟ میں نے سخت عذاب جھیلا ہے۔ آہ! کیسا ناقابلِ تحمل عذاب! عالمگیر انسانی تحقیر کا عذاب! دشمنوں نے دنیا بھر میں مشہور کر دیا ہے کہ میں ایک بدچلن اور آوارہ گرد عورت ہوں! کیا میں بدچلن عورت ہوں؟ یہ کیسی خوفناک تہمت ہے!"

اب اُس کے چہرے پر ہلکی سی زردی چھا گئی،

"لوگوں نے سب ہی کچھ کہا اور لکھا۔ وہ کونسا بُرا لفظ تھا۔ جو میری نسبت نہیں لکھا گیا۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟"

ایک لمحہ خاموشی کے بعد اس نے پھر تقریر شروع کی۔

"دشمنوں نے دنیا کو یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ مجھ میں وہ تمام رذالتیں جمع ہیں جو کسی عورت میں ہو سکتی ہیں۔ میں ساحرہ ہوں۔ غارت گر ہوں۔ آوارہ ہوں۔ ہرجائی ہوں۔ پرنس کارل کو برباد کرنے والی ہوں۔ اُس کی بیوی بچے سے اُسے جدا کرنے والی ہوں۔ میں اُسے بھگا لائی ہوں۔ اُس کے خاندان میں پھوٹ ڈالنے والی ہوں۔ آہ! غریب و ناتواں ایلین رومانیا کی جملہ مصائب کی تنہا ذمہ دار ہے! جب میں اپنی اُنگلی یوں ہلاتی ہوں (اُس نے اپنی مخروطی انگلی اٹھا کر کہا) تو رومانیا کا قدیم شاندار تخت شاہی لرز جاتا ہے۔ اُلٹ کر پاش پاش ہو جاتا ہے!"

اُس نے ایک غمناک قہقہہ مارا، "بلاشبہ یہ عجیب ہے اگر ہولناک نہیں ہے"، یہ کہہ کر وہ کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر بیٹھ گئی اور سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"میں تمہیں حقیقت بتاتی ہوں۔ تم نے سُنا ہوگا میں گزشتہ سال میلانو میں تھی۔ تمام اخباروں نے لکھا۔ کہ پرنس کارل میرے ساتھ بھاگ آیا ہے۔ حالانکہ یہ قطعاً جھوٹ تھا۔ اصلیت صرف اتنی ہے کہ رومانیا میں سخت سیاسی مشکلات درپیش تھیں۔ مصائب نے پرنس کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اتفاقیہ میری اُس سے ملاقات ہو گئی۔ اُسے ایک سچے رفیق و مونس کی ضرورت تھی۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُس کی رفاقت و ہمراہی کا فیصلہ کر لیا۔"

اُس نے پہلو بدلا اور کرسی اپنی انگلی سے کریدنے لگی۔

"تم سمجھ سکتی ہو" اُس نے رنجیدہ پیرایہ میں کہا "میں کیسی سخت مشکل میں پڑ گئی تھی! صرف یہی ایک خیال مجھے تسلی دے سکتا تھا کہ سچی دوستی کے معنی ہیں نفس کی کامل قربانی اور میں اپنی قربانی کر کے فرض دوستی ادا کر رہی ہوں۔ بلاشبہ جب کبھی میں دشمنوں کی تہمتیں سُنتی تو میرا دل پاش پاش ہو جاتا تھا لیکن پھر صبر و عزم سے کام لیتی اور سوچتی ہوں کہ یہ حالت زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتی۔ دراصل دشمنوں کی یہ تمام شرارت اس لئے تھی کہ شہزادہ کو ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا جائے اس میں شک نہیں شرارت بہت دنوں تک کامیاب رہی۔ حتیٰ کہ ایسا وقت بھی ہم پر گزر چکا ہے جب اس دنیا میں ایک انسان بھی ہمارا ہمدرد نہ تھا۔"

"تم نے بروقت کیوں ان تہمتوں کی اصلیت ظاہر نہیں کر دی؟"

میں نے سوال کیا۔

"میں متکبر تھی" اُس نے تیزی سے جواب دیا "ہاں

میں متکبر تھی۔ میری خودداری کو سخت ٹھیس لگی تھی۔ میں دنیا کو مخاطب کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ میں اس دنیا سے جو تنگ دل انسانوں سے بھری ہوئی ہے نفرت کرتی ہوں میں کیوں دنیا کی کمینہ تہمت تراشیوں کے جواب میں اپنے آپ کو نمایاں کرتی؟ تم خود دیکھتی ہو معاملہ بالکل صاف تھا۔ کسی صفائی کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے یقین ہے کہ میرا دامن بے داغ ہے۔ پھر میں اپنی صفائی کی کیوں کوشش کرتی! جو آدمی اپنی صفائی کرتا ہے۔ وہ گویا خود اپنے اوپر تہمت اوڑھ لیتا ہے۔"

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔

"اس تمام قصہ کی بنیاد صرف اتفاق پر ہے بالکل اتفاقیہ طور پر پرنس سے میری ملاقات ہوگئی۔ میں پرنس سے دوستی کا رشتہ جوڑنے پر مجبور ہوگئی کیونکہ اُس وقت اُسے دوستی کی ضرورت تھی۔ میں نے کوشش کی کہ ٹھیک وہ روش اختیار کروں۔ جو ایسے حالات میں کسی مخلص دوست کی ہوسکتی ہے۔ کیا ایک دوست کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ اپنی دوستی کے لئے اپنی بریت ثابت کرے؟"

"پھر اب کیوں تم نے رائے بدل دی؟ کیا تمہارے اور پرنس کے درمیان کوئی نئی بات پیدا ہوگئی ہے یا عنقریب ہونے والی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

اُس نے شانے ہلا کر بے صبری سے جواب دیا۔

"ہمارے درمیان کوئی بات بھی واقع نہیں ہوئی۔ اور نہ کبھی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ ہمارا معاملہ ایسی محبت کا معاملہ نہیں ہے جو ہوا و ہوس کی محبت ہوا، جیسا کہ لوگ یقین کر رہے ہیں۔ ہمارا علاقہ نفس انسانی کے اُن پست درجوں سے کہیں بالاتر ہے کہا جاتا ہے کہ دوستی، حقیقی دوستی سورج کے نیچے کمیاب ہے۔ اور مرد اور عورت کے درمیان تو اور زیادہ۔ لیکن میں یہ کہنے کی جرأت کرتی ہوں کہ میں نے اس دنیا میں ایک انسان کے ساتھ دوستی کی ہے پرنس کو ایک دوست کی ضرورت تھی۔ میں اُس کی دوست بن گئی۔ اُسے اب تک دوست کی ضرورت ہے، اسلئے میں اب تک اس کے ساتھ ہوں۔ میں چونکہ اس کی دوست ہوں اس لئے اس کی تمام مصالح و فوائد کی بھی دوست ہوں، اور ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں کرسکتی کہ اس کی خوشحالیوں کی راہ میں روک ثابت ہوں،

مدم جوش سے تقریر کر رہی تھی۔ وہ مجھے یقین دلانا چاہتی تھی کہ پرنس اور اس کی بیوی ہیلینا کے ملاپ اور مفاہمت کو وہ ناپسند نہیں کرتی۔

وہ اچانک کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور چھت کی طرف نظر اُٹھا کر کہنے لگی۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ اب اس نے ایک دلربا نازنین کی جگہ اچانک ایک حکیم اور فلسفی کا لب ولہجہ اختیار کر لیا تھا۔

"دوستی اُس چیز سے بہت بلند ہے جسے محبت کہتے ہیں۔ دوستی سراسر قربانی اور اعتماد ہے، مگر محبت سراسر انانیت اور خود پرستی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب میں دیکھتی ہوں لوگ ہمارے باہمی تعلق کو عشق و محبت کا تعلق

بناتے ہیں تو میرے جذبات سخت مجروح ہو جاتے ہیں اگر ہم میں عشق ہوتا تو میں اتنی خوش نصیب اور مطمئن نہ ہوتی جتنی اس وقت ہوں۔ محبت چند ہفتے، چند مہینے، انتہا چند برس رہتی ہو۔ لیکن دوستی زندگی کا ایک ابدی معاہدہ ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے، اس کا جوش افسردہ نہیں پڑتا بلکہ اور زیادہ بڑھتا جاتا ہے"

"اعلیٰ خیال ہے" میں نے اس کی تصدیق کی "لیکن اب کیا ارادہ ہے؟ آیندہ کا پروگرام کیا ہے"؟

مڈم لوپسکو کرسی سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس گئی ریشمیں پردہ ہٹا کر سورج پر نظر ڈالی پھر لوٹ آئی۔

"سچ یہ ہے میں نے اب تک کچھ بھی غور نہیں کیا ہے" اُس نے بے پروائی سے جواب دیا" دراصل کوئی پروگرام نہیں ہے۔ قدرتی طور پر معاملہ کا دار مدار ——"

وہ اچانک رُک گئی "میں پیرس میں بہت خوش ہوں"۔ بات ٹالنے کے لئے کہنے لگی "میری دِلی تمنّا ہے کہ لوگ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ بالکل بھول جائیں۔ میں خاموش زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں"۔

یہ اُس نے سچ کہا۔ یہ عجیب عورت پیرس سے صرف پندرہ منٹ کے فاصلہ پر مقیم ہے۔ مگر تین تین ہفتہ تک شہر نہیں جاتی۔ واقعی وہ تنہائی پسند ہے۔

"میں یہاں رہنا پسند کرتی ہوں" اُس نے کہا "کیونکہ یہاں ہر طرف خاموشی ہے۔ موسم بہار میں یہ درخت ہرے بھرے ہو جائینگے۔

میں نے اس افواہ کے متعلق سوال کیا کہ دونوں عاشق و معشوق عنقریب سیاحی شروع کرنے والے ہیں۔ اُس نے جواب دیا۔

"مجھے سیاحی کا شوق نہیں ہے۔ میرے خیال میں رومانیا دنیا کا سب سے زیادہ خوبصورت ملک ہے"

درحقیقت یہ نازنین حیرت انگیز جاذبیت اور کشش رکھتی ہے کوئی شخص بھی اُس کے تاثیر جمال سے اپنی حفاظت نہیں کرسکتا۔ اُسکی شخصیت سادہ لیکن پورے معنوں میں موثر ہے۔ اس ملاقات کے بعد مجھے کوئی تعجب نہیں اگر رومانیا کا تخت شاہی اس عورت کے خوف سے تھرتھرا رہا ہے!

تضمینات

از ... صاحب حشر کاشمیری

... ہاتھ رکھے ہیں پھر بھی یہ دل دھڑکتا ہے

... بھی اسے سبب اضطراب کیا ہوگا

... ہمارا حال یہ ہے ہم بھی رو دیے ہیں ...

... اور اس سے زیادہ خراب کیا ہوگا

خُدا

(اٹلی کے مشہور محب وطن جوزف میزینی کی کتاب "فرائض انسان" سے)

مترجمہ

(جناب صاحبزادہ احمد سعید خاں صاحب شوق (علیگ) ٹونکی سابق ایڈیٹر روزنامہ ہمدرد دہلی)

اُس نے اس وسیع زمین کا فرش تمہارے لئے بچھا دیا ہے۔ جسے تم مادی کہتے ہو۔ یہ فرش اپنی گوناگون خوبصورتیوں اور خصوصیتوں کی وجہ سے ایک کشش رکھتا ہے۔ اور ع

ہر ورق دفتریست معرفت کردگار

کے مطابق اس کا ہر ہر ذرہ زندگی کا ایک مخزن ہے یہ وہ زندگی ہے جو کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ زندگی ہے۔ جو اللہ تعالےٰ کی طبیعت و قدرت کا ایک نمونہ ہے اور اس کے وجود کا ایک ناقابل انکار ثبوت ہے۔ لیکن تمہارے دنیوی اعمال کا جائزہ ضرور لیا جانے والا ہے۔ تمہارا وجود صنعت الٰہی کا مظہر ہے۔ تمہارے اعمال کے تناسب کے مطابق قدرت الٰہی زیادہ عمدگی سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس نے تم میں ایسی ہمدردیاں رکھی ہیں جو کبھی ختم نہیں ہو سکتیں۔ اس نے تم میں تاثیر کی ایک حالت پیدا کی ہے۔ کہ دوسروں کی مصیبتوں سے تم تڑپ جاتے ہو۔ دوسروں کی مسرتوں سے تم کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ظالموں کے خلاف تم میں غیظ و غضب کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور صداقت کے لئے غیر مختتم محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کے لئے عقیدت پیدا ہوتی ہے جو کسی غیر معلوم صداقت کا اظہار کرتے ہیں۔ تم ان لوگوں پر فدا ہونے کے لئے تیار ہو جاتے ہو۔ جو کسی نامعلوم صداقت کے اظہار کے بعد خلق اللہ کی نفع رسانی کے لئے اسے عملی جامہ پہناتے ہیں تم ان لوگوں کا انتہائی مذہبی اعزاز و احترام کرتے ہو۔ جو گو ایک صداقت کے اظہار اور اسکو عملی جامہ پہنانے میں فتحمند نہیں ہو سکتے لیکن اس مقصد کی تکمیل میں کوشش کرتے ہوئے ایک شہید کی طرح اپنی جان نثار کر دیتے ہیں ......

لیکن اس سب کے باوجود تم اپنے اس مقدس مقصد کے شواہد و علالت کو جھٹلاتے اور انکار کرتے ہو جس کے لئے خدا تعالےٰ نے تم کو پیدا کیا ہے۔ اور ہمیں نصیحت کرتے ہو۔ کہ ہم اپنی تمام طاقتیں اندرونی صفائی کیلئے صرف کریں۔ جو انفرادی طریقہ سے تقریباً ناممکن ہے تم مذکورہ خدائی مظاہر پر طعن تشنیع کرتے ہو۔ تو کیا تمہارا خیال ہے۔ کہ خدا تعالےٰ ایسے لوگوں کو سزا نہیں دیتا؟ کیا غلام ذلیل نہیں ہوتا؟ کیا دن بھر کام کرنے والے مصیبت زدہ مزدور کی لطف زدہ جسمانی خواہشات اور

نفس پرستیوں میں فنا نہیں ہوتی ہے؟ یہ وہ خواہشات نہیں جنکو تم مادی سمجھتے ہو۔ یہ بدنصیب مزدور جہالت کی تاریکی میں اپنی عزیز اور قیمتی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے!

کیا روس اور پولینڈ کے غلام میں عقائد کے اعتبار سے کوئی فرق ہے؟ یہ دونوں اپنے ملک اور آزادی کے لئے بے سوچے سمجھے جنگ کرتے ہیں؟ پاپائے رومہ کے ایک مقلد اور کسی ظالم بادشاہ کی رعایا کے ایک فرد کی غلامی میں کوئی فرق نہیں ہے بارہویں صدی کی جمہوریہ لمبارڈی اور چودھویں صدی کی جمہوریہ فلورنٹائن کے آزاد غلاموں کی ایک حیثیت ہے۔ جہاں کہیں خدائی قوانین کی پابندی کی جاتی ہے۔ وہاں صحیح آزادی ضرور موجود ہوتی ہے۔ ایک معروف حواری کا یہ مقولہ ہے۔ جن مذہبی عقائد کی اس نے تبلیغ کی تھی اُن میں غلامی کے خاتمہ کے عقیدہ کی بہت کچھ تبلیغ کی تھی۔ اللہ تعالےٰ کو کون صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے اور کون اس کی حمد و ثنا کر سکتا ہے؟ تمہارا کوئی مذہب نہیں ہے۔ انسانوں کی جماعتیں ہیں جو اپنی حقیقت کو فراموش کر بیٹھی ہیں۔ اس جنگ کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ جو ایک ذلیل اور تباہ سوسائٹی کی اصلاح کیلئے کی جا رہی تھی ان فتحمندیوں کو بھلا دیا گیا ہے۔ جن سے دنیا کی کایا پلٹ گئی تھی۔ لیکن سوچ بچار کرنے والے انسانو! آج تم اس دنیا سے متنفر ہو! دقیانوسی عقائد سے خواہ کیسے ہی جدید عقائد پیدا ہوں لیکن وہ دنیا کی

موجودہ معاشری حالت میں ضرور انقلاب پیدا کر دینگے ہر جدید عقیدہ کا قدرتی تقاضا ہوتا ہے کہ وہ انسانی حیات کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہو۔ ہر زمانہ میں دنیا نے چاہا ہے کہ وہ خدا کی آسمانی حکومت کا آئینہ بن سکے کیونکہ دنیا والے اللہ تعالےٰ کی آسمانی بادشاہت پر ایمان رکھتے ہیں مختلف زمانوں اور وقتوں کیمطابق انسانیت کی پوری تاریخ مختلف شکلوں اور مختلف درجوں میں خود کو دُہراتی رہتی ہے۔ انجیل مقدس میں ایک دعا کے الفاظ یہ ہیں:-

"اے خدا! تیری زمین کی بادشاہت تیری آسمانی بادشاہت کا ظہور ہے"

"اے خدا! تیری زمین کی بادشاہت تیری آسمانی بادشاہت کا ظہور ہے" ان الفاظ کو اچھی طرح یاد رکھو اور بمقابلہ ماضی کے حال میں ان کی صحت ثابت کرو۔ برادران! یہ الفاظ تمہارا عقیدہ ہوں اور یہی الفاظ تمہاری زبانوں پر بطور دعا کے جاری رہیں۔ ان الفاظ کو دوہراتے رہو۔ اور انپر اس طرح عمل کرو۔ کہ الفاظ مذکور کا حقیقی مطلب عملاً ادا ہو سکے ان لوگوں کی باتوں کو وقعت نہ دو۔ جو مجہول توکل اور ترک دنیا کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور ہر دنیوی طاقت کے سامنے سر بسجود ہو جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اور بے سمجھے بوجھے کہہ دیتے ہیں کہ

"بادشاہ کی اطاعت اس کی اطاعت کے اصول
کے مطابق کرو۔ اور خدا کی اطاعت اسکی اطاعت کے اصول کے
مطابق کرو لیکن کوئی ان لوگوں سے پوچھے۔ کہ آیا
کوئی ایسی اطاعت ہوسکتی ہے۔ جو خدا کے لئے
ہو اور خدا کے سوا کسی اور کے لئے ہو؟
بادشاہ کی اطاعت کوئی چیز نہیں ہے۔ البتہ
خدائی قوانین کے ماتحت اور مطابق اولی الامر کی
اطاعت کی جاسکتی ہے۔ اولے الامر کے معنے
ہیں دنیوی طاقت اور نظام حکومت لیکن اِسکے
اختیارات واحکام خدائی قوانین کے مطابق ہونے
چاہئیں۔ لیکن جب اولے الامر اپنی طاقت
اور اختیارات کا بیجا استعمال کرے اور اپنی حدود
سے متجاوز ہو۔ تو پھر تمہارا حق ہی نہیں ہے۔ بلکہ
تمہارا فرض ہے۔ کہ اس کو بدل دو۔ (باقی)

نوائے مضطر

از افتخار الشعرا افتخار الملک خان بہادر حضرت مضطر خیرآبادی مرحوم

قبلِ پیدائش ترے ملنے میں مجبوری نہ تھی
اب تو دوری ہوگئی پہلے تو کچھ دوری نہ تھی

تم سرِ تربت رہے اور میں تہہِ تربت رہا
دونوں پردے میں رہے حالانکہ کچھ دوری نہ تھی

تیغ ناکامی نے امیدوں کے ٹکڑے کردئیے
اُس نے دل چیرا تو کوئی آرزو پوری نہ تھی

کیا کہوں قاتل تڑپتا چھوڑ کر کیوں چل دیا
وار بھی پورا نہ تھا اور تیغ بھی پوری نہ تھی

ترکِ ہستی کرکے مضطر اس سے مل جانا نہ تم
سب کہیں گے یہ تو کوئی شانِ مہجوری نہ تھی۔

نشاطِ روح

(مشاعرہ گونڈہ کی ایک غزل)

(حضرت مولانا اصغر حسین صاحب اصغر گونڈوی)

موجوں کا عکس ہے خطِ جامِ شراب میں
یا خون اچھل رہا ہے رگِ ماہ تاب میں

میخانۂ ازل میں جہانِ خراب میں
ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

باقی نہ تابِ ضبط رہی شیخ و شاب میں
اُن کی جھلک بھی تھی مری چشمِ پُرآب میں

اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں

میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں
بکھرا دیئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

وہ موت ہے، کہ کہتے ہیں جسکو سکونِ قلب
وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

اتنا ہُوا، دلیل تو دریا کی بن سکی
مانا کہ اور کچھ نہیں موج و حباب میں

میں اس ادائے مستِ خرامی کو کیا کہوں
میری نظر تو غرق ہے موجِ شراب میں

اقلیمِ جاں میں ایک تلاطم مچا دیا
یوں دیکھئے تو کچھ نہیں تارِ رباب میں

اصغر غزل میں چاہیئے وہ موجِ زندگی
جو حُسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

ضحاک

مصنف سامی بک

مترجمہ اختر شیرانی

(ایک ترکی ڈراما)

(مسلسل)

پہلا منظر

سولھواں نظارہ

(پچھلے افراد ـــــ قحطان)

ضحاک ۔ سب کام ٹھیک ہوگیا؟

قحطان ۔ حضور کے فضل سے سب کچھ ہوگیا!

ضحاک ۔ میری سلطنت میں کوئی جمشید کا پیرو تو باقی نہیں رہا؟

قحطان ۔ حضور! تمام شہروں میں جمشید کے جسقدر عبادت خانے تھے، سب خراب کردیئے گئے ہیں، اور ان کی جگہ ہمارے معبودوں کی پرستشگاہیں بنادی ہیں! ہر شخص کو مجبور کیا گیا ہے۔ کہ وہ ہمارے معبودوں کی پرستش کرے! آج فارس کے تمام شہروں میں ہمارے معبودوں کی پرستش ہورہی ہے لیکن.....

ضحاک ۔ لیکن کیا؟

قحطان ۔ حضور! کوہستان کے چرواہے، دیہات کے کاشتکار، اور جنگلوں کے بدوی ابتک جمشید کے مذہب پر قائم ہیں!

ضحاک (غصے سے) جمشید کا مذہب باقی ہے اور وہ اسپر قایم ہیں؟؟؟.....آہ، یہ ہے اس خوفناک خواب کی ـــــ تعبیر؟

قحطان ـــــ عالیجاہ؟

ضحاک ۔ نہیں، نہیں، میری حکومت میں میں نہیں چاہتا کہ ایک ذی روح بھی جمشید کا نام لیوا باقی رہے!

پرویز ۔ (اپنے آپ) الٰہی تیری پناہ!

ضحاک ۔ قحطان! تیرا فرض تھا کہ تو تمام دنیا سے جمشید کا مذہب چھڑا کر واپس آتا!

قحطان۔ حضور سب نہیں چھوڑتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ضحاک۔ سب نہیں چھوڑتے! اسی لئے تو تجھے مقرر کیا گیا تھا۔ کیا میں نے نہیں کہا تھا۔ کہ جو لوگ جمشید کا مذہب نہ چھوڑیں انکو سزا دینا۔

قحطان۔ بے شک حضور! میں سزا دیتا مگر میرا زور نہیں چلا۔ جو مختصر فوج کہ میرے ساتھ تھی اس کام کے لئے کافی نہ تھی، پھر ستم یہ تھا۔ کہ میرے سپاہیوں کا ذخیرہ خوراک ختم ہو گیا تھا اور وہ اکثر بھوکے رہتے تھے!

ضحاک۔ کیسی عجیب بات! میری سلطنت میں اور میری ہی فوج بھوکی رہے کیا مالگذار مر گئے تھے؟ آخر فوج کیوں بھوکی رہی؟ ۔ ۔ ۔ ۔ تم جس گاؤں میں پہنچتے، جو چیز چاہتے نہ لے سکتے تھے۔؟؟

قحطان۔ حضور! اس صورت میں گاؤں والے فساد کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آئندہ زیادہ فوج ساتھ رکھونگا!

ضحاک (غضبناک ہو کر) دوبارہ کیوں بکتا ہے! تو جانے اور فوج جانے! انکی ضروریات کا رفع کرنا تیرا فرض ہے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو! میں نہیں چاہتا۔ کہ میری سلطنت میں ایک شخص بھی جمشید کا پیرو زندہ رہے! سمجھے! انہیں ہمارے معبودوں کی عبادت کو پھیلانا چاہیے۔ کیونکہ آج میرا تخت شاہی پر نظر آنا، سب کچھ انہی کی بخششوں کا نتیجہ ہے!!

قحطان۔ عالیجاہ!

ضحاک (بات کاٹ کر) دیکھو میں زیادہ کہنا پسند نہیں کرتا، تمہیں ایک گھڑی کی مہلت دیجاتی ہے، جاؤ انتظام کرو، اگر تم نے فوراً کوئی صورت نکال لی تو تمہیں انعام دیا جائے گا، اور اگر نہ نکالی تو تمہارا سر گردن سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

قحطان۔ (ایک عجیب غریب کپکپاہٹ کے ساتھ) آہ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (ضحاک کے قدموں پر گر جاتا ہے) حضور! حضور!!

ضحاک۔ زیادہ وقت ضائع نہ کرو، فوراً جاؤ اور بندوبست کرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی لئے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے، موبد آنے والے ہیں، تعبیر بتلائینگے، اسوقت تک تم بھی کوئی انتظام کرکے آجاؤ گے! اگر تم کوئی تدبیر نہ کرسکو، ضحاک کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتے آنا۔ (قحطان کا ۔ ۔ ۔ اٹھتا ہے) اگر تم نے کوئی تدبیر سوچ لی ۔ ۔ ۔ اپنی دامادی کا شرف بخشوں گا!

پرویز (ایک فوق العادات اضطراب ۔ ۔ ۔ آپ) کیا؟ داماد؟؟ ۔۔۔۔ اس کو!

قحطان (اپنے آپ) کیا دامادی کا شرف ۔ ۔ ۔ مجھ کو؟ ۔۔۔۔ آہ ۔۔۔۔

ضحاک۔ جلد جاؤ کچھ ۔۔۔۔۔۔ انتظام کرو

قحطان۔ جو حکم! (ضحاک کے قدموں کے ۔ ۔ ۔ زمین چوم کر واپس جاتے ہوئے اپنے ۔ ۔ ۔

آہ .... ہ

خدا کی دین کا موسٰے سے پوچھیئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے!

یہ بات تو میرے شان گمان میں بھی نہ تھی — خوب چہرے سے شادی کرنا — آہ! — اسکے سامنے تو مرنا بھی دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے؟ ..... آہ ...... کچھ دنوں کے بعد یا خوب چہر کی گود میں مزے کی نیند آئیگی، یا جلاد کی خوفناک چھری موت کا پیغام سنائیگی ؟ ؟ ! ! ؟ غیرت ؟ ؟

(دائیں طرف سے باہر جاتا ہے)

سترھواں نظارہ

پچھلے افراد — (قحطان کے سوا)

ضحاک - (اپنے آپ) بے شک! اس شخص نے میری بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں! اگر اسنے یہ مہم سر کر لی تو میں ضرور اسے اپنا داماد بناؤں گا! اس کو اپنی لڑکی دوں گا! اور اگر اس نے کچھ نہ کیا اور کہا کہ مجھ سے یہ خدمت نہیں ہو سکتی تو میں اس کا سر کاٹ لوں گا۔ اور پھر ..... اس کی جگہ جس شخص کو مقرر کرونگا جو اس کے فرائض اچھی طرح انجام دے سکیگا، وہ میرے پاس ہے! میں اس کو جانتا ہوں! ...... مگر یہ خواب ...... ؟ .... آہ! .... ! (فرہاد دائیں طرف سے داخل ہو کر کھڑکی کے قریب جاکر زمین کو بوسہ دیتا ہے)

اٹھارہواں نظارہ

پچھلے افراد — فرہاد)

ضحاک - موبد ابتک نہیں آئے؟

فرہاد - حاضر ہیں، عالی جاہ!

ضحاک - فوراً بلاؤ!

فرہاد - جو حکم - (باہر جاتا ہے اور پھر چند موبدوں کے ساتھ (جن کا لباس سیاہ، جُبّے بلند، اور گیسو طویل ہیں، اور ہاتھوں میں لانبے لانبے عصا ہیں) داخل ہوتا ہے موبد زمین کو بوسہ دیکر کھڑے ہو جاتے ہیں)

انیسواں نظارہ

(**پچھلے افراد** — موبد)

ضحاک - اے میرے معبودوں کے خاص پرستارو! تم ہمارے معبودوں کی مہربانی کے سایہ میں تمام ظاہری و باطنی رموز و اسرار سے واقف ہو!

موبدوں کا پیشوا - ولی نعمت! ارشاد فرمائیے! جو حکم ہوگا ہم اپنے مقدس معبودوں کے فضل وکرم سے اس میں کوشش کریں گے، حکم دیجیے!

ضحاک - میں نے رات کو ایک ہولناک خواب دیکھا ہے!

تمام موبد (ہمزبان ہو کر) خیر ہے! معبودوں نے چاہا تو!

ضحاک - خیر تو نظر نہیں آتی - اگر معبودوں نے ہی

خیر کی تو...... دوسری بات ہے!

فرہاد۔ (اپنے آپ) انشاء اللہ، بندوں کے حق میں ضرور کوئی خیر کی بات ہی ہوگی۔

موبدوں کا پیشوا۔ ارشاد فرمائیے!

ضحاک۔ میں نے خواب میں دیکھا۔ کہ میں ایک چرواہا ہوں۔ پہلے میرے پاس دس پندرہ بکریاں تھیں، پھر میں..... کئی ہزار بکریوں کا مالک ہوگیا، میرا ایک بہت ہی وفادار کتا تھا۔ اس کتے نے مجھے خواب میں کہا کہ جب تیرے پاس پانچ دس بکریاں تھیں تو تو مجھے روٹی دیتا تھا، مگر اب جبکہ تو اس قدر بکریوں کا مالک ہوگیا ہے، کیا اب بھی صرف روٹی ہی ملے گی، گوشت نہ دے گا! یا تو مجھے گوشت دے، یا میں تیرے گلوں کی حفاظت نہیں کروں گا! اور بھیڑیا آکر ان سب کا خاتمہ کردیگا...... اس خواب میں بہت سے معنے چھپے ہوئے ہیں غور کرو! اور اس کی سچی تعبیر بتلاؤ، اس خواب نے مجھے ڈرا دیا ہے!

فرہاد۔ (اپنے آپ) دیکھیں! مزاجداں اس معاملہ میں کسقدر سچ کہتے ہیں اور کس حد تک مزاج دانی برتتے ہیں؟

موبدوں کا پیشوا۔ (کچھ دیر سوچنے کے بعد) عالیجاہ! اگر اجازت مرحمت ہو تو جو کچھ کہ بندگان عالی کو کشف ہوا ہے، اس کی تعبیر عرض کیجائے!

ضحاک۔ جلد کہو۔ (اپنے آپ) اگر اُس نے غلط کہا۔ تو سب سے پہلے اسی کا سر کاٹا جائے گا۔

موبد۔ حضور! یہ ہمارے معبودوں کی طرف سے ایک شکایت ہے،۔ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ جس زمانہ میں حضور جزیرۃ العرب میں ایک ذرا سی جماعت کے حاکم تھے، ہمیں بکریوں کا مغز کھانے کو ملتا تھا، اب کہ حضور فارس کی سی عظیم الشان سلطنت کے بادشاہ ہیں —— بکریوں کا مغز دینا حضور کے شایان شان نہیں جب حضور کے قبضہ میں اتنے آدمیوں کی جانیں ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہمیں آدمیوں کا مغز کھانے کو نہ دیا جائے ——؟....!.....؟ (فرہاد حیرت بھری آنکھوں سے موبدوں کی صورت دیکھتا ہے)

ضحاک۔ تعجب! کیا یہ تعبیر صحیح ہے؟

موبدوں کا پیشوا۔ غلام کو تو یہی الہام ہوا ہے!

ضحاک۔ (دوسرے موبدوں سے) تمہاری کیا رائے ہے؟

دوسرے موبد۔ خانہ زادوں کا بھی یہی خیال ہے!

فرہاد (غیض و غضب سے اپنے آپ) آہ! ملعونو! بے ایمانو!

ضحاک۔ اب کیا کرنا چاہیے؟

موبدوں کا پیشوا۔ خواب کا جو حکم ہے اُس کی تعمیل ہونی چاہیئے!

ضحاک۔ بہت خوب..... مگر... (قحطان باہر کی طرف سے داخل ہوتا ہے)

بیسواں نظارہ

پچھلے افراد ——— قحطان

ضحاک۔ (قحطان سے) آہا! ادھر آؤ! ما بدولت نے تمہارے لئے ایک نئی خدمت تجویز کی ہے مگر پہلے یہ بتلاؤ کہ تم کیا کچھ کر آئے؟ اگر کوئی مناسب علاج سوچ لیا ہے تو اس کا صلہ موجود ہے۔ اور اگر ناکام آئے ہو تو جلادوں کا ساتھ نہ لانا حماقت ہے!

پرویز۔ (اپنے آپ) خدا نے چاہا تو کوئی علاج نہ کر سکا ہوگا؟

قحطان! عالی جاہ! . . . .

ضحاک۔ نہیں کر سکے؟ یہی بات ہے؟ ——؟؟

قحطان۔ (جس کا خوشی کے مارے سانس پھول رہا تھا) سب کچھ! حضور! سب کچھ!!

ضحاک۔ کہو! میں بھی تو سنوں!

قحطان۔ حضور! کل ایک نئی فوج تیار کروں گا جس کو نہ تنخواہ دیجائیگی۔ نہ خوراک! اس فوج کو کوہستانوں اور دیہات میں پھیلا دیا جائیگا، یہ لوگ جس جگہ بھی جمشید کے مذہب کے کسی پیرو کو پائینگے اُن کے مویشی چھین لینگے . . . یہ مال غنیمت، ان کی تنخواہ اور خوراک کا کافی نعم البدل بھی ہو جائیگا، اور اُن کی معاش کا وسیلہ بھی! حضور! کسانوں کے حق میں اس سے زیادہ سخت کوئی سزا نہیں ہو سکتی یہ لوگ اسی سے ڈرتے ہیں، میرا خیال ہے۔ بعض بعض تو فوج والوں کی شکل دیکھ کر ہی جمشید کا مذہب چھوڑ دینگے اور ہمارے معبودوں کی عبادت کرنے لگینگے!

فرہاد۔ (غصہ میں اپنے آپ) افسوس! پلید کتے!

ضحاک (موبدوں سے) اچھا تو اب اس حکم کی تعمیل کس طرح ہوگی؟

موبدوں کا پیشوا۔ حضور! اس میں کونسی دقت کی بات ہے؟ جس طرح پہلے روزانہ دو بکرے ہمارے معبودوں کے سامنے قربان کرکے ان کو ان بکروں کا مغز کھلایا جاتا تھا، اسی طرح اب دو لڑکوں کا ٹکڑے کر اُن کا مغز کھلایا جایا کریگا!

فرہاد۔ (غصہ اور بےبسی کے عالم میں اپنے آپ) آہ! او ملعونو!

پرویز۔ (اپنے آپ) الٰہی تیری پناہ!

ضحاک۔ یہ لڑکے کہاں سے آئیں گے؟

قحطان۔ رعایا سے لئے جائینگے حضور! خاص کر وہ لڑکے جو جمشید کے مریدوں سے تعلق رکھتے ہیں!

فرہاد۔ (اپنے آپ) او میرے خدا! او جمشید کے خدا!! کیا تو مجھے اس دنیا میں انتقام کا مزہ چکھنے سے محروم رکھیگا؟؟

ضحاک۔ تمام!

موبد۔ بجا! درست!

پرویز۔ آہ!

ضحاک۔ ان قربانیوں کا انتظام فرہاد کے سپرد کیا جائے!

قحطان۔ ہائے! ہائے!

فرہاد۔ (گھبرا کر اپنے آپ) میرے سپرد!؟ الٰہی خیر! الٰہی تیری پناہ!........مگر.......! اُس مقصد! اُس فرض کی خاطر مجھے یہ بھی قبول کرنا پڑیگا!

ضحاک۔ سمجھے؟ فرہاد!

فرہاد۔ جو حکم حضور! (اپنے آپ) آہ! او میرے خدا! ظالم کے ظلم کا کبھی خاتمہ بھی ہوگا؟؟

ضحاک (جانے کے ارادہ سے کھڑا ہو کر) موبدو! میں تمہارا بہت ممنون ہوں! معبود تمھاری حفاظت کریں! (موبد شکریہ کے انداز میں سر جھکا لیتے ہیں)

قحطان۔ (اپنے آپ) کیا اپنا وعدہ بھول گیا؟

ضحاک۔ قحطان! میں نے تمہاری تدبیر بہت پسند کی، اسے بہت جلد عمل کرو! میں بھی اپنا وعدہ پورا کرونگا۔

پرویز (اپنے آپ) آہ!

قحطان۔ (زمین چوم کر) حضور!

ضحاک (موبدوں سے) کل آپ لوگ یہاں تشریف لائیں! میری لڑکی کی قحطان سے شادی کی رسم ادا ہوگی! (بائیں طرف چلا جاتا ہے۔ اور پرویز کے سوا تمام نوکر پیچھے پیچھے روانہ ہوتے ہیں)

موبد۔ جو حکم! (قحطان کے ہمراہ دائیں طرف سے باہر چلے جاتے ہیں پرویز دیر تک مردہ کی طرح دیوار کے سہارے کھڑا رہتا ہے)

اکیسواں نظارہ

فرہاد ———— پرویز

فرہاد۔ (پرویز کے پاس آکر) بیٹا! تم ساتھ کیوں نہیں گئے؟..... یہاں اس طرح کیوں کھڑے ہو؟..... پرویز!!

پرویز۔ (کچھ ہوش اور کچھ بیہوشی کے انداز میں بے اختیار فرہاد کی گردن میں ہاتھ ڈال کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگتا ہے) ہائے!........ اباجان!... اباجان! ....میں مر مٹا!..... آہ اب میں زندہ نہیں رہ سکتا!.........

فرہاد۔ (ایک عجیب و غریب بے چینی سے) بیٹا!...؟ .... (اپنے آپ) اے عالم الغیب!.... یہ کیا مصیبت ہے؟

پرویز۔ اباجان! مجھے قتل کر دیجئے! یا اس جگہ سے نجات دلائیے!..... یہ جگہ میرے لئے روز بروز قید خانہ بنتی جاتی ہے!...... چھوڑیئے میں جاتا ہوں!...... اگر میں اسے بھلا سکا!.... اور اگر میں اسے نہ بھلا سکا؟ (مایوسی سے) مگر ایک علاج ہے! ایک آخری علاج!

فرہاد۔ بیٹا!........ (اپنے آپ) کیسی عجیب حالت ہے!...... افسوس میری عمر بھر کی محنت اکارت جائیگی!..... (بلند آواز سے) بیٹا!

کیا بات ہے؟ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟

پرویز- (مایوسی کے عالم میں روتے ہوئے) نہیں ٹھہر سکتا! ایک لمحہ کے لئے نہیں ٹھہر سکتا! اباجان میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا! میں اپنی آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھ سکتا!

فرہاد- کیا نہیں دیکھ سکتے؟ بیٹا! تم کیا نہیں دیکھ سکتے؟

پرویز- غیر کے ساتھ!! آہ غیر کے سا تھ!! ساتھ جانا!!

فرہاد- (بے چینی سے) کیا کہتے ہو؟ بیٹا! میں بالکل نہیں سمجھا!

پرویز- آہ اباجان! اب میں نہیں چھپا سکتا!... میں محبت کرتا ہوں!... محبت!... آہ، میں خوب چہر سے محبت کرتا ہوں!......

فرہاد- (نہایت مایوسی سے) انصاف! انصاف!!

(دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کے ایک طرف کچھ سوچتا ہے)

پرویز- (فرہاد کے قریب آکر) اباجان! میں نے جو کچھ کہا، یہ اک جنون ہے! بے شک جنون!!... آہ ایک غلام! ایک چرواہے کا لڑکا اور ایک شہزادی سے محبت!! یہ کیسی جسارت! کیسی گستاخی ہے؟!....

فرہاد- (مایوسی سے سر نیچا کر کے اپنے آپ) ایک غلام!! .... ایک چرواہے کا لڑکا!!..... انصاف! انصاف!!

پرویز- (بے اختیاری سے) اباجان! میں نے بے اختیار اس سے محبت کی ہے! ہاں، میں اُس کی اور اپنی حیثیت جانتا تھا! اسی لئے میں نے اُس سے کوئی امید بھی نہ رکھی! میں محبت کرنا نہیں چاہتا تھا! کیونکہ جانتا تھا کہ آخر نا امیدی ہے! لیکن دل پر قابو نہیں چلا! آہ! میں ضبط نہ کر سکا!..... کیا کروں؟....... ان آنکھوں سے کیونکر دیکھا جائیگا کہ اس پر ایک دوسرا شخص قبضہ!... نہیں آہ! نہیں دیکھا جا سکتا! میں نہیں دیکھ سکتا!.... چلا جاؤں؟ اباجان!.... یہاں سے چلا جاؤں؟.... کچھ کیجئے! آہ میرے لئے کچھ کیجئے! یہاں سے چلا جاؤں؟.... افسوس؟ ..... وہ اباجان کا جھونپڑا!!... کیسی امن کی جگہ تھی؟...... الٰہی تیری پناہ!.... مجھے وہاں پہنچا دیجئے!!.... اوف!!..... آدمی کو اپنی حیثیت سے بڑھ کر پاؤں نہیں پھیلانے چاہئیں! انسان کی بہتری اپنے ہی ہمجنسوں میں..... اپنے ہی عزیزوں کے ساتھ رہنے میں ہے!.... میں نے جب سے اپنے باپ کے جھونپڑے کو چھوڑا ہے!.... نہ میرا ذہن بجا ہے.... نہ میرا دل قابو میں!.....! جاؤں؟.... جاتا ہوں! (جانے لگتا ہے)

فرہاد- (پرویز کو روک کر) ٹھہرو!.... تم بے اجازت نہیں جا سکتے بیٹا!.... فکر نہ کرو!.... میں نے ایک تدبیر نکالی ہے!.... صرف اس کو بھلا دو!

...... اس کو بھلا دو! اور رہو سہو! کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا!

پرویز- جب وہ میرے لئے اور میں اس کیلئے نہیں رہوں گا؟ تو پھر ڈر کا ہے کا؟ (رونے لگتا ہے)

فرہاد- (مایوسی سے اپنے آپ) آہ! ..... یہ مجھ پر کیسی مصیبت آئی؟ ..... (پرویز سے) بیٹا! ..... نہ روؤ! میں تمہارے لئے اجازت لے لونگا ..... گاؤں میں ایک دو مہینے رہنے سے یہ خیال مٹ جائے تو پھر چلے آنا!!

پرویز- (اپنے آپ سے) مٹ جائیگا؟ (دیوانوں کی طرح ہنسکر) نہیں! ..... اب تو یہ میری قبر ہی میں جاکر مٹے گا! (بلند آواز سے) بہت اچھا! .... ایک گھنٹہ ٹھہریئے! .... میں یہاں سے چلا جاؤں گا! ......

فرہاد- اچھی بات ہے! مگر ذرا ٹھہرو! .... تم یہاں منتظر رہو! میں ابھی آتا ہوں ..... اپنے آنسو تو پونچھ لو! ..... ذرا اچھی طرح بیٹھ جاؤ! ... کوئی کچھ خیال نہ کرے! (دائیں طرف سے جاتا ہے)

بائیسواں نظارہ

پرویز ——— (تنہا)

پرویز- (دیوار کی طرف پشت کرکے، فرش پر ٹکٹکی باندھ کر گہری فکر میں ڈوب جاتا ہے) میںنے کیا کیا کہ اس سے محبت کی؟ ..... میں نے کیا کیا کہ اس کو دل دیا؟ ...... آہ! اسدن کا تو خواب میں بھی اندیشہ نہ تھا! ..... میری صبح کی حالت اور اسوقت کیحالت میں کسقدر فرق ہے؟ ..... کیسا انقلاب عظیم؟ .... آہ! وہ اس کے باپ کا ظلم! ..... وہ موبدوں کی غداری! ..... اور وہ قحطان کی بیرحمی! .....!

..... آہ، فرار! یہاں سے فرار!! ......

فرار ہوجانا چاہیئے! ..... یہاں ایک سانپ ہے! خوشرنگ! خوبصورت سانپ! .... خوب چہر! ..... دھوکا کھانے کی جگہ نہیں ہے! ......

..... خوب چہر!! ..... خوب چہر!!

(زمین پر نظر گڑوئے حیرت سے) خوب چہر!!!

(خوب چہر بائیں طرف سے داخل ہوتی ہے)

تیئسواں نظارہ

پرویز ——— خوب چہر)

خوب چہر- (کھڑکی کے پاس آکر چپ چاپ پرویز کی حالت دیکھتی ہے) آہ! اسے کیا ہورہا ہے؟ اس طرح کیوں کھڑا ہے؟ ..... نہیں! میں اسے اس حال میں نہیں چھوڑ سکتی ..... آہ، کیا ہوگیا؟ (پرویز کیطرف چلکر پھر رک جاتی ہے) خدایا! .... میں اس کے پاس جانے کی جرأت نہیں کرسکتی! میرے ہات پاؤں کانپتے ہیں! ..... مگر الٰہی خیر! .... اُسے کچھ ہوگیا تو؟

..... ہمت کرکے پرویز کی طرف دوڑ کر کانپتی ہوئی آواز سے) پرویز!!

پرویز۔ (ہوش میں آکر آنکھیں کھولتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد خوب چہر کو دیکھ کر) خوب ،،، چہ ۔۔۔۔ ر!! (قدموں پر گر پڑتا ہے)

خوب چہر۔ الہی خیر! الہی ...... خ! (پرویز کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے) پرویز! ..... (یک بیک مضطرب ہوکر اپنے آپ کو ایک طرف کر کے اپنے آپ) یہ کیا ہوا؟

پرویز۔ (عاجزی سے) معاف کرو! آہ، معاف کرو!! اب میں تمہیں دوبارہ نہیں دیکھوں گا، اس لیئے اظہار محبت کی جرات کر رہا ہوں! .... ہاں! آج یہ آخری بار تمہاری صورت دیکھ رہا ہوں! .... میری کچھ خطا نہیں! میں جانتا تھا کہ میں تم سے محبت کرنے کے قابل نہیں ہوں! لیکن کم بخت دل پر قابو نہ پاسکا! اور میں تم سے محبت کرتا رہا! .... معاف کرو! .... میں ابھی چلا جاؤں گا! تم پھر کبھی یہ دکھڑا نہیں سنوگی! آہ تم پھر کبھی مجھے نہ دیکھو گی!

(جانے کا ارادہ کرتا ہے)

خوب چہر۔ (پرویز کے پیچھے جاکر) نہ جاؤ....!! پرویز!! ....

پرویز۔ (پلٹ کر خوب چہر کی طرف دیکھتا ہے) نہ جاؤں؟ .....؟ میں؟؟ (اپنے آپ) الہی! یہ وہ خود کہہ رہی ہے! یا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟؟

خوب چہر (ایک لمحہ تک شرگیں نظریں جھکائے رہنے کے بعد) پرویز!! کیا تم سچ مچ مجھ سے مح ......؟؟

پرویز۔ معاف کرو! چونکہ اب کبھی یہ صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوگی، ..... اس لئے میں نے اس قدر گستاخی سے کام لیا!! ...... (عاجزی سے) للّٰہ معاف کرو!!!

خوب چہر۔ (بے چین ہوکر) پرویز، مجھے آقازادی سمجھ کر گفتگو نہ کرو! یہ جو تمہارے سامنے کھڑی ہے! یہ تمہاری آقازادی نہیں ہے! ..... بلکہ ..... تمہاری کنیز!! تمہاری دعاگو! ہاں رات دن تمہارے تصور کی پرستار! ایک دکھیاری ...... !! .....

پرویز۔ (بے چینی سے) تم؟!! .... تم؟؟! .... مجھ سے محبت ....؟ تم؟؟؟ ... اللہ! کیا میں کبھی ایسا خیال کرسکتا ہوں؟؟!

خوب چہر۔ ہاں!! ہاں!! پرویز!!! .... میں تم سے محبت کرتی ہوں!! ..... آہ، میں تمہارے بغیر، زندہ نہیں رہ سکتی!! ..... نہ جاؤ! خدا کیلئے نہ جاؤ!!!

پرویز۔ (بے اختیار ہوکر) آہ، یہ فقرہ ...... میں تم محبت سے کرتی ہوں .... میں تم سے محبت کرتی ہوں!! ..... یہ جو تمہارے ہونٹوں سے نکلا ہے میری قسمت کے بدلنے کو کافی ہے!! ... اب

میں ایک نہایت خوش نصیب فقیر ہوں!!......

جاتا ہوں!! (جانا چاہتا ہے)

خوب چہر - (عقب سے راستہ روک لیتی ہے)

پرویز! جب تم مجھ سے محبت کرتے ہو! پھر کیوں جاتے ہو؟

پرویز - اس لئے کہ میں مایوس ہو گیا ہوں!!

خوب چہر - پرویز! جبکہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں! پھر مایوسی کیسی؟؟

پرویز - اس لئے کہ تم ایک بادشاہ کی نور نظر ہو! اس لئے کہ میں ایک چرواہے کا لڑکا ہوں!!

خوب چہر - پرویز! ہم پر صرف ہمارے دلوں کی حکومت ہے! تمہارے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تمہارے سوا دنیا میں کسی کا منہ نہ دیکھوں گی ؎

کبھی فراق کے صدموں سے جی نہ ہاروں گی
تمام عمر تیری یاد میں گذاروں گی!!

پرویز - آہ! یہ تو نہیں ہو سکتا - آج تم ایک اور شخص سے منسوب کی گئی ہو!......! اور میں اسی لئے جانا چاہتا ہوں!......آہ!!

خوب چہر - (عجیب و غریب گھبراہٹ سے) کیا کہتے ہو؟؟......الٰہی خیر!......کیا کہہ رہے ہو؟؟!

پرویز - (خوب چہر کے قریب جا کر بڑی مایوسی سے) خوب چہر! تمہارے والد ایک دوسرے شخص سے تمہاری شادی کر دینا چاہتے ہیں! آہ! کل تم قحطان کے سپرد کر دی جاؤ گی!!

خوب چہر - ظلم! ظلم!! انصاف! انصاف!!

(بیہوش ہو کر گرتی ہے۔ پرویز ہاتوں پر تھام لیتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

(باقی)

کیا یہ خطا ہے؟

اس نیرنگ زار دہر میں کسی چیز کو خواہ اس کا تعلق محاسن سے ہو یا قبائح سے، کبھی ثبات وقیام نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی حالت اپنے قیام کے لحاظ سے طویل ہو جائے۔ لیکن قرار دوامی ایسی چیز ہے۔ جس کو فطرت انقلاب پسند ہرگز ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ مصیبت و بلاکشی جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ تو دیں سے سرخوشی وبہجت کا دور شروع ہوتا ہے۔ بے کسی وبیچارگی پایان کار اختیار وقدرت سے بدل جاتی ہے۔ اور خزاں جب رونق گلشن کو اجاڑ دے، آشیانۂ بلبل کو جلا کر خاکستر کر دے۔ چشم نرگس۔ زلف سنبل۔ عذار گل، غرض سبکو ناک میں ملا چکے۔ تو اس کے بعد ہی فوراً بہار کا دور حکومت شروع ہو جائے گا۔ پھر دیکھئے تو وہی چمن ہے۔ اور اس کی روش عدن رونق دہی گل ہے۔ اور اس کے رخساروں کی ... کی چمک ہے۔ اور قمری کی کوکو۔ ترانہائے مسرت ہیں۔ اور نغمہ ہائے انبساط نشاط آور صحن ہے۔ اور نزہت آفریں ...

رفیقی ...

کلامِ یگانہ

(کلامِ تازہ)

(حضرت میرزا یاس یگانہ لکھنوی)

خمارِ دیدۂ غفلت مآب از من پُرس — نویدِ صبح و تقاضائے خواب از من پُرس

ز وردِ تشنہ لبی ہا شکستہ دل نہ شوم — طلسم بندیِ موجِ سراب از من پُرس

برنگِ خویش برآ و دِ حُسنِ دوست مرا — کرشمۂ نگہِ بے حجاب از من پُرس

منم کہ شیشۂ دل سنگ آزما دارم — بیا و ذوقِ نگاہِ عتاب از من پُرس

ز اضطرابِ دلم دردسرکشِ بالیں — شبِ دراز و تمنائے خواب از من پُرس

ز رنگِ روئے خزاں دیدہ ام چنیں مگذر — ہنوز لذتِ یادِ شباب از من پُرس

شمار بوسہ ز ذوقِ لبم تواں دانست — در آئینہ منگر این حساب از من پُرس

زبانِ بے ادبم را کہ می تواند بست — نگاہِ حسنِ طلب را جواب از من پُرس

تلاشِ معنیِ بیگانہ در صحیفۂ عبث
یگانہ مطلبِ دور از کتاب از من پُرس



حضرت ابراہیم کا وطن

(از جناب سید حفیظ الدین ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا)

عوام میں آثارِ قدیمہ کا شوق تھوڑے ہی عرصے سے پیدا ہوا ہے چند سال قبل انہیں اسطرف قطعاً رجحان نہ تھا۔ اور یہ شیغہ اُن چند مخصوص شخصیتوں تک محدود تھا جنہیں ماہران آثارِ قدیمہ کہا جاتا ہے۔ مگر اب یقیناً لوگوں کے مذاق میں ایک عظیم تغیر واقع ہو گیا ہے۔ مصر میں پے در پے قدیم مقابر کی دریافت اور وہاں سے عجائب روزگار۔ اور بیش قیمت اشیا کی برآمدگی نے عام لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ ہی لیا۔ اور قریب قریب دنیا کے ہر حصے میں آثار قدیمہ کی تحقیق و تفتیش کے لئے جد و جہد ہونے لگی۔ اب لوگوں میں ان امور کے متعلق ایک عالم گیر دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اور وہ نئے نئے واقعات کا بیصبری سے انتظار کیا کرتے ہیں۔

فراعنہ مصر کے مقابر اگرچہ ایک خاص شہرت رکھتے ہیں لیکن عراق عرب میں۔ کلدانیوں کے قدیم شہر اُر پر جو حفریات ہو رہی ہیں۔ وہ بھی دلچسپی اور اہمیت میں کچھ کم نہیں۔ اس مقام پر جو عمارات برآمد ہوئی ہیں۔ وہ اگرچہ اپنی ٹیپ ٹاپ اور ظاہری شان و شوکت میں مصر کی قدیم عمارات کا مقابلہ نہ کر سکیں لیکن قدامت اور مذہبی اہمیت کے لحاظ سے اُن کا درجہ مصری عمارات سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اب تک عام طور پر یہی تسلیم کیا جاتا رہا تھا۔ کہ تہذیب و تمدن کے نکتۂ خیال سے مصر کا درجہ سب ممالک سے ارفع و اعلےٰ ہے۔ لیکن اُر کے حالات سے پتا چلتا ہے۔ کہ عراق عرب کی تہذیب۔ مصری تہذیب سے بہت زیادہ قدیم ہے۔ اب تک جن امور پر روشنی پڑ چکی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ چھ سات ہزار سال قبل بلکہ اس سے بھی پہلے عراق عرب کے باشندوں نے دور دراز کے

ممالک سے تجارتی تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ ان کے مذہبی عقائد نہایت واضح اور اخلاقی باتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور قصبات اور شہروں کے رہنے والے۔ آرام و آسائش بلکہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ تعجب تو اس امر کا ہے۔ کہ اس قدیم زمانے کی تہذیب . . . .

. . . . اس عہد جدید کی تہذیب سے کچھ کم درجے کی نہ تھی۔ اس وقت کی تہذیب میں اگر کوئی کمی تھی۔ تو مشینوں اور کلوں کی عدم موجودگی تھی۔ لیکن ان آسانیوں کے نہ ہوتے ہوئے جو کارہائے نمایاں ان قدیم لوگوں نے انجام دیئے۔ وہ شاید آجکل کی مشینوں سے بھی ممکن نہ ہوں۔

اہل کتاب سے اس مقام کا تعلق

ان حضرات کی جو اہمیت سائنس کے نکتۂ خیال سے ہے وہ تو ہے ہی۔ اس سے قطع نظر۔ یہ کھدائیاں مذہبی نکتہ نظر سے اہل نصارا۔ اہل یہود۔ اور اہل اسلام کے لئے یکساں دلچسپی کا موجب ہیں۔ اس لئے کہ یہ مقام حضرت ابراہیم ؑ خلیل اللہ جیسے برگزیدہ اور مقبول بارگاہ انسان کا وطن مالوف رہ چکا ہے۔ حضرت ابراہیم ؑ کی اہم شخصیت سے کون واقف نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے۔ کہ یہی وہ بزرگوار تھے۔ جنہوں نے اوّل اوّل بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور اپنے آباؤ اجداد کے اس مذہب کے استیصال میں۔ انہوں نے جس اخلاقی جرات سے کام لیا۔ اس کی مثال مذہبی دنیا میں ملنی محال ہے۔ جس مشن پر وہ بارگاہ الٰہی سے مامور ہوئے۔ اس کی تکمیل میں اور لوگوں کا تو کیا ذکر ہے۔ انہوں نے اپنے باپ اور دیگر رشتہ داروں کے احساسات کی بھی پروا نہیں کی۔ اور جو پیغام اللہ کی طرف سے انہیں پہنچا۔ وہ نہایت جرات اور دلیری کے ساتھ بے کم و کاست اپنی قوم کو پہنچا دیا۔ تبلیغ کے اس فریضہ کی ادائیگی کے بعد۔ تعمیر بیت اللہ میں آپ کی مساعی جمیلہ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ دنیا میں خدا کے سب سے پہلے گھر کی تعمیر کا شرف بھی حضرت ابراہیم ؑ ہی کو حاصل ہوا۔ آپ نے اور آپ کے صاحبزادے اسمٰعیل نے بنفس نفیس اس مقدس مقام کی تعمیر پر کام کیا ہے۔ حالی مرحوم مدّ و جزر اسلام میں اس واقعہ کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا
خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا

الغرض اُر وہی متبرک جگہ ہے جسے ایسے عظیم الشان انسان کے وطن مالوف ہونے کا شرف حاصل رہ چکا ہے۔

اہل ہنود اور عراق عرب

اہل کتاب کے علاوہ اہل ہنود کے لئے بھی اس مقام میں دلچسپی کا سامان

موجود ہے۔ وہاں سے چند امور ایسے دریافت ہوئے ہیں کہ ان سے عراق عرب اور ہندوستان کے مابین قدیم تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً۔ پتھر پر چند مرقعے برآمد ہوئے ہیں۔ جو اپنی صنعتی خوبیوں کے لحاظ سے نہایت عجیب چیز ہیں۔ اُن میں ایک مرقعہ صرف ہندی احساسات ہی لئے ہوئے ہے۔ بلکہ اپنی نزاکت اور تکمیل میں بُدھ کی ان تصاویر سے بہت ملتا جلتا ہے۔ جو پشاور کے قریب تھوڑا ہی عرصہ ہُوا۔ برآمد ہوئی تھیں۔ ایک اور پتھر پر ایک اوڑتے ہوئے فرشتے کی تصویر ہے۔ جو ملک کی آبپاشی کے لئے پانی لا رہا ہے یہ فرشتہ اُن ہندی دیویوں سے بہت مشابہ ہے جو قدیم ہند کے کتبات میں نظر آتی ہیں۔ لیکن ہندی کتبے۔ پہلے کتبے سے کہیں بعد کے ہیں۔

قدیم مینار اور چاند کی عبادتگاہ اُر پر کھدائی کا کام سرما ۱۹۲۴ء میں شروع ہُوا تھا۔ اس سے قبل اس مقام پر ایک مینار کی دیواریں دریافت ہوئی تھیں جن کی نسبت یہ خیال کیا گیا تھا۔ کہ وہ چاند کی پرستشگاہ ہے۔ لیکن اس کی پوری تصدیق اسوقت نہیں ہو سکی تھی۔ اس مینار کے چبوترے کے طول و عرض کے تعین کی کوشش میں۔ کارپردازان حفریات نے ایک قدیم دیوار کا پتا لگالیا۔ جسے شاہ اُر اینگر والئی اُر نے ۴۲۰۰ سال قبل تعمیر کرایا تھا۔ یہ دیوار

کچی اینٹوں کی ہے۔ اُسپر دمدمے بھی بنے ہیں اور کسیقدر ڈھلوان سی شکل کی ہے۔ چونکہ اینٹوں پر کسی کا نام کندہ نہیں تھا۔ اسلئے اس امر کی تصدیق بہت مشکل تھی کہ یہ دیوار کس عہد میں تعمیر ہوئی۔ مگر خوش قسمتی سے ار اینگر کے ایک جانشین شاہ ڈونگی نے قریباً ۳۰ سال بعد اس دیوار کے پیش کو پختہ اینٹوں کی چنائی سے مضبوط کرا دیا تھا۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ ہزارہا سال قدیم ہونے کے باوجود۔ یہ دیوار نہ صرف اب تک قائم ہے۔ بلکہ نہایت محفوظ حالت میں ہے اس دیوار پر مٹی کا پلستر کے اندر۔ اینٹوں کے جوڑوں میں پختہ مٹی کی بنی ہوئی مخروطی شکل کی میخیں گڑی ہوئی ہیں۔ ان میخوں کی لمبائی پر۔ شاہ ڈونگی کا نام اور لقب کندہ ہے اور یہ بھی مذکور ہے کہ یہ عمارت چاند کی پرستش کے لئے وقف کی گئی ہے۔ اس مناسبت سے اس تمام علاقے کو قدیم الایام سے "مقدس احاطہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ مزید حفریات سے تمام عمارت کا پتہ لگ گیا۔ اس میں ایک وسیع صحن واقع ہے۔ جس میں تین طرف بڑے بڑے دروازے لگے ہیں اور ہر چہار طرف گودام اور کوٹھریاں بنی ہیں صحن میں پختہ اینٹوں کا فرش ہے اور جابجا بہت سے بت نصب ہیں۔ ان کے علاوہ پانی کے تالاب اور صفائی کی نالیاں بنی ہوئی ہیں تالابوں کے قریب سے تین مضبوط دروازے چاند دیبی کی

یعنی گال (چاند دیوتا کی بیوی) کی خانقاہ کی طرف چلے گئے ہیں۔ یہ خانقاہ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ جو وسط صحن میں ایک بلند کرسی پر بنا ہے۔ اس کے ایک جانب ایک زینہ بھی چڑھتا ہے۔ خانقاہ کے متعلق ایک اور کمرہ بھی ہے۔ اس کمرے اور مذکورہ بالا بیرونی دروازوں کے اندر قربانگاہیں بنی ہوئی ہیں خانقاہ

باورچیخانہ کے پس پشت باورچیخانہ واقع ہے۔ جو نہایت ہی دلچسپ چیز ہے۔ اس لئے کہ وہاں کا سب سامان نہایت محفوظ حالت میں اب تک موجود ہے۔ ایک دیوار کے قریب کنواں بنا ہے۔ جس میں رال یا لاکھ کے ذریعے پختہ اینٹیں لگی ہوئی ہیں۔ کنوئیں پر ڈول لٹکانے کے لئے تانبے کی ایک چرخی لٹکتی ہے۔ اس چرخی کو دیوار کی اینٹوں میں مضبوط گاڑ دیا گیا ہے۔ چرخی کے قریب ہی دیوار کے ساتھ پانی بھرنے کے لئے ایک چھوٹا سا حوض بھی بنا ہے۔ دوسری دیوار کے ساتھ ساتھ چولہوں کے دو سلسلے ہیں۔ پہلے سلسلے میں ایک تو معمولی چولھا ہے۔ جس میں لکڑی جلائی جاتی تھی ایک انگیٹھی کوئلے جلانے کے لئے اور ایک تنور بنا ہوا ہے۔ دوسرے سلسلہ میں ایک نہایت عجیب اور مکمل انگیٹھی یا سٹوو ہے۔ جو پتیلی رکھنے کی جگہ چھوڑ کر اوپر سے مسقف ہے۔

اس کے اندر دو چولھے ہیں جن پر چکردار دودان لگے ہیں اور پتیلی رکھنے کے لئے جگہ بنی ہے انگیٹھی بہت بلند ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک زینہ بھی مہیا کیا گیا ہے۔ تاکہ ضرورت کے وقت اوپر چڑھ کر پتیلی کو ہلایا یا اُٹھایا جا سکے۔ یہ چولھا اپنی وضع قطع میں بجنسہ موجودہ زمانے کے ان چولہوں سے مشابہ ہے جو انگریزی باورچی خانوں میں دیکھے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور جہاں باورچی صرف گھڑارہ کر کام کر سکتا ہے۔ فرش پر ہتھ چکیاں۔ سل بٹے اور مٹی کے برتن ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ اور پایا جاتا تھا۔ کہ اس جگہ کو ایسے اچانک طریق پر مصیبت اور تباہی سے سابقہ پڑا کہ لوگوں کو کسی چیز کے اُٹھانے کی مہلت نہ ملی۔ اور جو چیز جہاں دھری تھی وہیں پڑی رہ گئی۔

دار القضا مینار کے پہلو میں ایک چھوٹی سی عمارت اور واقع ہے جس کی نسبت تحقیق ہو گیا ہے کہ وہ شاہان اُر کے زمانے میں دار القضا تھی اس عمارت کا درمیانی حصہ پختہ اینٹوں کا بنا ہوا ہے۔ آثار نہایت وسیع اور دیواروں میں جابجا روشندان اور محرابی دروازے بنے ہیں۔ اس وسطی عمارت کے ارد گرد کچی اینٹوں کے چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ ان میں ایک کمرہ مطبخ کا کام دیتا تھا۔ کیونکہ اس کی دیواریں۔ دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ اور فرش پر ہتھ چکیاں اور مصالح پیسنے کی سلیں۔ جا بجا پڑی تھیں۔ یہاں سے چند اور چیزوں کے علاوہ ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ایک نہایت

ہاتھی دانت کی صندوقچی خوبصورت مگر شکستہ صندوقچی دستیاب ہوئی جو اپنی نفاست اور نزاکت کے اعتبار سے مصر کی صنعت معلوم ہوتی تھی۔ اس صندوقچی کے پہلوؤں پر لڑکیوں کی تصویریں بنی ہیں جو قطار در قطار ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ناچ گانے میں مصروف ہیں اور ایک وسطی نقطہ پر حلقہ کئے ہوئے ہیں اس عمارت کی تعمیر قریباً ۱۳۰۰ سال قبل شاہ بورسن والئے اُر کے ہاتھوں انجام پائی تھی اسوقت یہ عمارت خام اینٹوں سے بنی تھی ڈیڑھ سو سال بعد اس کی تعمیر از سر نو عمل میں آئی۔ اور اسدفعہ نہایت خوبصورت پختہ اینٹیں استعمال کی گئیں۔ پھر دفتاً فوقتاً اس کی ضروری مرمت اور دیکھ بھال ہوتی رہی۔ اور حضرت مسیح سے ۵۵۰ سال قبل بابل کے آخری بادشاہ بنوئی داس نے اس عمارت پر ایک ایک بالائی منزل بھی تعمیر کرا دی۔ یہ عمارت اول اول "مقدس احاطہ" میں صدر دروازے کا کام دیتی تھی لیکن پے درپے انقلابات نے اسے دار القضا میں تبدیل کر دیا۔

بنوئی۔ اس کی دختر کی آرامگاہ دار القضا کے عین بالمقابل ایک اور وسیع صحن واقع ہے جسے ایک دوہری دیوار نے احاطہ کر رکھا ہے۔ ان دیواروں کے درمیان کمروں کا ایک طویل سلسلہ چلا گیا ہے۔ جس کی فرش اینٹوں پر بنوئی داس کا نام کندہ ہے۔ اور یہ بھی مذکور ہے کہ یہ جگہ بڑی سجادہ نشین اور استانی کے رہائش کا مقام ہے۔ اس امر کی تصدیق بھی ایک اور کتبے سے جو بابل کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ بابل کے آخری بادشاہ بنوئی داس نے قدیم روایات پر عمل کرتے ہوئے۔ اپنی بیٹی بل شالتی ننار نامی کو چاند کی پرستش کے لئے نامزد کر دیا تھا۔ اور اسکی رہائش کے لئے اُر کے مقام پر ایک خوبصورت حجرہ بھی بنوا دیا تھا۔ نیز بنوئی داس نے اپنی .... دختر کے لئے ہدایات اور دستور العمل بھی مرتب کر دیئے تھے اور اخلاقی نصائح قلمبند کی تھیں۔ الغرض اس میں اب کچھ کلام نہیں کہ مذکورہ بالا عمارت وہی جگہ ہے جہاں بنوئی داس کی دختر رہا کرتی تھی۔ اس حجرے کے متعلق ایک مدرسہ اور ایک عجائب گھر بھی تھا مدرسہ کا ضروری سامان یعنی لکھنے کی کاپیاں مٹی کی

مدرسہ اور عجائب گھر تختیاں۔ مذہبی راگ وغیرہ وغیرہ یہاں سے برآمد ہوئے ہیں علاوہ ازیں مٹی کی ایک تختی پر ایک کتبہ ملا جس میں اُر کے مقام پر آثار قدیمہ کی کھدائیوں کا حال درج ہے جو حضرت مسیح سے سات سو سال قبل سر انجام پائیں۔ اُر کی قدامت کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ آج سے ڈھائی تین ہزار سال پہلے بھی وہ مقام آثار قدیمہ میں شمار ہوتا تھا۔ اور اسوقت بھی وہاں حفریات کی ضرورت پیش آئی تھی۔

اصل عمارت کے نیچے اس سے بھی قدیم عمارات کا پتا چلا ہے جن کی تعمیر قریباً پانچ ہزار سال پہلے ہوئی تھی۔ اس عمارت کی اینٹوں پر کوئی نام درج نہیں مگر انگلیوں کے دو دو گھرے نشان بنے ہوئے ہیں ان قدیم عمارات کی دیکھ بھال زیادہ وضاحت کے ساتھ اس لئے ممکن نہیں۔ کہ اسی طریق عمل سے بالائی عمارتوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے لیکن پھر بھی بعض مقامات پر خندقیں کھودی گئیں اور خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔

مرقع بیش قیمت منکے اور کشتی کی تصویر

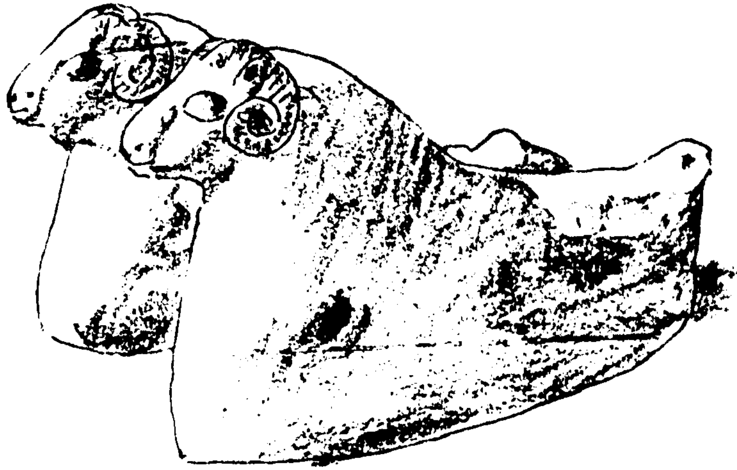
ایک خندق میں سے سیپ کا ایک مربع ٹکڑا برآمد ہوا جس پر دو شخصوں کی نہایت خوبصورت تصویریں بنی ہیں۔ ...... یہ لمبے لمبے چوغے یا دغلے زیب تن کئے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے چہل قدمی کرتے پھرتے ہیں۔ ایک اور خندق میں سے نہایت قدیم وضع کے مٹی کے چند برتن نکلے ان میں سے ایک برتن میں عقیق۔ لاجورد۔ چاندی اور سونے کے ایک ہزار منکے اور کچھ چاندی کے آویزے رکھے ہوئے تھے۔ آویزوں پر لاجورد کے ساتھ جالی کا نہایت خوبصورت جڑاؤ کام ہوا ہے۔ ان کے ساتھ ہی سنگ جراحت کی بنی ہوئی ایک تصویر رکھی تھی۔ جس کے دونوں جانب۔ نقاشی کا نہایت نفیس کام ہو رہا ہے۔ یہ تصویر ایک کشتی کی ہے۔ جو سرکنڈوں کو جوڑ جوڑ کر بنائی گئی ہے۔ کشتی کے وسط میں ایک محرابی کمرہ بنا ہے۔ جس میں ایک ہنس راج بند ہا ہے کشتی کے انجام پر دو مچھلیاں رکھی ہیں اور ان کے قریب ہی ایک آدمی کھڑا ہے۔ جو غالباً ملاح ہے۔

مینڈھوں کے مجسمے

سب سے پہلے عجیب چیز مینڈھوں کے دو مجسمے ہیں۔ یہ کھریا مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ اور ۱۶،۱۱ انچ بلند ہیں۔ مینڈھوں کے صرف سر اور گردن ہی دکھائے گئے ہیں۔ اور پچھلا حصہ گاؤدم سا بنا دیا ہے۔ یہ مجسمے آرائشی مطلب کے معلوم ہوتے ہیں اور غالباً کسی دیوار میں اس طرح لگے ہوئے ہوں گے۔ کہ ان کا گاؤدم حصہ دیوار کے اندر اور سر گردنیں باہر کو نکلی رہیں۔ ہر مینڈھے کے اندر ایک ایک سوراخ ہے جس میں سے لوہے کی موٹی سلاخ باسانی آر پار ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مجسمے کسی تخت میں پایوں کا کام دیتے ہوں اور لوہے کی سلاخ ان میں ڈال کر اوپر سے تخت ٹکا دیا جاتا ہو۔ دونوں مجسمے نہایت اعلےٰ صنعت کا نمونہ ہیں۔ خدوخال اور بالخصوص سینگوں کی بناوٹ میں تو کمال کر دیا گیا ہے اور اس سیاہ رنگ نے جو سینگوں اور آنکھوں پر چڑھایا گیا ہے۔ مجسموں میں گویا جان

ڈالدی ہے۔ یہ مینڈھے اور مذکورہ بالا کشتی والا مرقع دونوں پانچ ہزار سال کی قدیم صنعت کے قائم مقام ہیں۔

شاہ ڈونگی کا محل مقدس حاطے کے جنوب میں ایک بلند ٹیلے کی کھدائی پر معلوم ہؤا کہ وہ شاہ ڈونگی والئے آر کا محل ہے۔ یہ محل ایک نہایت بلند کرسی پر واقع ہے۔ اور اس بلندی کی وجہ سے "اے ہرسنگ" یعنی پہاڑی مکان کے نام سے موسوم چلا آتا ہے۔ اس مقام سے شاہ ڈونگی کے محل کی تطبیق اس طرح ہوئی کہ عمارت کی ایک



مینڈھوں کے مجسمے۔ پانچ ہزار سال قدیم

شکستہ خام دیوار کے اندر سے پختہ مٹی کی بنی ہوئی چار ڈبیاں دستیاب ہوئیں۔ ہر ڈبیا میں پتھر کا ایک ایک کتبہ رکھا ہے۔ جس میں شاہ ڈونگی کا نام کندہ ہے۔ ان کے ساتھ ہی بادشاہ کا تانبے کا ایک ایک مجسمہ بھی ہے بادشاہ کو اس طرح پیش کیا گیا ہے۔ کہ وہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے۔ سر پر چونے کی ٹوکری اٹھائے لئے آرہا ہے۔ اس انکشاف سے معلوم ہؤا۔ کہ آج کل کے دستور کے موافق اُس قدیم زمانے میں بھی سنگ بنیاد رکھنے اور عمارات کے آثاروں میں کتبات کو محفوظ کرنے کا طریق جاری تھا۔ گویا وہ لوگ بھی اس درجہ متمدن واقع ہوئے تھے۔ کہ تہذیب و تمدن کے اس باریک اور دلچسپ پہلو کو بھی۔ جسے عہد حاضرہ میں ایک اہم اور ضروری رسم خیال کیا جاتا ہے ان لوگوں نے نظر انداز نہیں کیا۔

چاند دیبی کا مجسمہ مزید براں وہاں سے چاند دیبی کے مجسمے کا ایک عجیب وغریب سر برآمد ہوا ہے

یہ سر سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اور اسپر نہایت دلفریب نقش ونگار کھدے ہیں۔ خط وخال کی بناوٹ میں نفاست اور اصلیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے آنکھوں میں سیپ اور لاجورد لگاکر وہ حقیقت پیدا کی ہے۔ کہ دیکھنے میں بظاہر وہ ایک زندہ سر معلوم ہوتا ہے۔ بالوں کی بناوٹ اور بھی عجیب ہے۔ اور انہیں اس طرح ترتیب دیا گیا ہے۔ کہ اچھی خاص ٹوپی بنا دی ہے۔ جس کے گرد ایک سادہ مگر مضبوط ڈوری لپٹی ہوئی ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے۔ کہ اس تصویر کا ناک کسی طرح ضائع ہو گیا۔ قطع نظر اس نقص کے۔ تصویر ہر طرح مکمل ہے۔

قدیم قبریں اس مقام پر عمارات کے علاوہ بیشمار قبریں بھی برآمد ہوئیں ہیں ان میں سے بعض قبریں تو اچھے خاصے وسیع کمرے سے مشابہ ہیں۔ ان میں اینٹوں کی چنائی ہوئی ہے۔ اور چھت پر ایسے ڈاٹ لگے ہیں۔ جن کی شکل پیپیوں سے ملتی جلتی ہے ان قبروں میں مردوں کو سیدھا لٹایا گیا ہے۔ لیکن ان کے گھٹنے اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں۔ بعض قبریں معمولی قد وقامت کی ہیں۔ لیکن وہاں لاشوں پر مٹی کے تابوت رکھے ہوئے ہیں جو شکل وصورت میں



چاندی کا سنگِ مرمر کا سر جسکی آنکھوں میں لاجورد اور سیپ لگا ہوا ہے۔

ٹب سے مشابہ ہیں۔ ان قبروں میں مردوں کو سیدھا لٹانے کے بجائے دوہرا کر دیا ہے اور سر کنڈوں کی چٹائیوں میں لپیٹ رکھا ہے۔ ان کے قریب ہی بہت سے مٹی کے برتن پڑے ہوئے ملے جو اسوقت خالی ہیں۔ مگر جن میں یقیناً کبھی کھانے پینے کی چیزیں اس غرض سے رکھی گئی ہونگی کہ وہ دوسری دنیا میں انکے کام آئیں ایک لاش کے سر کے نیچے ایک استر رکھا ہوا ملا جسمیں لکڑی کا ایک دستہ بھی لگا ہے ایک اور لاش کے قریب مٹی کے بہت سے کتبے رکھے تھے جن میں کاروباری معاملات کے متعلق ضروری یادداشتیں درج ہیں

واماندگانِ عشق

از حضرت ارشد تھانوی

کس قدر دلچسپ ہے گلزارِ عالم کی بہار — دید کے قابل ہے منظر ہائے پیہم کی بہار
ہے یہ وہ گلشن کہ جس میں لطفِ گلچینی بھی ہے — لذت اندوزی بھی ہے اور عشرت آگینی بھی ہے
کثرتِ نظارگی اک جلوہ زارِ شوق ہے — جس سے طاری خود بخود کیف خمارِ شوق ہے
ہو کے اک تحریکِ جذباتِ تمنا ریز میں — جان پڑ جاتی ہے احساساتِ عشق انگیز میں
دل میں پیدا ہو ہی جاتا ہے وفورِ آرزو — مست کر دیتا ہے پھر ذوقِ سرورِ آرزو
اب ضرورت ہوتی ہے مرکز کی الفت کیلئے — ڈھونڈھا جاتا ہے محبت کو محبت کے لئے
لیکن اس مقصد کا حل ہونا بہت دشوار ہے — سعی اسمیں جسقدر کی جائے سب بیکار ہے
ہاں کسیکو کامیابی شاذ و نادر ہو تو ہو — خوش نصیبی سے کوئی آسودہ خاطر ہو تو ہو
ورنہ اکثر تلخیوں ہی سے بھرے جامِ امید — بیشتر نکلا ہے یاس انگیز انجامِ امید
نامرادی سے ہوئی ہیں ہستیاں شایانِ غم — ہے یہیں سے ابتدائے بحرِ بے پایانِ غم
سخت عبرتناک ہے، یوں اختتامِ زندگی — حیف صبحِ زندگی افسوس شامِ زندگی
سچ تو یہ ہے خود غرض انساں اتنا بھی نہو — ایک جذبہ کیلئے قربان اتنا بھی نہو
بعض کھا کر ٹھوکریں آخر سنبھل بھی جاتے ہیں — ورطۂ عشق و محبت سے نکل بھی جاتے ہیں
جان لیتے ہیں کہ یہ بھی اقتضائے عمر تھا — مقصدِ ہستی نہ تھا جو ماسوائے عمر تھا
پھر تلف کرتے نہیں ہیں قیمتی اوقات وہ — ملک و ملت کی بجا لاتے ہیں کچھ خدمات وہ

دل سے ہو جاتے ہیں شیدائے وطن شیدائے قوم
کاش ان کے واقعے سے لیں سبق ابنائے قوم

ملکہ خانم کی سرگذشت

(فرانس کے مشہور ناول نگار پیری لاٹی کا ایک مشہور قصہ اسی خاتون کے حالات پر مبنی ہے۔)

(ترجمہ حضرت غریب جہان آبادی)

قسمت کا کیا علاج ہوسکتا ہے۔ میری تقدیر میں ان ہونا لکھا تھا اور وہی ہوکر رہا۔ یہ سچ ہے کہ ترکی عہدیدار کی بیٹی ہوکر ناز و آرام میں پلی بڑھی جہاں اس پیشہ کے نکات سے واقف ہونے کی کوئی سبیل نہ تھی لیکن میں پہلی ترکی خاتون ہوں جو کاروباری زندگی میں داخل ہوئی۔ خوش قسمتی سے مجھے یہ کام پسند ہے اور کوئی پیشہ مجھے نہیں بھاتا۔ بچپن سے مجھے کپڑے سینے کا بہت شوق تھا۔

اب مہربانی سے میری سرگذشت سن لیجئے۔ میرے دادا فرانس کے ایک قدیم اور ممتاز خاندان میں مارکوئس کا درجہ رکھتے تھے۔ جنگ صلیبی میں اس خاندان نے بہت نام پایا تھا۔ اور ترکوں سے نفرت کرنے اور ان کو نیست نابود کر دینے میں میرے اسلاف ہمیشہ سر بر آوردہ رہے۔

مجھے شرم اور ادب سے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ کافر ترک ہوکر میری ناک میرے صلیبی اجداد کے ناک سے مشابہ ہے۔ میرے دادا۔ قدیمی فرانسیسی طرز عمل کے مطابق فوج میں بھرتی ہوتے تھے۔ کسی فوجی خدمت کے متعلق ان کو بکار سرکار حدود ترکی میں آنے کا موقع میسر آیا۔ یہاں آکر دل و جان سے ترکوں پر فریفتہ ہوگئے۔ لیکن ان کے بالآخر اپنی قومیت بدلنے بلکہ خیالات ترک کرنے۔ مذہب چھوڑنے اور سیدھے سادھے رشید بنجانے کا باعث میری دادی ہوئیں۔ جو قوم سے سرکیشن مسلمان اور حسن میں یکتائے زمانہ تھیں۔ بعض نکتہ چین یہ بھی کہتے ہیں کہ چار بیویاں کرنے کے شوق میں میرے دادا نے مذہب اسلام اختیار کیا تھا۔ بہرحال میرے دادا صاحب نے اپنے جدید مذہب کی اس اجازت کی پوری تکمیل کردی۔ ان کی اولاد اس کثرت سے ہوئی کہ وہ اپنے بچوں کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ ایک مرتبہ ان لوگوں نے آکر کہا۔ کہ آپ کا فلاں بچہ گذر گیا۔ لیکن وہ بچہ تو درکنار۔ اس کی ماں کو بھی بھول گئے تھے۔ افسوس کہ اس موقعہ پر ان کا طرز عمل نہ تو فرانسیسی رویہ پر تھا۔ نہ ترکی طریق پر۔ مسئلہ تبدیل مذہب سے قطع نظر کرکے دیکھئے تو میرے دادا بہت خوش اخلاق اور ہر دلعزیز شخص تھے۔ ان کی قابلیت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ ترک اُن کی عظمت کرتے تھے۔ اُن کا اثر

دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور ایک طرح موجودہ ترکی
حالت و انقلاب کا باعث میرے دادا صاحب تھے
ایک با علم ترک نے ان کے فہمائش کے مطابق مدت
تک یورپ کے صدر مقامات میں رہ کر ملکی انتظام طرز
معاشرت کا بغور مطالعہ کیا اور ترکی علاقہ میں واپس
آکر "نوجوان ترک" سوسائٹی وخیالات کی بنیاد ڈالی ان
کے اثر سے قدیمی ایرانی وعربی دستور العمل ہمیشہ
کے لئے بدل دیا گیا۔ اور دوسرے انقلابات بھی رائج
ہوئے۔ جن کا بانی مبانی در اصل میرے دادا صاحب
کو سمجھنا چاہیئے۔

میرے والد نوری بے جو میرے دادا کے سب سے
بڑے فرزند تھے۔ محکمہ سفارت ترکی میں ملازم ہوئے
اور انجام کار سلطان عبدالحمید کے زمانہ میں زیر
محکمہ خارجیہ کے درجہ پر ممتاز ہوئے اس اعلےٰ مرتبہ کی
حقیقت صرف ترک ہی جان سکتے ہیں۔ اس زمانہ کی
سازشوں اور خفیہ نویسوں کے زندہ سلامت رہنے
کی قدر ترک ہی سمجھ سکتے ہیں۔ تمام زن و مرد خصوصاً
وزرائے دولت غمازوں کی فتنہ پردازی سے محفوظ
نہ تھے۔ خفیہ پولیس کی ادنٰے اور بے بنیاد رپورٹ پر
ہم لوگوں کی جلاوطنی اور تباہی ممکن تھی کسی
دن کی صبح کو یہ یقین نہیں ہوسکتا تھا۔ کہ آج شام
تک دن بخیر و عافیت بسر ہو جائیگا۔ ان سب باتوں
کے علاوہ قفس حرم کی محبوسانہ زندگی ہمارے مزاق حال
نہ تھی۔ ہمارا یورپین خون اس حالت غلامی کے خلاف
ہمیں ابھارتا تھا۔ میرے والد صرف اپنی ماں کیطرف سے
آدھے ترک تھے۔ بلکہ نصف فرانسیسی سے بہت
کچھ زیادہ فرانسیسیوں کی طرح ان کو اپنی اولاد سے
بہت محبت تھی۔ ہم سب ان کی آنکھ کا تارہ تھے
اور وہ ہماری تعلیمی ترقی و قابلیت دیکھ کر بہت خوش
ہوتے تھے۔ ہماری تعلیم انگریزی فرانسیسی اطالوی
اور جرمن استانیوں کے سپرد تھی۔ اس لئے فارسی
عربی اور ترکی کے علاوہ جن کا جاننا ضروری اور
لازمی تھا۔ ہم پانچ یورپین زبانیں جانتے تھے۔ ہم
نے موسیقی۔ مصوری۔ نقشہ کشی اور سوزن کاری
(کشیدہ) بھی سیکھا۔ اور ہر قسم کی تعلیم سکھا دیگئی
ہماری ماں اس عجیب و غریب طریقہ تعلیم سے
محض ناآشنا تھیں۔ وہ صرف ترکی زبان بول سکتی
تھیں۔ اور یورپ اور اس کے طرز معاشرت کی
انکو ذرا پروا نہ تھی۔ لیکن انہوں نے ہماری تعلیم کے
بارہ میں سرکار (میرے والد) کی مرضی میں کبھی مداخلت
نہیں کی۔ وہ پرانے طریقہ کی ترکی خاتون تھیں۔ ہمارے
اور ان کے حالات وخیالات میں بڑا تفاوت تھا۔

حرم سرائے اسلامی میں پردہ کیوجہ سے مردانہ
جلسوں میں ہم لوگ شریک نہیں ہوسکتے تھے البتہ
غیر سلطنتوں کے سفارت خانوں میں ایسے تقریبیں فروغ
ہوتی رہتی تھیں۔ اسلئے جب دول غیر کے سفیر متعلق

باب عالی میرے والد سے ملنے آتے تو میں اور میری بہن پردہ کے پیچھے بیٹھکر ان لوگوں کی مدارات نغمہ وساز سے کیا کرتے۔ میری بہن موسیقی میں بہت ماہر تھی۔ اس نے قیصر جرمنی کے قسطنطنیہ میں داخل ہونے کے موقع پہ نغمہ فتح ترتیب دیا تھا۔ اور اس کی قابلیت لائق داد تھی۔

میرے والد نے بلا پس و پیش ہمکو یورپ کے طریقہ پر تعلیم دلائی۔ ان کو یہہ حال معلوم نہ تھا کہ جب ہم مشرقی عورت کے موافق اپنا گھر کرنے بیٹھیں گی تو ہمیں مغربی عورت بناد شوار ہو جائے گا۔ ہم لوگ عزیز فرانس کے قصہ کہانیاں سنکر ان کے مطابق کشیدہ تیار کرتے تھے۔ اپنے دل میں فرانس کا سمان باندھتے تھے۔ اور یورپین سفرا کی مستورات بلکہ سوداگر عورتوں کی آذادی پہ حسد کرتے تھے۔

اس ابتدائی زمانہ میں اعلےٰ خاندان کی مستورات سودا خریدنے باہر نہیں جاسکتی تھیں بلکہ سوداگر خود ان کے مکان پر آجاتے تھے فرانس کے کاثیان سوداگر اپنے ایجنٹ حرم سرا سے احکامات حاصل کرنے کو بھیجا کرتے تھے اور خوب مالا مال ہوتے تھے ایک ظریف پاشا نے کیا خوب کہا۔ کہ کثرت ازدواج کی ضرورت اب اسوجہ سے نہ رہی۔ کہ پہلے تو چار بی بیاں زمین کی نگہداشت و پرداخت میں چار آدمیوں کے برابر کام دیتی تھیں۔ تو چار شادیاں کرنے میں فائدہ ضرور تھا۔ اب جو بی بیاں پیرس سے اپنا لباس سلوا کر منگوانے لگیں تو کیا حاصل! ہم سب ان آزاد عورتوں پر جو بے محابا کھلے منہ جہاں چاہے جا سکتی تھیں کسقدر حسد کرتے تھے مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن میں بھی اس پیشہ کو اختیار کروں گی۔

لیکن یہ کام میں نے ایک دن میں نہیں سیکھا باہر جانے کی تو ہم کو قطعی ممانعت تھی پہلے میں نے اپنے والد کے کتب خانہ سے علم تشریح کی کتابیں پڑھیں اس سے بہت مدد ملی۔ پھر یونانی اور سرکیشی طرز لباس پر نظر غور ڈالی۔ سرکیشا کی عورتیں سب سے زیادہ خوبصورت اور وضعدار ہوتی ہیں انکے سنہری بال اور سیاہ آنکھیں مشہور ہیں۔ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر وہ بلا تکلف سوار ہوتی ہیں پیدل چلنے میں اُن کی چال ڈھال شاہانہ معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ہمارے امرا کا اس قوم میں شادیاں کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

جب مجھے تشریح "(اناٹومی) سے پوری واقفیت ہوگئی تو میں نے مومی کاغذ کی شکلیں کترنا اور انکو کاغذی لباس سے مزین کرنا سیکھا۔ اس کے بعد گھر کی خادمہ اور لونڈیوں کے لئے جوزہ تیار کرنے میں مشق بڑہائی۔ وہ اس توجہ کی بہت ممنون ہوئیں عورت ذات ہمیشہ لباس پر ریجھ جاتی [illegible] طرح رفتہ رفتہ اپنی مشق بڑہاتی رہی [illegible] ابتک [illegible] خود مشق [illegible]

کی۔ لیکن استاد کے پاس جانا ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کمی کو بھی پورا کر لیا۔ اس کا انتظام اس طرح سے ہوا کہ ایک یونانی سوداگر (میم) نے جس کی ہمارے گھر میں خرید و فروخت کی وجہ سے آمد رفت تھی۔ ہماری رشوت لے کر ایک درزی کی دوکان پر مجھے کام سکھانے کا انتظام کر دیا۔ میں ایک ماما کا پھٹا پرانا برقعہ اوڑھ کر اور نقاب ڈال کر گھر سے نکلجاتی اور سوداگر کی دوکان میں لباس تبدیل کر کے اور کوٹ اور ہیٹ لگا کر درزی کے ہاں چلی جاتی کسی کو وہم بھی نہوا کہ میں کون ہوں اور میں بہت خوشی خوشی اپنے پیشہ کا کام سیکھ گئی۔ اگر میں پکڑی جاتی۔ تو خدا جانے میرا اور دوکان والوں کا کیا حشر ہوتا۔

اسطرح مینے اپنا شوق اور ارادہ پورا کیا اور زندگی خوشی سے بسر ہونے لگی۔ میری بہن اور میں دونوں پردہ میں تھیں۔ دس برس کی عمر تک ہماری زندگی پوری بچوں کی طرح گذری۔ ناچنا گھوڑے پر سوار ہونا فرنگی لڑکوں کے ساتھ کھیلنا روا تھا۔ جب ہم پردہ میں بیٹھ گئیں تو سب کھیل کود قطعی بند ہو گیا۔ اس بدنصیب [illegible]ون سے صرف مرد رشتہ دار ہمارے سا[illegible] رشتہ داروں سے بات چیت کرنا کہ[illegible] پر تکلف ہو سکتا ہے۔ ایک ترکی عورت جان سکتی ہے کہ پردہ کی قید لڑکی پر کیا مصیبت ڈھاتی ہے۔ اسلئے سے زندگی سوگوار ہو جاتی ہے مگر ایسا ہونا نہیں چاہیئے۔

حضرت رسول مقبول صلعم جب اپنی امت کو وحشت کی گمراہی سے تہذیب و شائستگی کی شاہراہ پر لے آئے تو انکو یہہ مناسب معلوم ہوا کہ عورت اپنی نشان حسن یعنی بالوں کو چھپائے رکھے۔ اُن کو یہ خیال نہ تھا کہ حاسد مرد اس خیال کو بگاڑ کر عورت کو مقید کر دینگے افسوس تمام مصلحان قوم کے احکام اسی طرح خراب کر دیئے جاتے ہیں۔ حضرت موصوف اگر ہم ترکی عورتوں کو ٹاٹ کے پردوں میں مقید دیکھتے تو کیا کہتے۔ ہمارے ممدوح آفتاب اور روشنی کو پسند فرماتے تھے۔ ہمیں سیاہ نقاب کی تاریکی میں دیکھنا کیونکر گوارا فرماتے گویا سوگ کا لباس ہماری جان [illegible] ہے۔ ہم لوگ تو اپنے مُردوں کیواسطے بھی سیاہ پوش نہیں ہوتے

اسکے بعد ایک ماتم خیز واقعہ پیش آیا یعنے میری بہن کی شادی مشرقی رسم و رواج کے موافق کی گئی سمجھ عورت کیلئے اس مبدلہ حالت کے قیود برداشت کرنے ناممکن تھے۔ جب نکاحنامہ پر مہر و دستخط ہو چکے اس کے بعد پہلے اس مرتبہ عورت نے اپنے مقدر کی شکل دیکھی۔ اس کا خاوند مرد کی حیثیت سے تین لفظ صرف طلاق کے کہہ کر اپنی رستگاری حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن وہ عورت ہوکر ہمیشہ اس کی خوشی کی پابند تھی۔ گویا وہ اس کی ملکیت لونڈی ہو گئی۔ [illegible]

پر چھپا دیکھے جا سکے اس کے حوالہ کر دیگی۔

میرا بہنوئی انصاف سے پوچھو تو بہت اچھا آدمی تھا۔ خاوند کی حیثیت سے مہربان شریف طبیعت تھا اور اچھے عہدہ والا تھا۔ جس کے وزیر بنجانے کی توقع تھی وہ میرے والد کا میر منشی تھا۔ میرے والد اس سے بہت خوش تھے اور جانتے تھے کہ وہ میری عزیز بیٹی کے لئے موزوں خاوند ہوگا۔ لیکن محض رسم ورواج کی قیود کے باعث میری بہن اپنے خاوند سے نفرت کرتی تھی۔ بلکہ اس کے دل میں بھی نفرت پیدا کر دی اس غریب مرد کی کیا خطا تھی؟ یہ تمام رسم ورواج شروع سے غلط ہیں اور فوراً بدل دینے چاہئیں ہم دونوں نے اپنے دل میں یہہ منصوبہ ٹھان لیا۔ کہ دونوں کر مستورات کی آزادی کے واسطے کوشش کریں گے۔

یہہ کام کچھ آسان نہ تھا۔ ہماری کون سنتا؟ اگر ہم مضمون لکھتے تو کون اخباروں میں شائع کرتا۔ اگر راز کھل جاتا تو ہم کو سزا ملتی۔ اس سے کچھ نفع حاصل ہوتا۔ ہمارا پڑوسی ایک شاعر اسی بلا میں گرفتار ہوگیا تھا۔ سلطان عبد الحمید کسی شخص کو جو مضمون نگار ہو سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتے تھے۔ ایک دن آدھی رات کو سلطان کے جاسوسوں نے شاعر کا مکان گھیر لیا۔ چپہ چپہ کی تلاشی لی۔ کوئی کاغذ معمولی غزلوں کے سوا نہیں ملا۔ مگر اس دن سے شاعر اور اس کا تمام گمراہ و غائب ہوگئے اور عرصہ تک کسی کو اتنا پوچھنے کی مجال نہ تھی۔ کہ وہ کہاں ہیں۔ اس لئے ہم کو اپنی مشکلات اخباروں میں شایع کرانا دشوار تھا۔

جس دن سے میری بہن کی شادی ہوئی جس دن سے ہم دونوں نے اپنا مستحکم ارادہ مستورات کی خدمت کرنے کا مصمم کر لیا۔ ہم اس دھن میں لگی رہتی تھیں۔ ہم غیر ملکوں کی عورات کا حال بلکہ ہر قسم کی کتابیں قصے کہانیاں پڑھتے تھے۔ پھر ہم نے دعوتیں دینی شروع کیں۔ لیکن اس میں صرف عورتیں شامل ہو سکتی تھیں۔ مردوں کا کیا کام تھا۔ ان دعوتوں میں ہم اپنا قصہ گایا کرتے تھے۔ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے ہم کیا کر سکتی ہیں۔ ہماری کون سنے گا۔ اسی زمانہ میں ہماری دعوتیں اور موسیقی سلطان کے حکم سے بند کر دی گئیں۔ اس کے قریب ایک بلجیم کے باشندہ نے سلطان کی جان پر حملہ کیا تھا۔ تمام ملک اس واقعہ کے ماتم میں پڑ گیا۔ اور سب گانا بجانا موقوف ہوگیا۔

پھر بھی میں اور میری بہن اپنے کام کی دھن میں لگے رہے۔ ہمارا مسئلہ یہ تھا۔ مہذب دنیا کیوں کر ہماری مصیبت دور کرنے کی کوشش کر سکتی ہے؟ جب اسے ہماری مصیبت سے واقفیت ہی نہیں ہمیں ایسا حامی و مددگار غیر ملکی کہاں سے مل سکتا ہے جو ہمارے حالات و خیالات کو بذریعہ خبر کے شائع کر سکے تقدیر سے اس زمانہ میں پیر لوٹی ہمارے ملک میں آئے ہوئے

تھے۔ ہم نے ٹھان لیا کہ اس شخص سے ملکر امداد کے طالب ہوں گے۔

"یہ سچ ہے پیری لوٹی واقعی ترکوں کے دوست تھے اور ہماری تہذیب کو پسند کرتے تھے۔ ہمیں انکی تصانیف ازبر یاد تھیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ ان کی نثر نظم کی ہم پلہ ہے۔ ان کے ناول ہمیشہ اصلی واقعات پر مبنی ہوتے تھے۔ اس لئے ہم جانتے تھے کہ اگر وہ ہمارا حال سنیں گے تو اسے اپنا ہنا کر کتاب کی صورت میں ضرور شایع کر دیں گے۔ اس لئے ہم نے پہلے ڈاک کے ذریعہ خط و کتابت شروع کی ان کو ترکی مستورات کے حال سے واقف ہونے کا شوق تھا۔ وہ لمبے لمبے خط جو انہوں نے اپنے ناول میں شائع کئے ہیں۔ جن پر ملکہ زینب اور زمانی کے دستخط ہیں وہ میں نے اور میری بہن نے لکھے تھے۔ ایک فرانسیسی بیگم جو ہمارے خیالات سے دلچسپی رکھتی تھیں۔ ہماری تحریر کو صرف اصلاح دیدیتی تھیں۔

اس قصہ (ناول) مسمی بہ بطلان سحر کا ترجمہ سب زبانوں میں ہوگیا ہے۔ اور اکثر اشخاص اس کے مضمون سے آشنا ہیں۔ قصہ کا مختصر بیان لطف سے خالی نہیں "تین اعلیٰ خاندان ترکی شریف زادیاں جنکے نام زمانی۔ ملکہ او[illegible] تھے اور جنہوں نے یورپین استانیوں سے [illegible] کی تھی اپنی حالات و طرز [illegible]گانی سے ناخوش تھیں ان میں سے ایک کی شادی مشرقی رواج کے بموجب ایسے شخص سے ہو چکی ہے جسے اُسنے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس لئے میاں بیوی میں نا اتفاقی ہے ان شریف زادیوں نے مہذب دنیا کو اپنے حالات سے واقف کرنے کی غرض سے ایک فرانسیسی ناول نگار سے خط کتابت شروع کی۔ اور اس سے امداد کی استدعا کی چونکہ وہ مسلمان مستورات ہیں مصنف کے سامنے نہیں آسکتیں۔ تاہم انہوں نے ملاقات کی ترکیب نکالی اور غیر معروف مقامات میں آکر ملیں اس عرصہ میں خطوں کے ذریعے ناول نگار مذکور کو اپنا کچا چھٹا کہہ سنایا۔ ملکہ کا بعد میں انتقال ہوگیا۔ زمانی خانم نے اس ناول نگار کے عشق میں اپنی جان ہلاک کر دی۔ صرف زینب باقی رہی یہہ قصہ بالکل ہمارے حسب حال تھا لوٹی نے اپنے کمال اور زور قلم سے اسے چار چاند لگا کر دلچسپ اور لاجواب بنا دیا تھا!

لوٹی کا اب انتقال ہوچکا ہے۔ سبکو معلوم ہے کہ اس افسانہ کا مسالہ ہم نے مہیا کر دیا تھا۔ اب زمانی خانم کا حال ظاہر کرنے میں کچھ تامل نہیں ہے۔ دراصل اس نام کی کوئی عورت نہیں تھی کسی دن کوئی بہن رشتہ دار کسی دن کوئی اور تیسری عورت ہمارے سامنے ضرور ہوتی تھی اور ہم سب نقاب پوش ہوتے تھے۔ پیری لوٹی نے ہم کو کبھی کھلے منہ نہیں دیکھا۔ ہمیں الزام ہے کہ ہم نے پیری لوٹی کو مغالطہ

دیا۔ یہ غلط ہے محض قصہ کو دلچسپ بنانے کی غرض سے زنانی خانم کا عشق اور مرنا تصنیف کیا گیا۔ اس فسانہ کی خاطر پیری لوٹی نے یہ گمان کر لیا۔ کہ زنانی خانم میری محبت میں اپنی جان سے گئی۔ لیکن یہ ہمارا فرض نہ تھا۔ کہ اس وہم و گمان کو غلط ثابت کرتے۔

ملکہ خانم کا مرنا بھی محض اس خیال سے اس فسانہ میں ایزاد ہوا کہ مصنف کو "ترکی جنازہ" کے شاندار مراسم و قواعد ضبط تحریر میں لانے کا موقع ملے۔ اسی طرح زنانی خانم کی وفات بھی قصہ کے ماتمی اختتام کے لئے ضروری سمجھی گئی۔ علاوہ ازیں ایک عورت جس کا منہ بھی مصنف نے نہیں دیکھا۔ اپنی جان اسکے عشق میں ہلاک کر دیتی ہے۔ اپنے حالات من وعن اسپر منکشف کر دیتی ہے۔ اس واقعہ سے ترکی مستورات کا معمہ پیری لوٹی کے لئے ایک ذاتی سوال ہو گیا جس کو اُسنے دل و جان سے مدد پہنچائی۔ یہی بات ہمیں مد نظر تھی۔ لوٹی کا دیباچہ میں یہ لکھنا کہ در اصل قصہ محض فرضی ہے۔ عبث و بے بنیاد تھا۔ ہمکو یقین تھا۔ کہ اصل حال سب کو معلوم ہو جائیگا اور ہمارا ترکی علاقہ میں رہنا محال ہو گا۔ اس لئے ہم کو وہاں سے بھاگنا ناگزیر ہوا۔ اگر ہم وہیں رہتے تو قطعی اپنی سزا کو پہنچتے۔ ترکی علاقہ سے نکل کر پیرس پہنچنا کسیقدر آسان تھا۔ لیکن سلطان عبدالحمید کے عہد میں واپس آنا قطعی ناممکن۔ ہمنے دل میں سوچا کہ فرانس پہنچکر ہم اپنے فرانسیسی رشتہ داروں کے ساتھ رہا کریں گے۔ حرم سرا کی زندگانی ہمکو قطعی دوبھر ہو گئی تھی۔ لوگوں کے طعن و تشنیع کا خیال بالائے طاق رکھ کر ہم گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ہمکو یقین تھا کہ ہمارے جلاوطن بن جانے سے لوگوں کو عبرت ہو گی اور ترکی مستورات کو آزادی کا دروازہ نظر آنے لگے گا۔ نیم فرانسیسی ہونے کے باعث ہم بہنوں کی بہت دیکھ بھال رہتی تھی۔ ہمارے یونانی اور ارمنی نوکر سب نگرانی کرنے کے لئے مامور تھے۔ ہماری حبشن لونڈیاں کبھی ہمارے پاس سے جدا نہیں ہوتی تھیں۔ پھر بھی ہم آزادی کے ایسے دلدادہ تھے کہ ہم نے سب کچھ چھوڑ کر جلاوطنی قبول کی ملک سے باہر جانے کے لئے سب سے پہلے پاس پورٹ (پروانہ راہداری) کی ضرورت تھی۔ یہ ہم نے اپنی معلمہ موسیقی کی معرفت حاصل کیا۔ استانی جی اور انکی دو لڑکیاں اسی زمانہ میں قسطنطنیہ سے مصر جانیوالی تھیں۔ انکی ایک لڑکی ہمارے ساتھ پیرس تک جانے کو رضامند تھی۔ اس لئے تینوں پروانے انہوں نے خوشی سے ہمارے ہاتھ فروخت کر دیئے۔ قیمت بیشک ہم کو بہت زیادہ دینی پڑی۔ ہم نے اپنا زیور اور قیمتی سامان فروخت کر کے یہ قرض ادا کیا۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

ہم نے سب کام سوچ سمجھ کر انجام دیا۔ نوکروں

کوکام کاج کے بہانے ادھر ادھر رخصت کیا۔ ایک زنانہ جوتی کا جوڑہ اپنے کمرہ کے باہر رکھ دیا کہ اگر سرکار (میرے والد) آجائیں تو سمجھیں کہ کوئی غیر عورت ملنے آئی ہوئی ہے۔ اور گھر میں پردہ ہے۔ ہم نے ۴۸ گھنٹے کے لئے اپنے رشتہ داروں کے گھر جانے کی اجازت حاصل کی اس عرصہ میں ہم ترکی سرحد سے باہر پہنچ سکتے تھے۔ ہم اپنی استانی جی کے گھر سے یورپین لباس پہنے دلیرانہ باہر نکل آئے پولیس نے بالکل نہیں پہچانا۔ وہاں سے اکسپریس ٹرین میں سوار ہو گئے۔

ہماری سب تدبیریں ٹھیک ہوئیں۔ لیکن خوبی تقدیر سے ہمارے والد بھی اسیدن انہی رشتہ داروں کے گھر آنکلے جن کے ہاں جانے کا بہانہ کرکے ہم دونو بہنیں نکل آئی تھیں۔ رشتہ داروں نے کہا کہ انہیں تو ہمارے آنے کا شان گمان بھی نہیں ہے۔ تاہم ہم دونوں سرحد کے پار بلغاریہ کے علاقہ میں پہنچ چکے تھے۔ چونکہ میں ابھی نابالغ تھی میرے والد خود مجھے لینے سرحد کے پار آئے۔ اسوقت سرویا کے بعض دوست ہمارے کام آئے اور ہمنے راستہ بدلکر منزل مقصود کی راہ لی۔ فرانس پہنچکر ابتدا میں ہمارا دل کچھ خوش نہیں ہوا۔ ہم آزادی کی ہوا میں بھرے ہوئے تھے آفتاب کی روشنی بلا نقاب وحجاب و بلا قیود حرم دیکھ کر تازگی حاصل ہوئی لیکن ہمارے

فرانسیسی رشتہ دار اپنے مسلمان عزیزوں سے کشادہ دلی سے نہیں ملے۔ ان لوگوں نے جنکے دادا کا نام لینا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ان کو ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی باقی نہ تھی۔ ہم نے اپنا وطن چھوڑکر آبرو سے ہاتھ دھو لیا تھا اس شرم سے میری والدہ نے وفات پائی اور والد بھی ان کے بعد ہی خدا کے گھر گئے ان کے بعد میرا چھوٹا بھائی گھر کا مالک ہوگیا ہمیں اسباب کا وہم بھی نہ تھا۔ کہ ہمارے نکلنے سے سارا گھر تباہ ہو جائے گا سلطان کا اعتماد میرے باپ پر باقی نہ رہا۔ جب تک وہ زندہ رہے ہمارے لئے کافی گذارہ خفیہ طور سے بھیجتے رہے۔ بظاہر انہوں نے ہم سے تعلق قطع کر لیا تھا۔

والد کے انتقال کے بعد میں نے ایک پولینڈ کے رئیس سے شادی کرلی۔ میرا دولہ خوبصورت تھا۔ میں دل وجان سے اسپر فدا تھی۔ میری شادی کی اجازت پوپ اعظم نے عنایت کی۔ میں نے اپنے دادا کا مذہب اختیار کر لیا تھا۔ جب میرے دادا صاحب نے مذہب تبدیل کیا سب مسلمان خوش ہو گئے تھے میرے عیسائی ہونے پر پوپ نے برکت اور دعا دی لیکن میری غریب والدہ کا دل ٹوٹ گیا۔ اور میں اپنے ملک کے قانون کے موافق محروم الارث ہو گئی۔

میری شادی کی زندگانی بہت آرام سے گذری۔ میرا خاوند بہت مالدار تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد انقلابات جنگ ہونے پر اس کی ریاست علاقہ روس میں ضبط ہوگئی۔ میری بہن کو مکماً ترکی میں واپس جانا پڑا اسوقت سے میں اپنے ملک اور عزیزوں سے قطعاً جدا ہوگئی۔ ریاست نکلجانے کے بعد چند روز زیورات بیچکر میں نے گزارہ کیا۔ پھر اپنے قدیمی شوق کی یاد آئی اور درزی کی دوکان کھول دی جس سے ہمارا بخوبی کام چلتا ہے۔ مکان نوکر نیا کر سواری سب طرح خدا کے فضل سے آسائش ہے۔ لیکن اپنے قدیمی ملک کے روایات اور طرز معاشرت وسلوک باہمی اور اسلامی حریت ومساوات کے نمونے جسکی نظیر آج تک یورپ میں بھی نہیں ہے۔ اکثر یاد آتے رہتے ہیں ؎

آتی ہے بیکسی میں خلش ہمدموں کی یاد
کانٹے بنے ہوئے ہیں سفر میں وطن کے پھول

مندرجۂ بالا افسانہ میں پیرلوٹی کے حسن بے مثال ناول کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُس کا ترجمہ عنقریب

مشہدِ عروس

کے نام سے نذر ناظرین کیا جائیگا۔ یہ ناول پیرلوٹی کا شاہپارہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اسمیں ترکی معاشرت اور قسطنطنیہ کے ایسے ایسے دلفریب مناظر پیش کئے گئے ہیں جن کے دیکھنے سے وہاں کے رسم ورواج کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ علاوہ بریں پیرلوٹی کے قلم نے جس سوزوگداز کا رنگ اس افسانہ میں بھرا ہے اور جس جوش وخروش کے ساتھ اسے ختم کیا ہے۔ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا گیا ہے کہ یہ سحر کار افسانہ کس طرح شائع ہوگا؟ اس لئے احباب ومخلصین منتظر رہیں۔ اور مجھے اپنا پتہ لکھ کر بھیجدیں تاکہ بروقت اُن کو اطلاع دیدیجائے۔ کہ وہ مذکورۂ بالا افسانہ کس طرح ملاحظہ فرما سکتے ہیں؟؟

اختر شیرانی ۔ محمد ابراہیم فیروزالدین بلڈنگس فلمنگ روڈ ۔ لاہور

کلامِ جگر

حضرت مولانا جگر مراد آبادی

وہ جانِ درد وہ ایمانِ اضطراب ہوا
تیری نظر میں جو دل لائقِ خطاب ہوا

ادب شناسِ محبت دلِ خراب ہوا
ترا حجاب نہ کرنا بھی اب حجاب ہوا

سکونِ شوق جو مائل بہ اضطراب ہوا
شراب و شیشہ بنا نغمۂ و رباب ہوا

مجھی میں گم میرا ہر کیف اضطراب ہوا
جو بچ رہا وہ میرا شوقِ کامیاب ہوا

یہی مقام ہے جو خاتمے کا باب ہوا
کہ عشق سایہ بنا سایہ آفتاب ہوا

اسی سے دل کا ہر اک نقش جلوہ تاب ہوا
میری نظر نہ ہوئی آپ کا حجاب ہوا

ستم ظریفیٔ حسنِ ازل کا کیا کہنا
وہ دل دیا کہ جسے قرب بھی عذاب ہوا

اس ایک دل کی حقیقت کو کوئی کیا جانے
جو لاکھ بار بنا اور پھر خراب ہوا

بہت ملال ہے دل کو سنا ہے یہ جب سے
بحدِّ تابِ نظر کوئی بے حجاب ہوا

نگاہِ خاک پہنچتی جمالِ معنی تک
خیال دل میں اترتے ہی اضطراب ہوا

نگاہِ شوق کی جذب و کشش ارے توبہ
جس آئینے پہ نظر کی تیرا جواب ہوا

دلِ تباہ کی کرنی ہی تھی کوئی تاویل
سمجھ لیا کہ محبت کا گھر خراب ہوا

پردہ اور اسلام

(از کے۔ اے حمید بی۔ اے (لندن) بیرسٹرایٹ لا سیالکوٹ)

(ایڈیٹر کے لئے ضروری نہیں کہ مضمون نگاروں کی ہر ایک رائے سے متفق ہو)

جب مسلمانوں کی حکومت اسپین میں ترقی کے معراج تک پہنچ چکی تھی اسوقت عیسائی مسلمانوں کی ہر بات کی تردید کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ انکی جہالت اس درجہ تک جا پہنچی تھی۔ کہ غسل مسلمانوں کا فعل سمجھا جاتا تھا۔ اور وہ عیسائی جو اپنی تمام زندگی میں غسل نہ کرے اس کی نہایت تعظیم و تکریم کی جاتی تھی وہ متبرک تسلیم ہوتا تھا۔ اس کے معتقد اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے اور اس کو "گریٹ ان ورش"، کا معزز خطاب قوم کی طرف سے پیش کیا جاتا تھا۔ چنانچہ کم وبیش پردہ کے متعلق ہم ہندوستانی مسلمانوں کا رویہ وہی ہو رہا ہے ہم لوگ موجودہ ہندوستانی پردہ کو اسلئے اچھا سمجھتے ہیں کیونکہ اہل مغرب کا طرز عمل ہمارے خلاف ہے۔

مجھے رسالہ سبیل ماہ مارچ دیکھنے کا اتفاق ہوا تو جناب حکیم فیروز الدین احمد صاحب ایڈیٹر وکیل کا مضمون "پردہ اور اسلام" دیکھ کر ازحد تعجب ہوا۔ حکیم صاحب موصوف نے فاضل اجل دی رائٹ آنریبل سید امیر علی بالقابہ کے مضمون مسلمانوں میں پردہ کی رسم کب آئی کی تردید زمانہ جاہلیت کے مشہور و معروف شاعر زیاد کے ایک مرثیہ سے کرنی چاہتی ہے اول تو مرثیہ سے بھی پردہ کا ہونا کسی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔ اور اگر ہو بھی تو تاریخی واقعات کو مرثیوں سے جھٹلانا قطعی طور پر بعید از انصاف ہے۔ اگر یہ بالفرض مان بھی لیا جائے۔ کہ اسلام سے قبل عرب میں پردہ کی رسم تھی تو کیا اس سے استدلال ہو سکتا ہے کہ اسلام کیلئے موجودہ پردہ کا ہونا لازم آتا ہے۔ ہمیں اس سے چنداں غرض نہیں کہ اسلام سے پہلے پردہ کا رواج تھا یا نہیں۔ ہمیں اس سے سروکار نہیں۔ کہ چونکہ اہل یوروپ پردہ نہیں کرتے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو ضرور کرنا چاہئے۔ حالانکہ اگر تعصب کی پٹی کو اتارا جائے تو حقیقت اس کی صاف ہے۔ بقول مولانا حالی ؎

شریعت کے احکام جو ہم نے توڑے
وہ لے جا کے سب اہل مغرب نے جوڑے

قرآن کا دعوٰی ہے۔ کہ اسلام فطرت کا مذہب ہے اور مذہبی مشکلات حل کرنے کے لئے ہمیں مرثیوں

پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ صرف قرآن کریم کی طرف ہی رجوع کرنا ضروری ہے۔ جمعیت العلما جو ہندوستان کے عالموں کی سب سے بڑی جماعت ہے۔ فتوے دے چکی ہے۔ کہ موجودہ ہندوستانی پردہ شرعی پردہ نہیں ہے۔ قرآن میں حکم ہے۔ کہ

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ

اور چاہیئے کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں

اسلام سے پہلے عرب میں بعینہٖ وہی دستور تھا۔ جو آج یورپ میں ہے۔ عورتیں اپنی چھاتی گردنیں اور خوبصورتی کی جگہیں اس طرح عریاں رکھتی تھیں جس طرح آج یورپ کے بڑے بڑے شہروں کا فیشن ہے۔ عربی عورتوں کے لباس قریباً یورپین عورتوں کی طرح ہوتے تھے۔ اور فرنچ مصنف مومیو ہارے نے اپنی کتاب میں جو عرب عورتوں کی تصاویر قبل از اسلام دکھائی ہیں۔ —— —— انہیں دیکھ کر بادی النظر میں تمیز کر لینا۔ کہ آیا عرب عورتوں کی تصویریں ہیں۔ یا پیرس کی مستورات کی۔ چنانچہ ان تصاویر میں وہی شوخی وہی شرارت اور چلبلاپن جھلکتا ہے۔ جو آج لندن کی عورتوں میں موجود ہے۔ عرب کی عورتیں چھاتیوں کو مصنوعی طور پر ابھارتی تھیں۔ اس لئے حکم ہوا کہ چاہیئے۔ کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں۔ اسلام نے صرف فتنہ کو روکا ہے۔ مگر یہ نہیں حکم نہیں کہ کاروباری ضروریات کے لئے باہر نہ نکلیں۔ اس حکم کے بعد عورتوں کا پانچ وقت مساجد میں نماز کے لئے آنا۔ رسول اللہ کے ساتھ جنگوں میں شریک ہونا اور اپنے خاوندوں کا ضروریات زندگی میں ہاتھ بٹانا قطعی طور پر مستند تواریخ اور معتبر احادیث سے ثابت ہے۔

مندرجہ بالا دعوے کی تائید خود قرآن کے لفظوں سے ظاہر ہے کہ! — قل للمومنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذالك اذكى لهم ان الله خبير بما تصنعون ۔

وقل للمومنات يغضضن من ابصارهن ويحفظن فروجهن ولا يبدين زينتهن الا ماظهر منها ۔

مفہوم ان آیات قرآنی کا یہ ہے۔ کہ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں سے کہدو کہ وہ اپنی نظروں کو نیچا رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اس کے علاوہ عورتوں کیلئے ایک اور حکم ہے۔ کہ اپنے زیورات سوائے اُن لوگوں کے جن کی فہرست قرآن میں درج ہے) کسی اور کو نہ دکھائیں۔ اگر اس سے یہ مطلب ہوتا۔ کہ عورتوں کو ہندوستان کی شہری عورتوں کی طرح اندر بند رکھا جائے یا صرف برقعہ پہن کر باہر آئیں تو قطعی طور پر یہ آیت نازل نہ ہوتی۔ اس سے

صاف طور پر ظاہر ہے کہ عورتوں کیلئے کوئی ایسی اوڑھنی تجویز کرنا جس میں ان کو کچھ نظر نہ آئے اور سامنے والوں پر نظر نہ پڑ سکے۔ قرآن کریم کا منشا نہیں بلکہ اس سے ثابت ہؤا کہ عورت کا کوئی حصّہ کھلا بھی رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے مردوں کی نظریں نیچی رکھنے کا حکم ہوا اور وہ حصہ چہرے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اور اگر اس کے خلاف مان بھی لیا جائے۔ تو پھر آنکھیں نیچی رکھنے سے کیا مطلب قرآن کریم نے خود صاف کر دیا ہے۔ کہ

الا ما ظهر منها

جو کہ قدرتی طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ یا جو فطرتاً کھلا رہتا ہے۔ تو کیا چہرہ کا ڈھانپنا یا چھپانا قدرتی اور فطرتی فعل ہو سکتا ہے۔ اور اگر زینت سے ہر جگہ مراد چہرہ اور ہاتھ لئے جائیں تو پھر بدصورت عورت کے لئے پردہ کا حکم نہ ہؤا۔ حالانکہ قرآنی احکام کوئی استثنا نہیں کرتے۔ زینت سے مراد قطعی طور پر زیورات بھی ہیں جیسا کہ خود قرآن کریم کی آیات اس پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ولا يضربن بارجلهن ليعلم ما يخفين من زينتهن۔ اور وہ اپنے پاؤں زمین پر نہ ماریں تا کہ جو زیورات وہ چھپاتی ہیں ظاہر ہوں

اس سے ظاہر ہؤا کہ لفظ زینت سے مراد زیورات بھی ہیں نیز دنیا میں جو حصہ عادتاً سب انسان کو کھلا رکھنا پڑتا ہے۔ وہ منہ اور ہاتھ میں عام حالت انسانی میں اس کے بغیر چارہ نہیں۔ دنیا میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جنہیں دنیا میں زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد اور بغیر کھلے منہ اور ہاتھ رکھنے کے یہ کام نہیں ہوتا جس سے ثابت ہؤا کہ قرآن کریم کا بھی منشا ہے کہ عورتیں سوائے منہ اور ہاتھ کے باقی زینتوں کو ڈھانپ لیا کریں۔

بعض مفسّرین کا اس بات پر قطعی اتفاق ہے۔ کہ منہ اور ہاتھ کا کھلا رکھنا اسلام میں عورت کے لئے جائز ہے۔ اور ابن عباس۔ سعید بن جبیر۔ ضحاک عطا۔ قتادہ۔ مسور بن مخرمہ۔ مجاہد۔ عامر۔ ابن زید اور زرعی کے اقوال امر بالا کی نہایت زور سے تائید کرتے ہیں۔

روح الحقانی میں الا ما ظہر منہا کی تفسیر بھی ہے اور جو زمخری نے بھی یہی لکھا ہے۔ کہ کھلی اور ظاہر رہنے والی زینت کے موقعہ منہ اور دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں مطلقاً چھپانے والے مقامات میں شامل نہیں پس ان کی طرف دیکھنا بھی گناہ نہیں۔

بعض غیر مفید احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے کہ اور ہاتھ کا بھی چھپانا اسلام میں ضروری ہے، اس بیان کی تائید میں کہا جاتا ہے۔ کہ ابن مکتوم جو

نابینا تھے۔ رسول مقبولؐ کے گھر رہتے اس وقت حضورؐ کے پاس ام سلمہ بیٹھی تھیں۔ رسولؐ نے فرمایا۔ کہ ان سے پردہ کرلو۔ انہوں نے عرض کی کہ یارسول اللہ وہ تو نابینا ہے اور اس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔ مگر تم تو نابینی نہیں۔ اگر اسکو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے۔ تو اس سے قطعی ظاہر نہیں ہوتا۔ کہ عورت کے لئے کس حصہ کا پردہ کرنا جائز ہے۔ اور کس حصہ کا ناجائز ابن کثیر نے یہی اس سے استدلال کرکے اس کے مقابل میں صحیح بخاری کی حدیث کو پیش کیا ہے۔ کہ عید کے دن چند حبشی مسجد میں اپنے ہتھیاروں کا کھیل کھا رہے تھے۔ تو عایشہ صدیقہ رسول مقبولؐ کے پیچھے کھڑی کھیل دیکھ رہی تھیں۔ اور اگر یہ جواب دیا جائے کہ ابن مکتوم کا کچھ لباس اسوقت قابل اعتراض تھا۔ تو معترض کے لئے کوئی جواب نہیں۔

ابن خلدون سے قطعی طور پر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کے وقت عورتیں منہ اور ہاتھ کھلے رکھتی تھیں۔ عباسیوں کیوقت جو خواتین کی تصاویر سید امیر علیصاحب نے اپنی کتاب سارٹ ہسٹری آف دی سارسین میں دی ہیں اور جو تاریخی واقعات انہوں نے مستند کتابوں سے اخذ کئے ہیں صاف کہے دیتے ہیں۔ کہ عورتوں کی زندگی ہندوستانی عورتوں کیطرح جکڑی ہوئی نہ تھی اور منہ اور ہاتھ کا ڈھانپنا ضروری نہ سمجھتی تھیں۔

اسلام کسی خاص ملک یا خاص قوم کا مذہب نہیں بلکہ تمام دنیا کیلئے نازل ہوا۔ اسلام و تمدن و لازم و ملزوم چیزیں ہیں اسلام سوسائٹی کو بنانے کیلئے ہے۔ نہ کہ بگاڑنے کیلئے ہندوستان کی مثال لیجئے جہاں موجودہ پردہ صرف مسلمانوں کی شہری آبادی میں رائج ہے۔ جو صرف پانچ فیصدی سے بھی کم ہے۔ گاؤں کی زندگی اس قسم کی ہے۔ کہ عورتیں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ اور اگر وہ شہری عورتوں کا برقعہ پہن لیں تو پھر دیہاتی زندگی کا خاتمہ ہے۔ برقعہ صرف وہ عورتیں پہن سکتی ہیں جنہیں کوئی کام کرنے کا ملکہ نہ ہو۔ اگر آیات قرآنی کا مطلب ہاتھ اور چہرہ چھپانے کا ہو۔ تو آیات قرآنی صرف امیر گھرانوں کی عورتوں کے لئے ہیں۔ مگر اس کے خلاف صرف اسلام ایسا مذہب ہے جس نے بادشاہوں سے لے کر غریبوں تک کیلئے ایک ہی قانون۔ اصول۔ اور قواعد اور فوائد نافذ کئے۔

حال ہی میں کلکتہ کی ایک میڈیکل رپورٹ شایع ہوئی ہے۔ جو بتلاتی ہے۔ کہ کلکتہ میں دس ہزار مسلمان عورتیں ہر سال برقعہ کی وجہ سے تپ دق کی نظر ہوتی ہیں۔ کیا قرآن کریم کا بھی یہ منشا ہو سکتا ہے۔ کہ تازہ ہوا جو حیوانوں کو کثرت سے نصیب ہوتی ہے۔ بچاری عورتوں کو برقعہ جیسی چیز سے چھین کر لے جن لوگوں کو اسلامی ممالک میں سفر کرنیکا اتفاق ٭

٭ اتفاق ہوا ہے۔ وہ بتلا سکتے ہیں۔ کہ آیا ہندوستانی پردہ کی مثال کسی اور ملک میں مل سکتی ہے۔ پردہ کب شروع ہوا۔ اور کیونکر شروع ہوا۔ ایک علیحدہ لمبا مضمون ہے جس کے متعلق انشاء اللہ پھر عرض کیا جائے گا ٭

افکارِ عالیہ

(از بلیغ الملک علامہ تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج)

تجھے مرحبا کہ دلِ نزار بحالِ زار و نزار ہے
ترے دردِ عشق کو آفریں مری زندگی مجھے بار ہے
یہ لٹی ہوئی سی بہار کیوں ہے۔ کہاں وہ جانِ بہار ہے
یہ چمن سے کون چلا گیا۔ کہ کلی کلی کو فشار ہے
مرا انیسِ غمکدہ قفس ہے عزیز جاں مجھے ہم نفس
دلِ داغدارِ غمِ بہار میں یادگارِ بہار ہے
تمہیں جاں فروز بنا کے جس نے جہاں فروز بنا دیا
وہ فروغِ بزمِ جمال کون ہے عشق نادرہ کار ہے
غمِ آشیاں مرے بال و پر کے قفس کو پھونک نہ دے کہیں
یہ نویدِ مرگ ہے ہم قفس! کہ چمن میں جوشِ بہار ہے
میں بہارِ عمر کو سوگوارِ بہار بن کے گزار دوں؟
تری یہ رضا ہے تو اس رضا پہ بہارِ عمر نثار ہے
نہیں اس میں شک کوئی تاجور کہ تڑپ ہے تیرے کلام میں
مگر اس میں تیرا کمال کیا؟ غمِ دوست درد نگار ہے

انجامِ عشق

(افسانہ)

از

"سروش"

عشق کا بے پناہ وار جب ہوتا ہے۔ تو اچانک ہوتا ہے۔ انسان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ عشق کا اندھا تیر انداز "لا ابالی پن سے چلا چڑھاتا۔ کمان کھینچتا اور ایک کاری تیر چھوڑ دیتا ہے۔ یہ تیر جس سینہ کو تاکتا اور جس دلپر وار کرتا ہے۔ اسکو وہ نیم کرکے ہی چھوڑتا ہے۔ عشق کبھی زبردستی پیدا نہیں کیا جاتا۔ عاشق بنتا نہیں۔ کوشش اور تکلف سے عشق کی چنگاریاں فروزاں نہیں کی جاتیں۔ بلکہ آن کی آن اور طرفۃ العین میں۔ بالکل غیر متوقع طور پر پیکانِ عشق پیغام لاتا اور دل و دماغ اور قلب و روح کی گہرائیوں میں پیوست ہو جاتا۔ اور بس جاتا ہے سیکڑوں بار کی دید و باز دید اور برسوں کی مجالست اور مخالطت وہ کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جو صرف ایک جھلک۔ ایک ہلکے تبسم۔ یا ایک سرسری لفظ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ —— یا انسان کی زندگی میں اس نظارے کے بعد ایسا تلاطم اور انقلاب برپا ہوتا ہے۔ کہ خود وہ انسان بھی جسپر یہ کیفیات وارد ہوتی ہیں نہیں سمجھ سکتا۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس میں سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رہتی۔ اس کے دل و دماغ اور روح پر ایک ہی جلوہ۔ ایک ہی کیفیت۔ ایک ہی منظر مستولی اور چھایا رہتا ہے۔ ہر حال میں پہلی نظر کے طلسمات اس کے سامنے رقصاں رہتے ہیں۔ وہ دنیا سے کھویا جاتا ہے۔ اس کے جاننے والے اسکو نہیں سمجھ سکتے۔ انتہا یہ ہے۔ کہ وہ بھی جسپر عشق کا جادو چل جائے۔ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے۔ یہ حالت پیدا کرنے سے پیدا نہیں ہوتی اور دور کرنے سے دور نہیں کی جا سکتی ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔

یہی حال "عزیز" کا ہوا۔ ورنہ کہاں "عزیز"۔ مدرسہ و کتاب اور صرف و نحو کا دیوانہ اور کہاں "ثریا" سے محبت و عشق۔

(۲)

"عزیز" شریف مگر غریب ماں باپ کا بیٹا تھا جنہیں

شوق تھا۔ کہ ان کا بیٹا عربی علوم کی تحصیل کرے
مولوی بنے اور فخر خاندان ثابت ہو۔ اسی خیال کے
مطابق انہوں نے پہلے اسے گاؤں کے "ملاں جی"
کے مکتب میں بٹھایا۔ پھر اس نے قصبہ کے "مولوی صاحب"
کے پاس کچھ ابتدائی کتابیں دیکھیں۔ پھر اسے نزدیک ہی
شہر کے ایک مشہور عربی مدرسہ میں داخل کر دیا گیا
اس کے ماں باپ اخراجات برداشت نہیں کر
سکتے تھے۔ اس لئے بھی اور کچھ اس خیال سے بھی
کہ قدیم سے قاعدہ ہی یہ تھا۔ کہ عموماً "دینی طلبا" کے
اخراجات مقامی مسلمانوں ہی کے ذمہ ہوتے ہیں
چنانچہ اسی اصول کے مطابق، میاں عزیز کا دونوں
وقت کا کھانا ڈپٹی "قاہر" صاحب نے اپنے ہاں مقرر کر دیا
"عزیز" مدرسہ میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔
وہ ذہین و مطیع تھا۔ پڑھنے کا اسے شوق تھا سمجھدار
اور سنجیدہ ہونے کے علاوہ خوبصورت نوجوان تھا
استاد فخر کرتے تھے۔ کہ ان کا شاگرد فارغ التحصیل
ہو کر ان کا نام روشن کرے گا۔ چھوٹے طالبعلم بڑا
سمجھ کر اور بڑے صاحب کمال خیال کر کے اس کا
احترام کرتے تھے۔ اس کا طور طریق محتاط اور چال
چلن بے داغ تھا۔ یہی سبب تھا۔ کہ ڈپٹی صاحب
بھی اسے معمولی "ملاں" یا "درویش" نہیں سمجھتے تھے
بلکہ جب وہ ان کے مکان پر جاتا۔ تو عزت و تکریم سے
پیش آتے۔ بیٹھنے کو اچھی جگہ دیتے۔ اور گھر میں
جو اچھے سے اچھا کھانا پکتا عزیز کے سامنے بھی ہی
لایا جاتا۔ "عزیز" کا دستور تھا۔ کہ ڈپٹی صاحب کے مکان
پر جاتا۔ ادب قاعدہ اور عزت و وقار سے بیٹھتا اگر
ڈپٹی صاحب مردانے میں ہوتے۔ تو جو بات پوچھتے
اس کا جواب مناسب خودداری کے ساتھ دیتا۔ نہ
بہت بولتا۔ نہ بالکل چپ رہتا۔ ورنہ جاتا کھانا
کھاتا۔ اور مدرسہ میں واپس آجاتا۔

یہ دستور العمل تھا جس کے مطابق "عزیز" کی کامیاب
طالب علمانہ زندگی بسر ہو رہی تھی۔

(۳)

حسب معمول ایک دن عزیز ڈپٹی صاحب کے
مکان پر گیا۔ وہ اکیلا تھا دستور کے مطابق جس کمرہ میں
اس کے لئے کھانا لایا جاتا تھا۔ اس میں جا کر بیٹھ گیا
کھانا لایا گیا۔ اور وہ کھانے میں مشغول ہو گیا۔ زنانہ
حصہ مکان کا کواڑ جو اتفاقاً خادمہ سے کھلا رہ گیا
تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اچانک عزیز کی ادھر نگاہ
اٹھ گئی۔ نگاہ کیا اٹھی کہ سامنے سے ایک بجلی کوند
گئی۔ اور غریب "عزیز" کے خرمن ہست و بود اور
ہوش و خرد کو جلا گئی۔

یہ نظارہ بہت ہی مختصر کہنا چاہئے۔ بلکہ خواب
کی مانند تھا۔ مگر باوجود اس سرعت رفتار کے "عزیز"
کا کام تمام ہو گیا۔ کھانا جہاں تھا وہیں دھرا رہ گیا
نہ نوالہ اٹھانے کی طاقت رہی نہ ہوش۔ آنکھیں

کملی کی کملی رہ گئیں۔ اور وہ جہاں تھا وہیں بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا گویا کہ وہ زمین کے ساتھ جم گیا۔ حیران تھا۔ کہ یہ آخر یہ ہوا کیا۔ وہ اس واقعہ کو حقیقت سمجھتا تھا۔ مگر خیال ایسا ہوتا تھا۔ کہ شاید اس نے خواب دیکھا ہے۔ لیکن یہ تو سچ مچ واقعہ ہی تھا۔ وہ کھانا کھا رہا تھا۔ کہ یونہی بلا قصد اس کی نظر زنانہ حصہ مکان کے دروازے کی طرف اُٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ ایک دوشیزہ ایک حسن و رعنائی کی دیوی۔ اس کے سامنے ادھر سے اُدھر نکل گئی یہ دوشیزہ ڈپٹی صاحب کی پڑھی لکھی شبنم کے قطروں کی طرح پاک دامن اور گلاب کے تازہ کھلے ہوئے پھول کی طرح تر و تازہ اور حسن و جمال کا بہترین نمونہ لڑکی "ثریا" تھی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر۔ لباس بالکل سادہ تھا۔ شباب و رعنائی اور حسن و جمال مجموعی طور پر جتنی خوبیاں کسی ہستی میں پیدا کر سکتی ہیں۔ قدرت نے نہایت فیاضی سے ساری کی ساری ثریا کو عطا کی تھیں۔ تعلیم نے اس کی خوبیوں کو اور چمکا دیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم اور صحیح تربیت نے اس کے اخلاق کو وسیع اور زیادہ بلند کر کے اسے سکھا دیا تھا۔ کہ عورت کی پاکیزگی۔ اور معصومیت صرف اس کی آنکھ اس کے دل اس کی رفتار اس کی حرکات وسکنات میں پوشیدہ ہے۔ اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مکمل عورت تھی۔ وہ ایسی ہستی تھی جسے عورت کہا جا سکتا ہے۔

(۴)

"یہ ثریا" ہی تھی۔ جس کی ایک جھلک نے عزیز کو دونوں جہان سے بالکل کھو دیا تھا۔ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ثریا نے بھی عزیز کو اس وقت دیکھا تھا یا نہیں۔ یہ بات تو مستقبل بتائے گا۔ مگر "عزیز" کیلئے یہی پہلی نظر آخری ثابت ہوئی۔ عشق و محبت کی ساری منزلیں اسی ایک نگاہ میں طے ہو گئیں وہ قطعاً بھول گیا۔ کہ میں ایک غریب نادار طالب علم ہوں۔ جو عربی پڑھتا۔ اور صبح شام کی روٹی کے لئے "ثریا" کے باپ ڈپٹی صاحب کی روٹیوں کا محتاج ہوں عشق کا حملہ اتنا مکمل تھا۔ کہ غریب بچارا اُلٹا۔ اسکی زد سے نہ بچ سکا۔ جوں توں کر کے کھانا تو ختم ہوا اور خلاف معمول کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا۔ اور پھر مدرسہ کو چلا گیا۔ اب اس کے روزمرہ مشاغل میں تبدیلی شروع ہوئی۔ یا تو وہ مدرسہ سے آتا اور کھانا کھا کر چلا جایا کرتا تھا۔ لیکن اب کھانے کے وقت سے بہت پہلے آتا اور کھانے سے فارغ ہو کر بہت دیر تک حیران اور کچھ کھویا کھویا سا وہیں بیٹھا رہتا پہلے تو اس کے اوقات کا زیادہ حصہ مدرسہ میں صرف ہوتا تھا۔ یا اب یہ کیفیت تھی۔ کہ اس کا زیادہ وقت ڈپٹی صاحب کے مکان پر بسر ہونے لگا۔ کتابوں سے تو اسے واسطہ ہی نہ رہا تھا۔ مدرسہ میں جاتا ضرور تھا۔ کتابوں کو کھولتا بھی تھا۔ لیکن الفاظ کتاب کے

چیرنے والی نگاہیں کسی اور ہی جلوے کے نقش و نگار کے مطالعہ میں مصروف ہوتی تھیں۔ دل و دماغ بجائے مطالب کتاب کو حل کرنے کے حسن و جمال کی باریکیوں میں ڈوبے رہتے تھے۔ اور خیالات و جذبات حسن و عشق کی نزاکتوں کے فلسفہ میں اُلجھے رہتے تھے

چند روز تک تو مدرسہ میں اس بات کا کسی کو خیال بھی نہیں ہوا۔ کیونکہ پُرانے ڈھرے کے مدرسوں میں نفسیات پر غور کرنے کی فرصت کسے ہوتی ہے۔ ہر کہ و مہ کتاب کا کیڑا ہوتا ہے۔ استاد سے لیکر شاگرد تک کی نظر زمین پر پھیلائی ہوئی کتاب پر بچھی ہوئی ہوتی ہے۔ بلکہ خود بھی وہ لوگ کتاب پر اتنے جھکتے ہیں۔ گویا کہ اوندھے منہ لیٹے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر کسی نے "عزیز" کی متغیر حالت کو نہیں دیکھا۔ یا نہیں سمجھا۔ تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

رہے ڈپٹی صاحب چونکہ وہ عموماً دن بھر کچہری میں رہتے تھے۔ اور ان کے نوجوان فرزند کالج میں اور رات کے وقت یہ لوگ زنانہ میں ہوتے تھے اور "عزیز" مردانہ میں معتکف۔ ایسی حالت میں کون تھا۔ جو اس بات کو سوچتا۔ ادنےٰ ملازمین تو صرف یہ جانتے تھے کہ "مولوی صاحب" ہمیشہ آتے ہیں ڈپٹی صاحب انکی عزت کرتے ہیں۔ آج کل زیادہ دیر تک بیٹھتے ہیں۔ اور اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ مگر یہ بات ایک آدھ روز یا چند دن کی تو تھی نہیں۔ اب تو دنوں سے گذر کر ہفتے گذرنے لگے۔ وقت کے ساتھ عزیز کی نشست میں بھی وسعت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ ڈپٹی صاحب تو خیر۔ البتہ اُنکے فرزند جوان سال کو کچھ خیال سا ہوا۔ کہ آخر عزیز کیوں اسطرح دھرنا مار کر یہاں بیٹھا رہتا ہے

(۵)

نوجوان بیٹے نے باپ سے یہ قصہ کہا تو اب اُنکے دل میں بھی کھٹکا ہوا۔ کہ کچھ بات ضرور ہے اور بات بھی حیرتناک کیونکہ اب آنکھیں کھلیں تو نظر آیا کہ اُنکے زنانہ خانہ میں بھی "حرم کا پھول" روز بروز کملاتا جا رہا ہے۔ پہلے تو عزیز کو مدرسہ میں رہنے کی نصیحت کی گئی۔ مگر جب یہ نصیحت بیکار ہوئی تو آخر نوکروں کو اشارہ کیا گیا۔ کہ عزیز جب آئے تو اس کو اندر مت آنے دو۔ باہر ہی روک دو چنانچہ روز کی طرح عزیز آیا تو دربان نے مکان کے اندر داخل ہونے سے روکا عزیز رک گیا۔ مکان کے احاطے میں داخل نہیں ہوا۔ مگر دروازہ کے سامنے کھڑا رہا دربان کو تو صرف یہی حکم تھا۔ کہ اندر مت آنے دو۔ یہ تو نہیں کہا گیا تھا۔ کہ دروازے پر بھی ٹھہرنے نہ دینا۔ "عزیز" بہت دیر تک دروازے کے پاس کھڑا رہا آخر چلا گیا۔ لیکن اب یہ معمول ہو گیا۔ کہ وقت

جو ڈپٹی صاحب کے ایوان میں کسی کی یاد میں کٹتا تھا۔ ان کے دروازے کے سامنے صرف ہونے لگا۔ مگر ڈپٹی صاحب اس کو کب برداشت کر سکتے تھے۔ دو تین روز کے بعد نوکر کو حکم دیا گیا کہ جب عزیز آئے اور دروازے کے سامنے کھڑا ہو۔ تو اسے سختی سے وہاں سے ہٹا دو۔ اشارہ کی دیر تھی اب "عزیز" پر سختی شروع ہوگئی۔ عزیز دروازے سے پرے تو ہٹ گیا۔ لیکن دروازے سے کچھ ہی فاصلہ پر جم گیا۔ اب تو آنے جانے والوں کے لئے بھی ایک عجوبہ سا ہو گیا عزیز کا معمول یہ تھا کہ ہر روز آتا۔ نوکر سختی سے ہٹاتا۔ وہ دروازے سے پرے ہٹ جاتا۔ لیکن ڈپٹی صاحب کی دیوار و در کے پاس سڑک پر گھومتا رہتا۔ لوگ دیکھتے اور بعض کھڑے بھی ہو جاتے دیکھنے والے حیران تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ ڈپٹی صاحب کے نوکر غراتے تھے عزیز مطلق خاموش اور قطعاً حیرت زدہ تھا۔ لوگ کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ کہ یہ معمہ کیا ہے۔

(۶)

ڈپٹی صاحب حیران تھے کہ اس بلا کو اپنے گھر سے کسطرح دور کریں۔ وہ بولتا نہ تھا۔ وہ بگڑتا نہ تھا۔ وہ گاتا نہ تھا۔ وہ ہنستا نہ تھا مارنے پر وہ چیختا چلاتا نہ تھا۔ غرض ایک خاموشی اور سکوت حیرت، مدہوشی اور کمال وارفتگی کی کیفیت اس پر طاری تھی۔ پولیس کو بلا نہیں سکتے تھے جتنی سختی اُس پر کر رہے تھے اس سے زیادہ کر نہیں سکتے تھے معاملہ کیا تھا؟ کسی کو بتا نہیں سکتے تھے غرض ڈپٹی صاحب کی جان ایک آفت میں تھی۔ ادھر عزیز کے معمولات جاری تھے اس کی کوچہ گردی اور ڈپٹی صاحب کے مکان کے ارد گرد جمے رہنے کا ڈھنگ روز مرہ کا دستور العمل ہو گیا تھا۔ دوسری طرف ڈپٹی صاحب دیکھ رہے تھے۔ کہ اُن کی "ثریا" اندر ہی اندر گھلی جا رہی تھی۔ خیال کرتے تھے شریف زادی ہے۔ اس بدنامی سے پریشان ہے ناچار ہو کر ڈپٹی صاحب نے تجویز کی کہ ثریا کو خاموشی سے کسی دوسرے شہر میں اپنے عزیزوں کے ہاں بھیجدیں وہاں اس کی طبیعت سنبھل جائیگی۔ اور یہ شخص یونہی ٹکریں مار مار کر بیٹھ رہیگا۔ چنانچہ اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ اور "ثریا" کو دوسرے شہر میں اس کے چچا کے ہاں پہنچا دیا گیا۔ اس کارروائی کے بعد ڈپٹی صاحب ایک حد تک مطمئن ہو گئے۔

(۷)

دس پندرہ روز تک تو عزیز کو پتہ نہ لگا۔ کہ اس کا پھول اب اس باغ میں نہیں رہا۔ مگر نہ جانے کیونکر اس کو آخر پتہ لگا۔ کہ ثریا، باہر چلی گئی ہے یا بھیجدی گئی ہے۔ تو عزیز مجنوں بھی ڈپٹی صاحب کے بام و در کا طواف چھوڑ کر پاپیادہ منزل مقصود کی طرف چل

پڑا۔ لاچار اور مجبور ثریا کے خیال کے پاس نہ تھا سواری کا انتظام نہ تھا زبان کی گویائی غائب اور دل کی آل اندیشیاں رخصت ہو چکی تھیں۔ پھر کیسے زاد سفر مہیا کرتا اور کس سے کرتا۔ پیدل چلا اور اس بے سروسامانی کے ساتھ سیکڑوں میل طے کر کے آخر منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ اور کسی طرح پتہ لگا کہ ثریا کس محلہ اور مکان میں رہتی ہے۔ جب کعبہ نظر آئے تو پھر طواف کیوں نہ۔ جب مندر دکھائی دے تو پرنام نہ کرنے کے کیا معنے۔ چنانچہ اب "عزیز" تھا اور ثریا کے چچا کے گھر کا طواف۔ گھر کے لوگ اس راز سے واقف تھے جب انہوں نے عزیز کو یہاں بھی گھومتے دیکھا۔ تو گھبرا گئے کہ اب کیا کریں۔ ڈرے کہ وہاں تو جو گل کھلنا تھا۔ کھل چکا۔ اب یہاں بھی بدنامی نہ ہو عزیز کو روک نہیں سکتے تھے۔ ہٹا نہیں سکتے تھے۔ اس پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ کیونکہ وہ بظاہر کوئی ضرر ان کو نہیں پہنچاتا تھا۔ آخر یہی سمجھ میں آیا کہ چپکے سے ثریا کو پھر ڈپٹی صاحب کے پاس بھیجدیا جائے اور عزیز بڑا مارا مارا پھرتا ہے۔ چنانچہ ثریا کو پھر وہاں بھیجدیا گیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد عزیز پر بھی یہ راز کھل گیا۔ اب اس کا یہاں کیا مطلب تھا۔ یہاں اٹھا اور سیدھا وطن جاناں کو پھر چل دیا۔ پاپیادہ برے حالوں ننگے پیروں۔ حالت یہ تھی کہ راستہ میں کوئی شخص رحم کھا کے کچھ کھلا دیتا تو کھا لیتا۔ ورنہ اسے تو گویا کھانے پینے کی خواہش ہی نہیں رہی تھی ... لیا تھا۔ پہلے بھی سفر طے کیا تھا۔ مگر اب کی ... پیروں میں زخم ہو گئے اور زخم ناسور بنکر بہنے لگے لیکن تکلیف عزیز کو سفر سے روک نہ سکتی تھی وہ چلتا رہا۔ اور آخر وہاں پہنچکر ڈپٹی صاحب کے مکان کے سامنے گھومنے لگا۔

(۸)

اب تو ڈپٹی صاحب کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی زبانی وہ سمجھا چکے سختی وہ کر چکے۔ زدوکوب وہ کر چکے ثریا کو بھی یہاں وہاں چھپا چکے۔ لیکن پر ... عزیز کے جنون عشق کے دور کرنے میں قطعاً ناکام رہے لہذا اب انہیں یہی علاج نظر آیا کہ اس کی زندگی کا خاتمہ ہی کر دیا جائے۔ روک ٹوک اٹھا دی گئی اور ملازم کو حکم دیدیا گیا۔ عزیز آئے تو اسے آنے دو۔ آئے تو اسے عزت و تکریم سے بٹھانا۔ چنانچہ عزیز آیا اور دروازہ کے سامنے پھرنے لگا۔ ملازم نے کسی قسم کی سختی کی بجائے۔ نرمی سے کہا۔ آئیے۔ آئیے وہ اندر آگیا اس کو ادب سے بٹھا دیا گیا۔ اسے ہوش کہاں تھے کہ وہ اس ظاہری ادب آداب کی تہ میں چھپے ہوئے اصلی خوفناک ارادوں کو بھانپ سکتا۔ اس لئے معصوم پرندہ کی طرح جال میں آ پھنسا۔ ڈپٹی صاحب کو اطلاع کر دی گئی کہ صید زد پر آگیا ہے۔ ڈپٹی صاحب نے ایک بوڑھیا خادمہ کے ہاتھ شربت کا گلاس ...

کہا کہ یہ شربت پی لیجئے عزیز نے گلاس لے لیا۔ دیکھا اور یہ کہہ کر بوڑھیا ہی کو دیدیا۔ کہ میں نہیں پیتا اس میں تو زہر ہے۔ یہ سُنکر بڑھیا گھبرا گئی۔ گلاس لے کر الٹے پاؤں ڈپٹی صاحب کے پاس گئی۔ اور بولی کہ وہ تو نہیں پیتا۔ کہتا ہے۔ کہ اس میں زہر ہے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا کہ دوبارہ لے جاؤ۔ اور کہو کہ انہوں نے بھیجا ہے۔ اور کہا ہے۔ کہ آپ اسے پی لیں بڑھیا اب کی بار آئی اور اسی طرح کہا۔ عزیز نے کہا جاؤ۔ میں نہیں پیتا اس میں تو زہر ہے یہ جواب سنکر بڑھیا پھر پلٹنے لگی۔ اس کو واپس جاتے دیکھ کر "عزیز" مضطر ہو گیا۔ اور بولا اچھا لاؤ لاؤ۔ اُنہوں نے بھیجا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ میں پی لوں لاؤ۔ لاؤ۔ میں پیتا ہوں بوڑھیا نے گلاس عزیز کو دیدیا۔ اور وہ لیتے ہی زہر آمیز شربت غٹ غٹ کر کے پی گیا۔

بوڑھیا تو خالی گلاس لیکر زنانہ مکان میں چلی گئی۔ اور "عزیز" زہر کا پیالہ پی کر یہاں سے اٹھا۔ اور باہر نکل گیا۔ تھوڑی دور ہی گیا تھا۔ کہ اس کی طبیعت بگڑنے لگی۔ آخر زہر نے اپنا اثر کیا۔ اور عزیز مر گیا اور اس واقعہ کی شہرت دم بھر میں تمام شہر میں پھیل گئی۔ حتیٰ کہ پردے میں بیٹھی ہوئی ثریا کو بھی علم ہو گیا۔ کہ عزیز کا یہ انجام ہوا۔ یہ خبر ناشاد و نامراد ثریا کے لئے بھی پیغام اجل ثابت ہوئی اور اسکی روح بھی خبر ملنے کے ساتھ ہی جسم سے پرواز کر گئی۔

ڈپٹی صاحب کے گھر میں ثریا کی اچانک موت سے کہرام پڑ گیا۔ اور ثریا کی ناکام جوانا مرگی پہ ماتم شروع ہو گیا۔

(۹)

مسکین غریب۔ مظلوم۔ مسافر۔ نادار و کس مپرس عزیز کو رونے والا کون تھا۔ نہیں نہیں اس کی شوریدہ سری نے اس کے ہمدرد بھی پیدا کر دیئے تھے جو اس کے کفن دفن میں مشغول تھے۔ ادھر ڈپٹی صاحب کے مکان پر پُرسا دینے والوں کا ہجوم ہو گیا۔ عزیز و ثریا کا قصہ اب چھپا ہوا راز نہ تھا۔ اس کی تہ تک بہت لوگ پہنچ چکے تھے۔ عزیز مر گیا تھا۔ مگر عزیز کے ساتھ ہی ثریا کی موت۔ ایسا سانحہ تھا۔ کہ پرسا دینے والے بھی سرگوشی سے خاموش نہ رہ سکتے تھے اسی کے متعلق لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں دینے کو تو ڈپٹی صاحب نے عزیز کو زہر دے کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ مگر ثریا کی مرگ مفاجات نے ان کی حالت عجیب کر دی تھی۔ یا تو وہ عزیز سے ایسے متنفر تھے۔ کہ اس کی جان تک لیلی۔ یا اب اُنپر یہ اثر ہوا کہ وہ "عزیز" کے "مجذوب" ہونے اور اس کی "ذہنیت" قلاقت کے قائل ہو گئے۔ حیران تھے اور سخت پشیمان لیکن چارہ کاران کی دسترس سے باہر تھا۔ عزیز مسموم ہو کر مر گیا تھا۔ اور ثریا بھی موت کے آغوش میں تھی۔ اس حالت میں وہ اپنے کئے کی کیا تلافی کر سکتے تھے کچھ بھی نہیں۔

خواروں کا مجمع تھا۔ ڈپٹی صاحب ایک محو شخص کی طرح مجمع میں بیٹھے کہہ رہے تھے۔ میں تو واقف نہ تھا۔ کہ عزیزؔ ایسا پہنچا ہوا انسان ہے" یہ اس کی موت کا وبال مجھ پر پڑا ہے۔ کہ میری چاند سی بیٹی دم کے دم میں ٹھنڈی ہو گئی۔ اب اس کے سوا میرے بس میں کیا ہے۔ کہ دونوں کو اکٹھا دفن کر دوں۔ خواہ اس میں میری اور میرے خاندان کی کتنی ہی بدنامی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا بھی کہ ایک ہی قبر بنائی گئی اور اس میں ایک ساتھ عزیز و ثریا کو ابدی نیند سلا دیا گیا۔

سنا گیا ہے کہ پولیس نے اس میں مداخلت کی تھی مگر خدا جانے کس طرح سے یہ معاملہ رفت گذشت ہو گیا۔

لیکن اتنا تو آپ نے دیکھ لیا۔ کہ عشق صادق اپنے اندر کتنی قوت رکھتا ہے۔ اگر عشق کے وار سے عزیزؔ" گھایل تھا۔ تو انجام بتاتا ہے۔ کہ ثریا بھی اسی وار سے مجروح اور بسمل تھی۔ عزیز جنونِ عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر کوچہ و بازار میں بے آب پھرتا تھا۔ اور ثریا اندر ہی اندر پردے میں بیٹھی گھلی جا رہی تھی۔ ثریا کے باپ نے ثریا کو نہ سمجھا۔ بلکہ انہوں نے اس کی اس حالت کو حیا اور یا بدنامی کا خوف خیال کیا۔ مگر عشق کی اثر اندازی سے بے خبر رہے۔ عزیز کو زہر دے دیا اور وہ مر گیا مگر عزیز کی موت ثریا کو بھی لے مری۔ ثریا کے باپ نے اپنے "گناہ" کا کفارہ دے دیا۔ عزیز کو مرنے کے بعد وہ چیز ملی جو وہ زندگی میں چاہتا تھا۔ لوگ کہہ سکتے ہیں۔ کہ دونوں ناکام مرے۔ مگر عشق کے فلسفہ کے ماہر غالباً یہی بتائیں گے۔ کہ عزیز و ثریا کی اس سے بڑھ کر فتحیابی ناممکن ہے۔ زندگی میں ان کے جسم جدا جدا تھے۔ مگر ان کی روحیں ایک ہی فضا میں پرواز کرتی تھیں۔ اور ایک ہی قسم کی کیفیات سے متکیف ہوتی تھیں اور جب موت نے عزیز و ثریا کو اپنے قبضہ میں لیلیا۔ تو ان کا جسم بھی ایک ساتھ ملکر ابدی نیند کے مزے لینے لگے۔ کیا اب بھی اسکو عزیز و ثریا کی ناکامی کہا جائے گا۔

کرشمۂ شوخی

افسانہ

(از حضرت "غریب" جہساں آبادی)

مسٹر جان ہملٹن پاٹر مالک مطبع و بانئے کارخانہ مشہور کتب فروشی نیویارک نے ٹائپ شدہ رسالہ جس پر وہ دیر سے غور کر رہے تھے۔ ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور غنودگی کے عالم میں سامنے کے پائیں باغ کے سبزہ زار اور پھولوں کی بہار پر جو سکیلڈنگ ہال (SKelding Hall) کے احاطہ میں جولن کی آفتاب کی روشنی میں جگمگا رہے تھے نظر ڈالی۔ ان کا دل بہت خوش تھا۔ خندق کا پانی سیال چاندی کے مانند چمک رہا تھا۔ دیہی خوشگوار ہوا تازہ گھاس اور پھولوں کی مہک مشام دماغ تک پہنچا رہی تھی۔ قمری شاندار صنوبر کی شاخوں پہ بیٹھی حق سرہ کا نعرہ لگا رہی تھی + پاٹر صاحب نے مسٹر کلفورڈ گینڈل (C. Gandle) کو دوپہر کے کھانے کے بعد نہیں دیکھا تھا۔ ان کے خیال میں اس وقت خداوند کریم کی مشیت عرش معلیٰ سے تمام دنیا کو سکون و راحت پہنچانے میں مصروف و مشغول تھی۔

پاٹر صاحب نے خیال کیا۔ کہ قدیمی دنیا کے اس خوشگوار امن و امان سے محروم رہنے میں کیا کسر باقی رہ گئی تھی حُسنِ اتفاق سے انگلستان پہنچنے کے چند روز بعد ان کی ملاقات ایک ضیافت میں لیڈی وکہم ——— سے ہوگئی۔ لیڈی صاحبہ نے ان کو سکیلڈنگ ہال میں مدعو کیا۔ حضرت پہلے تو انکار ہی کرنے والے تھے۔ لیکن لیڈی صاحبہ کی چرب زبانی اور شان و شوکت نے ان کو اُبھارا۔ یہ ابھی ابھی بستر علالت سے اٹھے تھے اور ڈاکٹر صاحبان نے بغرض حصولِ صحت ان کو آرام و سکون کی ہدایات کی تھیں۔ لیڈی صاحبہ موصوف ناول نویسی کی شایق تھیں۔ اور مالک مطبع ہونے کے لحاظ سے حضرت نے تاڑ لیا۔ کہ اس دعوت شیراز سے اصل مطلب دراصل اپنے تصانیف کی اشاعت تھا۔ تاہم آرام کی غرض۔ قدیمی عملداری میں رہنے کا شوق۔ ان کو سکیلڈنگ ہال میں جو خاندان ٹیوڈر (Tudar) کے وقت کی تعمیر ہے۔ کھینچ لایا۔ اس تبدیل مقام اور حصول سکون و راحت سے وہ بظاہر بہت خوش اور اپنے کارخانہ کے کاروبار و اہتمام سے بے فکر تھے۔ البتہ ان کے رفیق مسٹر گینڈل کی بجھیدار اور عالمانہ تقریریں مختلف مسایل پر ان کو ضرور پریشان کیا کرتی تھیں۔

یہ مکان بالکل نمونۂ بہشت تھا۔ بلکہ حور بھی اس میں موجود تھی۔ اسی وقت مسٹر پاٹر کے سامنے سبزہ زار کی طرف سے ربڑ کے کھلونہ کی طرح اچھلتی اٹھلاتی ہوئی ایک لڑکی نظر آئی۔ یہ نہایت طفلانہ انداز سے بے تحاشا بال والے سر کھولے ہوئے ان کی طرف بڑھی۔

لڑکی۔ پاٹر صاحب آداب مزاج عالی؟

پاٹر صاحب بھلا بھلا بھلا نہ کر اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ لڑکی کا نام رابرٹا وکہم تھا یعنی وہ مالکہ مکان کی صاحبزادی تھی۔ اس کی خوش مزاجی سے پاٹر صاحب شروع سے اس سے مانوس ہو گئے تھے۔

لڑکی۔ آپ کھڑے نہ ہوں۔ آپ کیا کتاب پڑھ رہے ہیں "نازک خودکشی کے محاسن"؟

پاٹر۔ بے شک ایسی لطیف جگہ ایسی کتاب کا مطالعہ نامُود ہے۔ لیکن مالک مطبع کو فرصت کہاں یہ کتاب میرے پاس مطبع سے جانچنے کے لئے آئی ہے۔ مجھے تعطیل میں بھی لوگ چین نہیں لینے دیتے رابرٹا وکہم کی کرنجی آنکھیں فکر سے غبار آلود ہو گئیں۔ بولی اگر مجھے کلفورڈ گینڈل صاحب سے زیادہ سابقہ رہا۔ تو شاید مجھے بھی خودکشی کرنی پڑے گی۔

پاٹر صاحب ہکا بکا ہو گئے۔ وہ اس لڑکی کو اچھا سمجھتے تھے۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا۔ کہ اس کے خیالات بھی گینڈل صاحب کی نسبت ان کی رائے موافق نہیں۔

پاٹر صاحب۔ کیا تم گینڈل صاحب کو پسند نہیں کرتیں

لڑکی۔ نہیں ہرگز نہیں۔

پاٹر صاحب۔ مجھے بھی ان کی کوئی ادا نہیں بھاتی۔

لڑکی۔ نہ اور کسی کو۔ مگر اماں جان ان کو عجوبہ سمجھتی ہیں

پاٹر صاحب۔ بھلا لیکن وہ پارلیمنٹ کے ممبر تو ہیں لوگ کہتے ہیں۔ کہ کسی دن مجلس وزرا میں بھی جا بیٹھیں گے۔

لڑکی۔ مجھے بھی وہ ایسا ہی سُناتے تھے۔ لیکن ایسی وجوہات سے انسان مغرور ڈھکوسلا بن جاتا ہے۔

پاٹر صاحب۔ یہ بالکل سچ ہے۔ وہ جب مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ تو ایسا ظاہر ہوتا ہے۔ کہ گویا وہ اپنے کم عقل نافہم موکلوں سے گفتگو کر رہے ہیں

لڑکی۔ جی ہاں۔ میں بھی ان سے اسی طرح ہمکلام ہوتی ہوں۔ مگر ان حضرت سے الگ تھلگ رہنا مشکل ہے۔ آپ کسی سے ذکر نہ کریں۔ ایک دن وہ تشریف لائے۔ تو میں الماری کھول کر اس میں چھپ گئی۔ لیکن بدقسمتی سے انہوں نے الماری کھول کر مجھے ڈھونڈ نکالا۔ میں بہت پشیمان ہوئی۔ . . . . اچھا پھر اور کچھ کہوں گی۔ اب تو اماں جان آرہی ہیں۔ لایق مصنفہ کی گرجتی ہوئی آواز اس گرمی کے سہ پہر میں گونج اٹھی۔ پاٹر صاحب نے گھبرا کر آواز کی طرف مڑ کر دیکھا۔ لیڈی وکہم سبزہ زار میں کھڑی تھیں۔ مسٹر پاٹر نے محسوس کیا۔ کہ ان کی غمگین دوست لیڈی صاحب کی طرف چلی۔

لیڈی وکہم۔ رابرٹا۔ تم کہاں تھیں۔ میں چار دن طرف تم کو دیکھ رہی تھی۔

رابرٹا۔ اماں جان کیا کوئی کام ہے۔

لیڈی وکہم۔ گینڈل صاحب ہرٹ فورڈ جائیں گے۔ انہیں کتابیں خریدنی ہیں۔ تم ان کو اپنی موٹر میں سوار کر کے لے جاؤ۔

رابرٹا۔ ہیں اماں! (پاٹر صاحب نے دیکھا۔ کہ اس جواب

سے لیڈی صاحب کبیدہ خاطر ہو گئیں۔)

لیڈی وکھم۔ رابرٹا میں قطعی تم سے کہتی ہوں۔ کہ گینڈل صاحب کو ہرٹ فورڈ موٹر میں ضرور لے جاؤ

رابرٹا۔ لیکن میں نے تو کرفٹ صاحب کے ہاں ٹنیس کھیلنے کا وعدہ کر لیا ہے۔

لیڈی وکھم۔ گینڈل صاحب بمقابلہ نوجوان کرفٹ کا ہل کر کے بہت قابل ہیں۔ ان کا ساتھ غنیمت سمجھو۔ دوڑ کر جاؤ۔ اور کرفٹ سے کہہ دو۔ کہ تم نہیں آ سکتیں۔

چند منٹ بعد ایک چھوٹی دو نشست والی موٹر کرفٹ صاحب کے مکان کے دروازہ پر موجود ہو گئی رابرٹا۔ وکھم چلانے کی جگہ بیٹھی تھی۔ کرفٹ فلالین پہنے کھڑکی میں سے نمودار ہوا۔

کرفٹ۔ ہیں ہیں تم ٹنیس کا بلا لے کر کیوں نہیں آئیں؟

رابرٹا۔ ٹنیس تو ختم ہو لیا۔ مجھے گینڈل صاحب کو ہرٹ فورڈ لے جانا ہے۔ کرفٹ میں تم سے ایک بات کہتی ہوں۔ دیکھو۔ اپنے دل میں رکھنا۔ اماں جان میری شادی گینڈل صاحب سے کرنی چاہتی ہیں۔ وہ بہت گرویدہ ہو رہی ہیں۔ اور کہتی ہیں۔ کہ گینڈل صاحب کے ساتھ رہنے سے میں آدمی بن جاؤں گی۔

کرفٹ۔ لاحول ولا قوۃ۔ میرا کہا مانو۔ تو اس تجویز کو تم ہرگز مت چلنے دینا۔ میں آکسفورڈ میں گینڈل کے ساتھ پڑھتا تھا۔ یہ شخص یونین کا پریسیڈنٹ اور کیا کچھ رہ چکا ہے۔ مگر عقل سے بے بہرہ ہے۔

رابرٹا۔ بڑی مشکل کی بات ہے۔ مجھے خبر نہیں۔ میں کیا کروں۔

کرفٹ۔ اس بے دید دن میں خاک ڈال دو۔ اور کہہ دو۔ اپنی خبر لے۔

رابرٹا۔ لیکن اماں جان کا حکم نہ ماننا بہت دشوار ہے۔ تم تو ان کو خوب جانتے ہو۔ سوچ کر۔ خیر کیسے معلوم ہے۔ کیا افتاد پڑے۔ ممکن ہے۔ کہ اماں جان کسی نہ کسی وجہ سے یکایک ان سے متنفر ہو جائیں۔ بعض وقت ان کا خیال یکایک بدل جاتا ہے۔

کرفٹ۔ ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ لیڈی وکھم پہلے مجھ سے بھی ناراض تھیں۔ دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔

رات آ گئی۔ لیڈی وکھم اپنے مطالبہ کے کمرہ میں اس خیال میں محو تھیں۔ کہ کسی دن ان کی تصانیف کا دنیا کی تمام زبانوں میں ترجمہ ہو جاویگا۔ ان کی صاحبزادی میدان میں گشت لگا رہی تھی۔ اور کھانے کے بعد گینڈل صاحب سے آنکھ بچا کر باہر بھاگ آئی تھی۔ گینڈل صاحب ناکام محبت کی صورت بلکا اور کوٹ پہنے اس کی تلاش میں نکلے اس وقت پاٹر صاحب سب سے الگ خندق کے سطح آب پر بیٹھے ہوئے اپنا دل بہلا رہے تھے۔ یہ نظارہ ان کو شروع سے مرغوب تھا۔ بید مجنوں کے قریب خندق ایک چھوٹی سی جھیل بن گئی تھی۔ ستاروں کا عکس پانی میں بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ سکون بخش اندھیرا اس مالک مطلع

کو اپنے سیاہ کمبل میں لپٹے ہوئے تھا۔ رات کی سرد ہوا مستانہ وار چل رہی تھی۔ مسٹر پاٹر آہستہ آہستہ چلتے ہوئی کشتی میں آرام فرما رہے تھے۔ اور ایسی خوشگوار راحت کا لطف بے اندازہ حاصل کر رہے تھے۔

ایک آواز۔ خدا کرے کہ زمین میرے پاؤں کے نیچے کی دھس جائے جب تک میری مُراد نہ ملے۔ جسے سب لوگ میٹھا اور خوشگوار کہتے ہیں۔ یہ آواز گینڈل صاحب کی تھی

پھر یہی آواز رابرٹا کو پکارتی ہوئی سنائی دی۔ رابرٹا

رابرٹا۔ مجھے یقین ہے۔ کہ تمہیں میری جذبات کا احساس ضرور ہوا ہوگا۔ مجھے یقین ہے۔ تم سمجھ گئی ہوگی۔ کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میری دل و جان۔ میری مراد۔ میرے ارمان . . . . .

پاٹر صاحب اس عاشقانہ گفتگو کو چار و ناچار سن رہے تھے۔ حیران ہو کر یکایک پھڑ پھڑا اُٹھے۔ اس حرکت سے کشتی کا بانس جو کنارہ سے لگا کھڑا تھا۔ مشین گن کی طرح آواز کرتا ہُوا لڑکھڑا کر اندر آپڑا۔ چند منٹ سناٹے کا عالم ہوگیا۔ اس کے بعد گینڈل صاحب بولے۔ اس طرف کون ہے؟ -

پاٹر صاحب نے جواب نہ دیا۔ مگر چپ چاپ کشتی سے اُتر کر زمین پر آنا چاہتے تھے۔ کہ سطح زمین پر قدم رکھنے کی بجائے سرد پانی میں غڑپ سے داخل ہوگئے۔ گینڈل صاحب کی پھر آواز آئی۔ ادھر کون ہے؟ مگر پاٹر بیچارے نے اپنا نعرہ امداد بمشکل ضبط کیا۔ اور دوسرے کنارہ تک پہنچ کر زمین پر چڑھنے کی مکرر کوشش کی۔ اس جگہ پانی دس فٹ گہرا تھا پھر ناکام رہے۔ اور پانی میں غوطہ کھانے لگے۔

کلفورڈ گینڈل ـــــــــــ صاحب بڑے تیز فہم شخص تھے۔ پاٹر صاحب کے پانی میں گرنے کا دھما سُن کر اس طرف دوڑے کشتی میں جا کُودے۔ اور بتوار کو پوری طاقت سے دبا کر اس موقع کی طرف بڑھے۔ پاٹر صاحب نے "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" سمجھ کر کشتی کا بانس زور سے پکڑ کر ذرا دم لیا۔ اور مسٹر گینڈل اپنی پوری طاقت کشتی بانی میں صرف کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ صاحب موصوف بھی اپنے زور میں خود بخود قلابازی کھا کر پانی میں جا پہنچے۔ گھبراہٹ میں مسٹر پاٹر سے دست و گریبان ہوگئے۔ ایک نے دوسرے کا سہارا پکڑا۔ دونو غوطہ کھانے لگے۔

رابرٹا کو یہ تماشہ دیکھ کر بہت ہنسی آئی۔ اسے ایک تصویر یاد آگئی۔ جس میں دریائے ہگلی کے اندر دو مگرمچھ آپس میں لڑتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ ہنسی کو ضبط کر کے اس نے بتوار کو سنبھالا۔ اور غریق آب کی امداد کے لئے آگے بڑھی۔

رابرٹا نے کشتی کا بانس مسٹر گینڈل کے پیٹ پر رکھ کر زور سے دبایا۔ صاحب موصوف کا سانس رُکنے لگا ناچار پاٹر صاحب کو چھوڑ دیا۔ وہ تو پایاب پانی میں جا کھڑے ہوئے۔ اور باہر نکل کر گھر کا راستہ لیا۔ لیکن گینڈل صاحب بہت سا پانی پی گئے تھے۔ دیر تک اس کو نکالنے میں مصروف رہے۔ ذرا ہوش آیا۔ تو بولے یہ شخص ضرور

دیوانہ ہے۔ یہ اپنے آپ پانی میں گر پڑا ہوگا۔ میں نے کئی مرتبہ اس کی مجنونانہ حرکات اور بھی دیکھی ہیں۔ ایک دن الماری میں جا چھپے تھے۔ ان کی نگاہ سے فکر اور پریشانی نمایاں ہے۔

رابرٹا گینڈل صاحب کے حرکات جان کنی دیکھ دیکھ کر دل میں ہنس رہی تھی۔ یہ باتیں سن کر اسے خوب سوجھی۔ اور بولی "کیا آپ کو پاٹر صاحب کے حالات سے واقفیت نہیں"۔ ان کو تو خود کشی کا جنون ہے۔ اسی مضمون کی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔

کلفورڈ گینڈل نے اپنی انگلیاں بالوں میں ڈال کر سر خشک کیا۔ بولے اس کا تو کچھ انتظام کرنا چاہئے۔ رابرٹا نے جواب دیا۔ کہ آپ کیا کر سکتے ہیں۔ یہ بات کسی کو بھی معلوم نہیں اگر آپ ان سے ذکر کریں گے۔ تو وہ یہاں سے ناراض ہوکر چلے جاویں گے۔ پھر اماں جان خفا ہو جائیں گی۔ کیونکہ انہیں امریکہ میں اپنی کتابوں کی اشاعت منظور ہے۔

گینڈل۔ میں اس شخص پر پوری نگہبانی رکھوں گا۔

رابرٹا۔ ہاں اتنا تو ضرور چاہئے۔

مسٹر گینڈل۔ خوب تربتر ہو رہے تھے۔ سردی سے دانت بجنے لگے۔ تو گھر کا رخ کیا۔ رابرٹا بھی آہستہ آہستہ ان کے پیچھے چلی۔ اماں جان کو اپنے کمرہ کے برآمدہ میں کھڑا دیکھا۔ لیڈی وکھم گھبرائی ہوئی تھیں۔ بیٹی سے پوچھا۔

رابرٹا۔ آج یہ کیا اندھیر ہو رہا ہے۔ چند منٹ پہلے پاٹر صاحب تربتر میرے دروازہ کے سامنے سے گزرے۔ ابھی ابھی کلفورڈ گینڈل پانی میں بھیگے ہوئے گئے ہیں۔ یہ دونو کیا کر رہے تھے؟

رابرٹا۔ اماں فصیل پر آپس میں لڑ رہے تھے۔ پاٹر صاحب جان بچانے کی خاطر پانی میں کود پڑے۔ تو گینڈل صاحب بھی ان کے پیچھے دوڑ گئے۔ دونو پانی میں گتھم گتھا ہو گئے۔ دیر تک ہشت مشت ہوتی رہی۔ ضرور ان کا آپس میں کچھ جھگڑا ہے

لیڈی وکھم۔ کیا بات ہے۔ جو پھر دونوں جھگڑتے ہیں؟

رابرٹا۔ اماں جان۔ گینڈل صاحب کا مزاج تیز ہے۔ ذرا سی بات میں برہم ہو جاتے ہیں۔ ماں کو یقین نہ آیا۔ مگر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ اتنے میں پاٹر صاحب پھولدار چوغہ پہنے اندر سے نکل آئے۔

رابرٹا۔ خدا کا شکر ہے۔ آپ کی جان بچ گئی۔ اگر میں اس وقت نہ ہوتی۔ جب گینڈل صاحب آپ کو ڈبو رہے تھے۔ تو .....

پاٹر صاحب۔ گینڈل مجھ کو ڈبو رہے تھے؟

رابرٹا۔ کیا آپ کو معلوم نہیں۔ کیا کسی نے آپ کو آگاہ نہیں کیا۔ گینڈل صاحب کا کل خاندان دیوانہ ہے۔ پیڑیوں سے یہی حال چلا آتا ہے۔

پاٹر صاحب۔ یہ کیا بات ہے۔ کیا گینڈل صاحب "آدم کش" ہیں۔

رابرٹا۔ نہیں نہیں۔ لیکن وہ ذرا ذرا سی بات پر بہت بگڑ جاتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی جمائی لے۔ تو بہت ہی ناراض ہوتے ہیں۔ پاٹر صاحب آپ کمرہ کے دروازہ کو اچھی طرح بند کر لیا کریں۔ تب سویا کریں۔

پاٹر صاحب۔ یہ تو بڑی مصیبت ہے۔ وہ تو اسی دالان کی طرف سوتے ہیں۔ لیکن ایسا آدمی کھلا کیسے پھرتا ہے؟

رابرٹا۔ اس وقت تک ان کے ہاتھ سے کسی کا نقصان نہیں ہوا۔ بغیر کسی واردات کے سرکار ایک آزاد شخص کو کیوں بند کر سکتی ہے؟

پاٹر صاحب۔ کیا لیڈی وکھم کو یہ حال معلوم ہے۔

رابرٹا۔ خدا کے واسطے اماں جان سے ذکر نہ کیجئے گا۔ ان کو ہول آجائیگا۔

آپ ذرا اپنی حفاظت رکھیں۔ سب خدا کا فضل رہے گا۔ اکیلے نہ پھرا کریں۔ اس عرصہ میں "دیوانہ" گینڈل صاحب بھی اپنے کمرہ کے اندر پر پرزے سکھا کر اور نارنجی رنگ کا لباس شب خوابی زیب تن کئے گزشتہ واردات کے نکات پر اپنا قانونی دماغ صرف کر رہے تھے۔ شادی کی تحریک عنتر بود ہو جانے کا ملال تھا۔ زکام ہو جانے کا اندیشہ اور کیڑے مکوڑے پانی کے ساتھ پیٹ کے اندر داخل ہو جانے کا وہم کر رہے تھے۔ مالکان مطابع سے ان کو خاص دلچسپی نہ تھی۔ خود ان کی پولٹکل تصنیف کی صرف ۳۴ کاپیاں ان کے مطبع نے فروخت کی تھیں۔ باقی لاگت کا بوجھ گینڈل صاحب کے سر تھا۔ ایسی ہی توہمات میں گرفتار تھے۔ لیکن پاٹر صاحب کی جان کی حفاظت اپنا اخلاقی فرض تصور کئے ہوئے تھے۔ اتنے میں ان کی نگاہ فرش پر پڑی۔ تو ایک لفافہ نظر آیا۔ جو کھڑکی کی درز میں سے کمرہ میں پھینکا گیا تھا۔ کھول کر دیکھا۔ تو ذرا سا پرزہ نکلا۔ اس میں لکھا تھا۔ اُسترہ و آلات حجامت کا کیا انتظام ہو سکتا ہے"۔

گینڈل صاحب کو فوراً خیال آیا۔ کہ اُسترہ کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ دوڑ کر پاٹر صاحب کے دروازہ پر پہنچے اور آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی "کون ہے" گینڈل صاحب نے اپنا نام بتایا اور خدا کا شکر کیا۔ کہ پاٹر صاحب اب تک زندہ سلامت ہیں۔ اس کے بعد کچھ دیر تک کوئی جواب نہ ملا۔ مگر کسی بھاری چیز کے سرکانے کی آواز ضرور آئی۔ کئی دفعہ پاٹر صاحب کو پھر پکارا۔ مگر کوئی جواب نہ پایا۔ گھڑی دیکھی آدھی رات آگئی تھی۔ گینڈل صاحب نے سوچا۔ خیر اب جانے دو۔ دو بجے رات کے دیکھا جاوے گا۔ یہ کہہ کر اپنے کمرہ میں واپس گئے۔ اور بیٹھے جاگتے رہے۔

پاٹر صاحب نے جوں ہی پاؤں کی چاپ سے معلوم کر لیا۔ کہ مسٹر گینڈل واپس چلے۔ دو گولیاں مقوی نکال کر نوش کیں۔ بھاری صندوق سرکا کر دروازہ سے بھڑا دیا تھا اُسترا طلب کرنے سے اور بھی چوکنے ہو گئے تھے۔ سمجھے کہ آج خیر نہیں۔ رات مشکل سے نیند میسر ہو گی۔ چار و ناچار روشنی گل کر کے پلنگ پر دراز ہو گئے۔ اور اپنی دُعا پڑھنی شروع کی یہاں تک کہ نیند کے غلبہ نے مجبور کیا۔ اور آخیر آنکھ لگ گئی ادھر گینڈل صاحب کے کمرہ میں گھنٹہ نے دو بجائے صاحب موصوف جھٹ کمرہ سے نکل کر جھروکہ میں تشریف لائے۔ اور کھڑکی کے راستے سے پاٹر صاحب کے کمرہ میں داخل ہونا چاہا۔ وہاں شامت اعمال سے گھر کی ماما پانی کی بھری

صراحی نیچے رکھ گئی تھی۔ حضرت کا پاؤں صراحی پر لگا۔ سمجھے کہ فرش پر آگیا۔ پورا زور دے کر کھڑے ہونے لگے۔ تو صراحی الٹ گئی۔ اور صاحب بہادر چاروں خانے چت فرش پر نظر آئے۔ صراحی کا پانی بہ کر طوفان نوح کا نمونہ ہوگیا۔ دھماکے کی آواز سے پاٹر صاحب بھی جاگ اُٹھے۔ آنکھیں ملتے ملتے یہ تماشہ دیکھا۔ گھبرا کر بولے "کیا چاہیئے"۔ گینڈل صاحب نے جواب دیا۔ کہ "اُسترا مانگنے آیا ہوں" حجامت کا بکس سامنے میز پر دکھائی دیا۔ تو بولے "ایلو یہ موجود ہے"۔ اس کے پاس مسودہ کتاب "خودکشی کے محاسن" بھی رکھا ہوا نظر پڑا۔ غرض حجامت کا بکس لے کر اور پاٹر صاحب سے شب بخیر کہہ کر مسٹر گینڈل تر بتر اپنے کمرہ کو واپس چلے۔ پاٹر صاحب کے دل میں پھر وسوسہ پیدا ہوا۔ کبھی تو کہتے تھے۔ یہ شخص تو خاصا بھلا چنگا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی ان کی کھڑکی سے کودتے اُسترا مانگنے اور مسکرا کر شب بخیر کہنے کو مقدمہ دیوانگی پر محمول کرتے تھے۔ چند منٹ کھڑکی کے پاس کھڑے رہ کر ان کی واپسی کا نظارہ دیکھتے رہے۔ آخیر کھڑکی کو مضبوط بند کیا۔ اس کے آگے اور روک لگا دی۔ دو کرسیاں ایک الماری سامنے سرکا کر کھڑی کر دیں۔ اس طرح مزید اطمینان کے بعد پھر جا لیٹے۔ اور دوا خوانی میں مصروف ہوگئے۔ لیکن زبان یاری نہیں دیتی تھی۔ منہ سے کچھ کا کچھ نکل جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ پھر نیند آگئی۔ مگر اس مرتبہ خوف کے مارے روشنی گل نہیں کی۔

صبح کی دھوپ کھڑکی میں سے چھن کر پاٹر صاحب کے کمرہ میں بھر گئی۔ تب ان کی آنکھ کھلی۔ دل پر جبر کر کے بستر پر سے اُٹھے۔ ہوش حواس درست کر کے کھڑکی کھولی۔ دن خاصا چڑھ گیا تھا۔ کپڑے پہن کر ناشتہ کرنے چلے۔ یہاں ناشتہ کا یہ دستور تھا۔ کہ جب جی چاہے آکر کھا لو۔ کوئی مضائقہ نہیں میزبان کا انتظار کرنے کی احتیاج نہیں۔ رابرٹا وکھم کونے میں بیٹھی صبح کا اخبار پڑھ رہی تھی۔ مسکرا کر بولی۔ پاٹر صاحب آپ؟ امید ہے کہ شب کو آپ خوب سوئے۔

پاٹر صاحب۔ رات تو ایک عجیب واقعہ گزرا۔

رابرٹا۔ کیا آپ گینڈل صاحب کا ذکر تو نہیں کرتے؟ آخیر کیا ماجرا ہوا؟

پاٹر صاحب۔ جونہی میں سونے کو لیٹا۔ وہ دروازہ کھٹکھٹا کر مجھ سے اُسترا مانگنے آئے تھے۔ مگر میں نے نہیں دیا۔ بلکہ دروازہ پر صندوق کھسکا کر لگا دیا۔

اس کے بعد دو بجے رات کو پھر وہ کھڑکی میں کود کر اُسترا مانگنے آئے۔ اور خود ہی میز پر سے اٹھا کر چل دیئے۔ میری طرف بھیانک شکل سے دیکھتے رہے۔

رابرٹا۔ آپ کچھ چیز نوش فرماویں (تھوڑی دیر چپ رہ کر) مجھے اندیشہ ہے۔ کہ آپ کا یہاں سے چلا جانا ہی مناسب ہوگا۔ صاف ظاہر ہے کہ گینڈل صاحب آپ کی طرف سے بدظن ہوگئے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا۔ کہ بغیر کہے سُنے چپکے سے چلے جاویں۔ تاکہ انہیں یہ معلوم نہ ہو۔ کہ آپ کہاں گئے۔ پھر وہاں سے آپ امّاں جان کو خط میں خبر کر دیں۔ کہ آپ کی یکایک روانگی مسٹر گینڈل کی بدولت ہوئی۔ (پاٹر صاحب نے اِس

رائے سے اتفاق ظاہر کیا)

رابرٹا۔ مگر آپ خط میں گینڈل صاحب کے مجنونانہ خصلت کا ہرگز ذکر نہ کریں۔ دل چاہے تو اتنا لکھ دیجئے گا۔ کہ پہلے تو آپ کو خندق میں دھکا دے دیا۔ پھر رات کو دو بجے کمرہ میں گھس آئے۔ اور آپ کے چہرہ کو گھورنے لگے۔

پاٹر صاحب۔ "ہاں ہاں ٹھیک ٹھیک" رابرٹا۔ "خاموش"

اس وقت گینڈل صاحب بہادر بھی ناشتہ کے کمرہ میں تشریف لائے۔ رابرٹا سے دعا سلام ہونے کے بعد کھانے کی میز پر آبیٹھے۔ سامنے پاٹر صاحب کا مغموم اور اداس چہرہ نظر پڑا۔ گویا جان سے بیزار بیٹھے ہیں۔ گینڈل صاحب کا مزاج شریف خود ہی ٹھیک نہ تھا۔ شب بیداری نے اور بھی ہلکان کر دیا تھا۔ تاہم سنبھل کر بیٹھے۔ اور خوشمزاجی برتنے لگے۔

گینڈل۔ آج کا دن کیسا اچھا ہے۔

پاٹر۔ جی ہاں۔

گینڈل۔ ایسے موسم میں تو ہر شخص کو خوش و خورم اور زندگی سے شاد رہنا چاہیئے۔

پاٹر صاحب۔ (خاموشی سے) ہاں ہاں

گینڈل۔ ایسا کون ہوگا۔ جو اس خوشگوار موسم میں اپنی جان گنوانے کا قصد کرے۔

رابرٹا۔ اخبار میں لکھا ہے۔ جارج فلیٹ ساکن ۲۲ اکیڈیا سٹریٹ نے اپنی جان ضایع کر دی۔

گینڈل صاحب۔ (اس جواب سے خوش نہ ہوئے۔ مگر فرمایا) شاید کوئی خاص وجہ ہوگی۔

پاٹر صاحب (یکایک چوکنے ہو کر بولے) "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ خودکشی کو لوگ برا کیوں کہتے ہیں" یہ خیال ان کے دل میں "محاسن خودکشی" کے مطالعہ سے پیدا ہوا تھا۔ جس کے مصنف نے اپنی تمام قابلیت اس خیال کی تائید میں صرف کر دی تھی۔ اور اس کی وجوہات و دلایل پاٹر صاحب کے دل میں تازہ تھیں۔ پھر فرمایا۔

پاٹر صاحب۔ ایک دلچسپ کتاب کے مطالعہ سے جسے میں طبع کرنے والا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ موحدین کے سوا جملہ مذاہب خودکشی کو برا نہیں سمجھتے۔

گینڈل صاحب۔ پہلے تو ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ پھر قانونی بحث اور مذہبی خیالات اس کی تردید میں پیش کرتے رہے۔ اس سوال و جواب میں حضرت کی طبیعت کا شیرازہ بکھر گیا۔ کچھ شب کی تکان تھی۔ یکایک دیوانہ وار چیخ مار کر مکھن دانی پاٹر صاحب کے منہ پر کھینچ ماری۔

لیڈی وکھم بالاخانہ سے اتر آئیں آج ان کی طبیعت موسم کے خوشگوار ہونے سے بہت بحال تھی۔ دل میں آیا۔ کہ پاٹر صاحب کو الگ لے جا کر اپنی کتابوں کی اشاعت کا وعدہ حاصل کر لوں۔ شروع میں سب کتابوں کا بار نہیں ڈالوں گی ایک دو رسالہ شایع ہونے پر لوگوں کا شوق خود معلوم ہو جاوے گا۔ یہ سوچ کر وہ مسکراتی ہوئی صاحب مطبع کو رام کرنے کے لئے کھانے کے کمرہ میں تشریف لائیں۔ مگر یہ دیکھ کر متعجب

[illegible] کہاں گئے تھے۔ اُن کو کوئی [illegible] تھا

[illegible] جان [illegible] ہے

لیڈی وکھم۔ [illegible] کیا [illegible] کیا ہے۔

رابرٹا۔ مجھے خبر نہیں لیکن اب شاید ان کو ناشتہ کی ضرورت نہ ہوگی۔

لیڈی وکھم۔ وہ کہاں ہیں۔

رابرٹا۔ مجھے خبر نہیں۔ ابھی تو یہیں تھے۔

لیڈی وکھم۔ تو پھر کہاں چلے گئے۔

رابرٹا۔ وہ تو کھڑکی میں سے کُود گئے۔

لیڈی وکھم۔ (متفکر ہو کر) کیوں؟

رابرٹا۔ گینڈل صاحب دروازہ روک کر کھڑے تھے۔

لیڈی وکھم۔ آخیر کیا بات ہوئی۔

رابرٹا۔ اماں۔ مجھے تو معلوم نہیں۔ گینڈل صاحب بھی ان کے پیچھے کھڑکی میں سے کُود گئے۔ وہاں سڑک پر دوڑتے نظر آئے تھے۔ اماں جان مجھے تو یقین نہیں۔ کہ گینڈل صاحب مجھے راہ راست پر لا سکیں۔ وہ تو خود دیوانہ معلوم ہوتے ہیں۔

لیڈی وکھم۔ مجھے تو یہ بات ذرا سمجھ میں نہیں آتی۔

رابرٹا۔ پاٹر صاحب کہتے تھے۔ کہ مسٹر گینڈل دو نہجے رات کے کھڑکی میں سے کود کر ان کے کمرہ میں داخل ہوتے۔ اور ان کو گھورنے لگے۔ اور ابھی ابھی میرے سامنے نمکدانی اٹھا کر انہیں مارنے کو دوڑے۔ پاٹر صاحب جان بچا کر کھڑکی میں سے کود گئے۔ تو وہ بھی ان کے پیچھے کھڑکی میں سے کُود ے۔ پاٹر صاحب اس بد حواسی میں [illegible] لیکن ایسی بات ان کے لئے موزوں نہ تھی۔ [illegible] کہتے بھاگنا پڑا۔

لیڈی وکھم (کرسی پر بے رونق افسردہ ہو کر) کیا ایک ایک سب دیوانے ہو گئے ہیں۔ جاؤ پاٹر صاحب کو بلا لاؤ۔ میں ان سے پوچھوں گی۔

رابرٹا۔ میں تلاش تو کروں گی۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ وہ تو شاید ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے گئے۔

لیڈی وکھم۔ ہمیشہ کے لئے چلے گئے؟

رابرٹا۔ جی ہاں وہ مجھ سے کہتے تھے۔ کہ میں اب جانے والا ہوں۔ گینڈل صاحب مجھے بہت دق کرتے ہیں۔ یہ بات ناشتہ سے ذرا پہلے کہی تھی۔ اس لئے ان کا ارادہ مستقل ہی ہوگا۔

لیڈی وکھم۔ کے خستہ دل سے نامرادی کی آہ نکل پڑی۔

رابرٹا۔ اماں جان مجھے کچھ اور بھی کہنا ہے۔ رات کو گینڈل صاحب نے مجھ سے شادی کا تذکرہ شروع کیا تھا۔ مجھے جواب دینے کی نوبت نہ آئی۔ کہ وہ تو پاٹر صاحب کو غرق کرنے کے لئے خندق میں کود پڑے۔ ایسے آدمی سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔

لیڈی وکھم۔ میں تم کو منع کرتی ہوں۔ ہر گز اس شخص سے شادی مت کرنا۔

رابرٹا۔ اماں جان۔ بہت خوب۔ میں آپ کی تابعدار ہوں۔ اماں آپ کچھ کھائیں گی۔

لیڈی وکھم۔ کچھ نہیں۔

رابرٹا۔ کچھ تو کہیے۔ (پھر دروازہ تک جاکر واپس آئی۔ اور بولی)

اماں جان۔ آپ اگر مناسب سمجھیں۔ تو میں جاکر کلفورڈ گلینڈل صاحب کو تلاش کروں۔ اور ان سے کہہ دوں۔ کہ براہ مہربانی اپنا سامان جاکے گھر سے لے جائیں۔ یہ سب حالات دیکھ کر تو آپ ان کا یہاں رہنا گوارا نہیں کرسکتیں۔

لیڈی وکھم۔ کی آنکھوں میں سے آگ کے شعلے چمکنے لگے۔ فرمایا۔ ہاں ہاں۔ اس شخص سے کہدو۔ چلا جائے۔ اور پھر کبھی اپنی شکل مجھے نہ دکھائے۔

رابرٹا۔ بہت خوب اماں جان۔ میں ابھی ان کو رخصت کئے دیتی ہوں۔

فقط

دستۂ گل

سیفی کا خط اختر کے نام

اختر پیارے ——— تسلیم

"تسلیم"! یہ دوسرا سلام تمہاری بھاوج کی جانب سے ہے۔ اس وقت رات ہے۔ اور — نہایت پیاری چھٹکی ہوئی چاندنی، خوش نما تارے، ستھری چادر" کہاں؛ میرے پلنگ پر۔

ادھر تکیہ ——— اُدھر. . . . . بیٹھی چھالیا کتر رہی ہیں

سروتے کی آواز ——— چوڑیوں کی جھنکار اُف، مزا، اختر لینا مجھے

یہ صوتِ سرمدی، یہ جنت کے تمام نغموں سے شیریں نغمہ ——— کیا تم سُن سکتے ہو؛ نہیں، کبھی نہیں، اختر، ہوش کی دوا کرو۔ ارے تم! ارے تم!! یہ منہ، اور مسور کی دال۔ اپنے کان درست کرو اور ان کے ہونٹ۔ منہ پر منہ، اللہ اکبر۔ ایسا ولگداز تخیل۔ اچھا یہ تو تھیں پیار کی باتیں۔

اب سنو۔ دال آٹے کا بھاؤ۔ بھیا! پیٹ کی فکر تو ہے نہیں۔ گھر بھر سے اچھی روٹی اور پرہیز کا نفیس سالن دونوں وقت مل جاتا ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ نہ جانے کیسا اور کس کا؟ پھر بھی شغل خوب ہے۔ مگر یار وہ بات نہیں۔ پان پتے کا خرچ اور تمہاری . . . . . کی نازبرداری ——— بہرحال اس کے لئے ہاتھ پاؤں ضرور ہلانے پڑیں گے۔ سو یہ کام تمہارے سپرد ہے! کیا سمجھے! گویا یہ بھی تمہارے سر ایک احسان عظیم ہے۔ آہاہاہاہ عشق نے . . . نکما کر دیا۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔

لو پھر، دوستی کا حق ادا کرو۔

سیفی وارفتہ

گلدان

از جناب حکیم مقرب حسین مقرب دہلوی رکن عملہ ہمدرد (دہلی)

سرخ خطرہ۔ اگر آپ کا تخیلِ آوارہ جنس لطیف کے کسی ایسے فرد کی تلاش میں کامیاب ہو جائے۔ جو کائنات کی ہر شے سے زیادہ جمیل ہو حسین ہو۔ جس کا تبسم زیر لب طاقت صد سالہ کو لمحہ بھر میں چھین لے۔ جس کی چشم نرگسی میں کیف بادہ سے کچھ زیادہ کیف ہو۔ جس طرف دیکھ لے۔ صفیں کی صفیں جھومنے لگیں۔ جس کی چتون چھریاں ہوں جس کی پلکیں خدنگ ہوں۔ جس کا عتاب موت کا پیغام ہو جس کا کرم حیات ثانیہ کی تفسیر ہو۔ جس کے گیسو کالی رات کی طرح تاریک ہوں۔ جس کا چہرہ صبح صادق کی طرح روشن ہو۔ اور رخساروں کی شادابی پھولوں کو شرمائے اگر ایسی کوئی ہستی مل جائے۔ تو اُسے گلستان تک لے چلئے۔ اور تختہ گلاب کی سیر کرائیے۔ وہ گلاب جس کی شعرائے عرب نے قصیدہ خوانی کی ہے۔ اور جس کو دنیا کا بہترین پھول تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کا ایک پھول توڑ لائیے۔ پھر اس کا ایک ایک ورق علیحدہ کیجئے۔ اور غور سے دیکھئے۔ کہ ان اوراق میں باریک باریک سرخی مایل تحریر سی پڑی ہوگی۔ جس کی نزاکت اور دلآویزی سے بیتاب ہو کر ایک شاعر کہتا ہے۔ ع سرخ پھولوں کی رگیں ہیں کہ لہو کی دھاریں پھر اُس اعجوبہ زا ہستی کو جس کا نقشہ تخیل کھینچ چکا ہے۔ ایک پان کا بیڑا کھلا دیجئے۔ اور پھر دیکھئے۔ کہ پان کی سُرخی گلے سے پھوٹ کر یہ اعجاز دکھاتی ہے۔ کہ موتیوں کا کنٹھا جو زیب گلو ہے۔ اُس کے سفید آبدار موتی گلے کی سُرخی سے جو پان کھانے سے پیدا ہوئی ہے گلگوں معلوم ہوتے ہیں۔ اور دیکھنے والے ان موتیوں کو مونگا سمجھتے ہیں۔ ایسی ہستی بے شک انقلاب عظیمہ کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس کے چشم و ابرو کے معمولی اشارے پر جانیں قربان کی جاسکتی ہیں۔ سامری کے گئو سالا کی پرستش بھی کیا تھی جو اس کی پُوجا ہو۔ پس وہ سرخ خطرہ جس سے بالشویک مراد ہیں۔ اور جس سے یورپین اخبارات کو ہمیشہ ڈر لگا رہتا ہے۔ اتنا زیادہ خطرناک نہیں۔ جتنی ایک پان خوردہ جمیل اور حسین عورت

قل أعوذیئے۔ باصطلاح عوام مُلّا یا مؤذن کو کہتے ہیں ان میں سے بعض بالکل ناخواندہ ہوتے ہیں۔ اور بعض نیم مولوی۔ فقہ کے اکثر مسایل ضروریہ از بر یاد ہوتے ہیں۔ حافظ قرآن نہیں ہوتے۔ مگر چند صورتیں ضرور حفظ کر لیتے ہیں۔ فن قرأت سے قطعی ناواقف۔ مگر مُنہ بنا بنا کر کے کی آواز کے مشابہ چند آیات کی تلاوت ضرور کر لیتے ہیں۔ دعوت کے بے حد شایق ہوتے

ہیں یا بالفاظ دیگر کھانے پر جان دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں مزاح یا ظرافت نام کو بھی نہیں ہوتی۔ لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا۔ کہ جب بسبیل دعوت ایک قل آعوذی مرغے۔ الالذیذ کھانے سے فارغ ہوئے۔ تو ایک صاحب نے دریافت کیا۔ کہ قبلہ یہ تو فرمائیے قرآن شریف میں کونسی آیت آپ کو زیادہ پسند ہے۔ آپ نے فوراً جواب دیا مالکم لا تاکلون۔ یعنی کیا ہوا تم کو جو نہیں کھاتے ہو۔ یہ سن کر حاضرین میں سے اکثر مسکرائے۔ کہ واہ! کیا موقع کی آیت پسند خاطر ہے۔ پھر انہیں صاحب نے دریافت کیا۔ کہ وہ کونسا امر الٰہی ہے۔ جو آپ کو مرغوب ہے تو بے ساختہ فرمانے لگے کلو واشربو یعنی کھاؤ تم اور پیو تم۔ اب لوگ ہنسی کو ضبط نہ کرسکے۔ اور ایک فرمایشی قہقہہ پڑا۔ مگر کیا مجال کہ مولانا کی چتون پر میل بھی آیا ہو۔ متکلم بھی کوئی بڑی چلبلی طبیعت کا تھا۔ اس نے پھر پوچھا۔ کہ حضرت وہ کونسی دعا قرآن مجید کی ہے۔ جو ہمیشہ آپ کے ورد زبان رہتی ہے۔ آپ نے برجستہ فرمایا ربنا انزل علینا مائدۃ من السما۔ یعنی اے رب نازل کر ہم پر خوان طعام آسمان سے۔ یہ ایک ہی مضمون کا مختلف سوالوں میں جواب ظرافت کا بین ثبوت ہے۔

کوڑی کے بٹن۔ مکرمی کاری عباس حسین صاحب ایڈیٹر "قوم" "تمدن" و سب ایڈیٹر "کانگریس" "فتح" "جمہور" "مدد" "ہمدم" وغیرہ وغیرہ کی تکرار میں نے اس درجہ سے کی ہے۔ کہ ان کے علاوہ اور بھی اخبارات ہیں۔ جن کی کبھی باگ ادارت آپ کے ہاتھ میں تھی۔ مگر بدقسمتی سے مجھے ان کے نام یاد نہیں رہے۔ عام طور سے لوگوں کو معلوم ہے کہ قاری صاحب عملاً گاڑھے اور کھدر کی تحریک سے دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اگرچہ اس راہ میں بہت سے قوم پرست دو چار ہی قدم چل کر رہ گئے۔ مگر آپ نے قومی لباس کو حرز جان بنائے رکھا ہے۔ اور ایک منٹ کے لئے بھی ترک نہیں کیا۔ اتفاق سے ۲ اپریل ۱۹۴۷ء کی سہ پہر کو قاری صاحب موصوف سے راہ میں ملاقات ہوگئی۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ جناب نے کھدر کی شیروانی میں کوڑیوں کے بٹن لگائے ہیں۔ بے ساختہ اس جدّت کی داد دینی پڑی۔ کوڑیوں کی قسمیں میرے حافظے میں محفوظ نہیں ہیں۔ اس لئے نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ کوڑیاں جن کے بٹن بنائے گئے تھے لیا تھیں یا جھنجی۔ لگہ تھیں یا لٹو۔ بہرحال ان کوڑیوں کی خوشنمائی دیر تک جاذب نظر رہی۔ اور میں نے کہا۔ آج کوڑیاں عنقا ہوکر کس عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ جہاں پہلے ایک پیسہ کے ۲۰ گنڈے ملتے تھے۔ وہاں آج ایک پیسہ کا ایک گنڈا بھی مشکل سے ملتا ہے۔ مثل مشہور ہے بارہ برس میں کوڑی کے بھی دن پھر جاتے ہیں۔ آخر کوڑی کی بے وقعتی عزت سے تبدیل ہوگئی۔ کہ قاری صاحب جو ایک معزز شہری ہونے کے علاوہ قوم و ملک کی خدمت کے باعث دور دور تک مشہور ہیں۔

آج کوڑیوں کے بٹن زیب سینہ کئے ہوئے ہیں۔ گاڑھا بھی کوڑی کی طرح ٹھنکارا ہوا تھا۔ کوئی مونہہ نہ لگاتا تھا۔ نہ معلوم تھا کہ گاندھی کو گاڑھے کی کیا ادا بھائی۔ کہ گاندھی اور گاڑھا لازم و ملزوم ہوگئے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گاڑھے اور گاندھی میں حرف گ کی شرکت ہے۔ پھر حرف ھ کی مزید وحدت نے دونو کا رشتہ قوی تر کر دیا ہے۔ پس گاڑھے کا پرچار گاندھی جی کا نصب العین کیونکر نہ ہوتا۔ آج اس پرچار کی بدولت بڑے بڑے دولتمند۔ ہیٹ پتلون پہننے والے اسمبلی کے اکثر ممبران حتیٰ کہ صدر کونسل مسٹر ڈی۔ جی۔ پٹیل کھدر کا لباس پہنتے ہیں۔ گاڑھے کا نصیبہ جاگا۔ تو کوڑی کے بھی بھاگ کھلے اب کھدر پوش نوجوان قاری صاحب کی طرح کوڑی کے بٹن لگائیں گے۔ اور اس طرح پیسوں کا کام کوڑیوں سے لیں گے۔

حجاز کے اونٹوں کو ہندوستان میں ہجرت کر لینی چاہئیے

حجاز کے ریگستان میں جناب اونٹ شریف حسین کی طرح بے مُہار پھرا کرتے تھے۔ اور کوس لمن الملک الیوم بجایا کرتے تھے۔ آپ کو ناز تھا۔ کہ حج میرے ہی دم سے ہوتا ہے۔ کہیں آپ کے کان میں یہ بھنک بھی پڑ گئی کہ آفریدۂ عالم نے میری شان میں فرمایا ہے۔ **اَفَلَا ینظرون الی الابل کیف خُلقت** :۔ آپ جانتے ہیں کہ وہاں تو غرور اور تکبر پسند ہی نہیں آتا۔ چشم زدن میں معلم الملکوت کو راندۂ درگاہ بنا دیا تھا۔ اونٹ بیچارے کس گنتی میں ہیں۔ ابن سعود نے حجاز پر قبضہ جما کر ریگستان کی حکومت اونٹوں سے چھین کر موٹروں کے سپرد کر دی۔ اور جناب اونٹ علیہ و ما علیہ عضو معطل ہو کر رہ گئے۔ سنا ہے آج کل آپ بہت مغموم رہتے ہیں۔ ہماری رائے میں انہیں ہندوستان آ جانا چاہئیے جہاں تمدن جدید نے رجعت قہقری اختیار کر رکھی ہے مولینا حسرت موہانی کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسہ کیا جائے۔ اور انگریزی ریلوں کے بائیکاٹ کا رزولیوشن پاس کر کے ان اونٹوں سے سفری کام لیا جائے۔

کلام جگر

از حضرت جگر مرادآبادی

صدمۂ انتظار را چہ کنم — چہ کنم جان زار را چہ کنم
یار در باغ و من بصحرا مست — دلِ وحشت شعار را چہ کنم
کردم از روزگار قطع نظر — کششِ روزگار را چہ کنم
ہجر دشوار و وصل آساں تر — لیک آئینِ یار را چہ کنم
ضبط چیزے ست ناصحا لیکن — دردِ ہمت شکار را چہ کنم
توبہ کردم زمے پرستی لیک — ابر و بادِ بہار را چہ کنم
ترکِ یاری ویار آسان ست — مشکل امیت یار را چہ کنم
او بخواب است و فتنہ ہا بیدار — حسرتِ بیقرار را چہ کنم
آن گل و آن بہار مارا بس — این گل و این بہار را چہ کنم

موجِ خون از سرم گذشت جگر
من لبِ جوئبار را چہ کنم

ہماری بھنگن } ایک دلچسپ مکالمہ — از جناب "دکی" صاحب

اے آگ لگے اس چھاؤنی کو۔ ایسا شہر تو آج تک نہیں دیکھا۔ مکان ہے۔ کہ سنڈاس خانہ۔ بدبو کے مارے دماغ پھٹا جاتا ہے۔ میاں آپ کو اس سے کیا۔ کوئی مرے کوئی جئے۔ صبح گئے اور شام گھر آئے۔ پھر بھی باہر جا بیٹھے یہ نہیں ہوتا۔ کہ اس نگوڑ ماری مہترانی کو نکال کے کوئی اور ہی رکھ لی جائے۔ موئی کو آج پورے چار دن ہو گئے۔ آئی ہی نہیں۔ لوگو اس ملک کی کیا ریت ہے۔ کم بخت کمیٹی والے بھی کچھ نہیں کہتے۔ اعجاز دیکھتے ہو اپنے ابا کو سنتے ہیں۔ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ یہی حال ہے تو مبارک ہو آپ کو نوکری میں تو اس گھر کو آگ لگا کر نکل جاؤں گی۔ یا اللہ یہ کیسی مصیبت ہے ؟

آج یہ عید کا چاند کہاں سے نکل آیا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ یہ تو بی مہترانی آرہی ہیں۔ اللہ رکھے ایسی جفاکش ہیں۔ کہ دن میں چھ چھ پھیرے کرتی ہیں۔ مکان کیا بقعہ نور بنا ہوا ہے۔ مجال کیا جو کہیں ایک تنکا تک نظر آئے۔ ٹٹی کی صفائی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسی کا رہایشی مکان ہے۔ بی ذری فنائل کم چھڑکا کرو۔ آئے ہائے تمہیں اللہ سمجھے۔ آج بھی کیوں آئیں۔ بتاؤ کہ تنخواہ نہیں ملتی۔ ہم تو کپڑے بھی دیتے ہیں۔ روٹی تک کھلاتے ہیں۔ اس پر تمہاری یہ حالت۔ بتاؤ میرا صبر پڑیگا یا نہیں۔ ناک میں دم آگیا۔ ایسی حرامخوری اچھی نہیں۔

بیوی ذرا ٹھیرو۔ بات تو سنو۔ زبان ہے۔ کہ رکتی ہی نہیں۔ سلام لیا نہ مجرا اور ایسی پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑی ہیں۔ کہ توبہ ہی بھلی۔ لو پہلے آداب عرض کرتی ہوں۔ مجھے ایک گلوری تو کھلاؤ۔ تھوک دو غصہ کو۔ جانے دو ناراضگی۔ بیوی خدا کا شکر کرو۔ اگر اللہ آپ کو بھنگیوں کے گھر پیدا کر دیتا۔ تو کیا کرتیں۔ سوچو اور انصاف کرو۔ پاخانہ اٹھاتے ہیں۔ جس سے تمام جہان نفرت کرتا ہے۔ تمہیں یہ کام کرنا پڑے۔ تو خدا کی خدائی نظر آجائے۔ دکھ اور بیماری ہمارے بھی ساتھ ہیں۔ یہ تھوڑا ہی ہے۔ کہ جان کے نہیں آئی۔ چار دن سے نزلہ اور زکام کی شکایت ہے۔ سر پھٹا جاتا ہے۔ پھر بھی اس حالوں آموجود ہوئی تمہیں۔ نہیں معلوم کہ زمانہ ترقی کر رہا ہے۔ پہلے تو مسلمان ہی ایسے تھے۔ کہ ہمیں کلمہ پڑھا کر مسلمان بناتے تھے۔ آج تو عیسائی بھی میم بنالینے کو تیار ہیں۔ اور ان بیچارے عیسائیوں پر ہی کیا موقوف سارے سارے دن ہندو پھرتے ہیں۔ اپنی برادری بڑھانے کی فکر بیچاروں کو بیٹھنے نہیں دیتی۔ بہت ناراض ہوگی ہم آریہ ہو جائینگے۔

بی بی سچ کہتی ہو۔ جبھی تو دماغ عرش معلےٰ پر ہیں۔ آج جو آریہ بنتی ہو۔ تو پچھلے جنم میں گناہ ہی کیوں کئے تھے۔ کہ بھنگیوں کے گھر جنم لیا۔ خدا کی خدائی میں دخل۔ بھلا اگر آریہ ہوگئیں۔ تو اُن گناہوں کا کفارہ کیسے کروگی۔ جو پچھلے جنم میں کئے تھے۔ ایسی ہی بڑی وہ تھیں۔ تو پُن کئے ہوتے۔ یہ یاد رکھو۔ کہ اگر اب کانچلی بدلی۔ تو اگلے جنم میں بلی بنوگی۔ اچھا چھوڑو ان قصوں کو دیکھنا ذری خوب صفائی کرنا۔ پاخانہ الگ سڑ رہا ہے۔ گھر علیحدہ کوڑا کرکٹ سے بھرا پڑا ہے۔ تم ہی سوچو کتنی تکلیف ہے۔ روز آؤ نہ تمہیں تکلیف نہ ہمیں دقت

ارے او خانم کم بخت کہاں چلی گئی۔ کیا کروں۔ میری تو جان آفت میں ہے۔ مجال ہے جو یہ مُردار ذرا کسی طرف دھیان کرے۔ صفیہ روئی اور میں اُسے دیکھنے اندر اٹھی۔ بس مہترانی صاحبہ غائب۔ اس مونڈا کاٹی نے ذرا نہ روکا۔ سارے کا سارا گھر ویسے ہی پڑا ہے۔ ارے کہاں گئی مُردار!!

بیوی آئی۔ ہانڈی دیکھ رہی تھی۔ آپ نے تو غدر مچا دیا۔ کم بخت۔ نامُراد۔ مُردار جہنم جلی۔ بچوں پیٹی۔ نہ معلوم کیا کیا خطاب ہیں۔ جو مجھے روز عطا ہوتے ہیں۔ بیوی نوکری کی ہے۔ ذات نہیں بیچی۔ ایک دن ہو۔ دو دن ہوں۔ روز یہی قصہ۔ یہی جھگڑا۔ اللہ نوکری دے۔ تو کسی شریف کی۔ بیوی میں باز آئی۔ بھاڑ میں جائے یہ نوکری اور چولہے میں جائے یہ کام۔ اپنی چیز بست سنبھالو۔ گھر کو دیکھو۔ بندی رخصت۔ اُس بھنگن پر کوئی زور نہیں چلتا۔ جو چار چار چھ چھ روز بعد آتی ہے۔ اور آتے ہی گلوری طلب کرتی ہے۔ پان کھایہ جا وہ جا۔ بیوی تمہیں تو اس کا سلیقہ ہی نہیں۔ کہ نوکر کیسے رکھے جاتے ہیں۔ میں تو اب تک بھی میاں کے مُنہ کو رہی۔ جو بے چارے بھلے مانس ہیں۔

خانم سچ کہتی ہو۔ یہ سب کچھ میاں ہی کا بگاڑ ہے۔ جنہوں نے تمہیں سب کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ غیر سے سرکار کے نوکر اور پھر ایسی بھیگی بلی کہ چوہوں سے کان کٹائیں۔ کتنا ہی قصور ہو۔ اور کیسا ہی گناہ مجال ہے۔ جو تمہیں یا مہترانی کو کچھ کہیں تو زمانے میں کہیں ایسے بھی مرد ہوتے ہیں۔ کوئی کچھ کرے اور کچھ کہے۔ انہیں کسی سے مطلب نہ کسی سے واسطہ۔ کیا کہوں اللہ میاں کی عقل کو۔ جنہوں نے مجھے عورت اور انہیں مرد بنایا۔ مرد ہوتی۔ تو دکھاتی۔ کہ یہ موئے کمیٹی والے کیسے انتظام نہیں کرتے۔ اور مہترانی کیسے غیر حاضر رہتی۔ یوں تو اللہ کے فضل سے میں بھی لکھی پڑھی ہوں۔ لیکن شریفوں کی بہو بیٹیاں کسی کو لکھا نہیں کرتیں۔ ورنہ روز ایک شکایت کی عرضی لکھتی۔ پھر دیکھتی۔ کہ انتظام ہوتا ہے۔ یا نہیں۔ خانم تمہیں کیا کہوں۔ جاتی ہو۔ تو میاں سے کہہ کر جانا۔ جنہوں نے تمہیں رکھا ہے۔

بیوی یہ کیا قصہ ہے۔ کیسا جھگڑا ہے۔ میں نصیبوں

بھی باہر تھی پھنکنے گئی تھی کہ تم نے سر پر آسمان اٹھا لیا۔ گھنٹہ بھر سے جو دروازہ میں کھڑی سنتی ہوں یہ ہی دل ہے ایسی تنگ مزاجی کس کام کی کہ بات بات پر بگڑتی ہو۔ بات کا بتنگڑ بنالیتی ہو۔ سچ کہتی ہوں جو میں نے چھوڑ دیا تو اور کوئی بھنگن نہیں ٹکنے کی۔ مجھے تو میاں کا خیال ہے۔ جو بیچارے کبھی کچھ کہتے ہی نہیں۔ غیر حاضری ہو بھی جائے۔ تو تنخواہ نہیں کاٹتے۔

اچھا بی مہترانی تم جاؤ تمہارا کام ہیں تو اس گھر کو آگ لگائے چلی جاؤں گی۔ آج آنے دو میاں کو وہ جانیں اور ان کا گھر میرے سر کیا مصیبت پڑی ہے۔ جو یہاں ٹھہروں اعجاز نا عجاز اوڑھ تو بیٹا۔ ایک تانگہ تو لا۔ میاں کا انتظار بھی کرے میری بیزار لو میں ابھی جاتی ہوں۔ یا اللہ گھر کی مالک میں تو نہ ہوئی۔ بس یہ خانم اور مہترانی ہی ہوئیں۔

میں دفتر سے آیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ نہ بیوی ہیں نہ بچے۔ خانم منہ پھلائے بیٹھی ہے گھر کی چیزیں تر بتر پڑی ہیں۔ حیران یا اللہ یہ کیا ہوا۔ خانم نے سارا قصہ سنایا کہ بیوی تو اپنے میکے سدھاریں۔ میاں آپ ہیں جوان اور میں بھی بوڑھی نہیں۔ مردانے گھر میں۔ روٹی پکانے نہیں آسکتی۔ اپنی چیز بست دیکھ بھال لو۔ میرا سلام ہے۔ تین دن ہو گئے۔ خانم نہیں آئی۔ کوئی ملازم باوجود تلاش نہیں ملا۔ بازار سے کھاتا نہیں۔ خود اپنا منہ جھلستا ہوں اور روٹی پکا کر کھاتا ہوں۔ مہترانی کی صفائی نے گھر ہی کا صفایا کر دیا۔ بیوی اب چاہے آویں یا نہ آویں۔ لینے تو میں بھی نہیں جاتا۔

بر سر اولاد آدم ہر چہ آمد بگذرد

"کمی"

عید

(از جناب شیخ عبداللطیف صاحب تپش بی۔اے۔ آنرز۔)

عید آگئی وہ جوشِ طرب کو شش نہیں کیا ہو کہ دلِ غم زدہ کو ہوش نہیں
کیوں کر نہ بھروں میں سرد آہیں اے تپش میری طرح خالی کوئی آغوش نہیں

اک طلسمِ وفا ہے رازِ عید ہے حقیقت نما مجازِ عید
ہو گئے محوِ ماتم خاموش! نغمہائے شکست سازِ عید
حسرتِ سجدۂ تعلق نے کر دیا سر کو بے نیازِ عید
کس کو کرتے ہیں آج وہ پامال کون ہوتا ہے سرفرازِ عید
قصۂ عمر ہو گیا کوتاہ! ہائے افسانۂ درازِ عید
میں رہوں کس ہوا میں بتلا دے اے بہارِ چمن طرازِ عید

غمِ ہستی سے ہے ہم آغوشی
اے تپش دیکھ امتیازِ عید

عید کی خوشیاں مبارک عید والوں کے لئے
رو دیئے ہم ہنسنے والوں پر نگاہیں ڈال کر
انتہائے حسرتِ آغوشِ خالی دیکھئے!
رہ گئے اپنے گلے میں آپ باہیں ڈال کر

اثرِ حُسن

افسانہ

از جناب اعظم کریوی

راجندر گو کالج میں پڑھتا تھا۔ لیکن اس کو بدیسی زبان سے نفرت تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں انگریزی زبان سیکھنے میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ کہ انگریزی زبان نے ہی ملک کو تباہ کیا ہے۔ لیکن اس کی مخالفت فضول تھی اس کے اعزا اس کو انگریزی کے سوا اور کسی زبان کی تعلیم دلانا پسند ہی نہ کرتے تھے۔ اس وجہ سے راجندر مجبوراً انگریزی پڑھتا تھا۔

راجندر کلکتہ کے ایک آرام دہ بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا۔ پوجا کی چھٹیوں میں راجندر نے کلکتہ سے کچھ چیزیں خریدیں اور اپنے گاؤں میں جو کلکتہ سے تھوڑی ہی دور بستا چلا گیا۔ راجندر کا معمول تھا کہ وہ چھٹیوں میں اپنی بیوہ ماں کی خدمت میں رہتا تھا۔

راجندر کے والد کا انتقال ہوچکا تھا گھر پر اسکی ماں ہی زمینداری کا انتظام کرتی تھی۔ لیکن راجندر کو اس سے کچھ سروکار نہ تھا۔ ماں نے بہت چاہا کہ راجندر کی جواب جوان ہوچکا تھا شادی کردے۔ لیکن وہ راضی ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ شادی بیاہ سے دور بھاگتا تھا اس کا ذاتی خیال تھا کہ آج کل عورتیں جھوٹی محبت کے سوا سچی اور پاک محبت سے ناآشنا ہیں۔ آج کل کی عورتیں فیشن کی شیدائی۔ یورپین لباس کی دلدادہ اور مردوں کی برابری کرنے کی دعویدار ہوتی ہیں۔ کالج میں جب کبھی اس موضوع پر گفتگو ہوتی تو راجندر یہی کہتا کہ اگر میں بیاہ کروں گا تو ایسی عورت سے جو بڑی کالی اور بدصورت ہوگی۔ خوبصورت عورتوں کو اپنے حُسن پر ناز ہوتا ہے وہ اپنے ساس سُسر کی خدمت نہیں کرتیں اور نہ اپنے شوہر ہی کی پرواہ کرتی ہیں ان کو تو ہر وقت ہر گھڑی یہی سوچ یہی فکر رہتا ہے کہ دوسرے مردوں کے دل کو کس طرح اپنے بس میں کرلیں ان کے لئے ولایتی صابن۔ سنٹ اور پاوڈر چاہیئے۔ پارسی ساری اور اونچی ایڑی کا جوتا چاہیئے ان سب نزاکات کے لئے بیچارہ شوہر کہاں سے روپیہ لائے جس طرح سے خوبصورت ناگ بہت زہریلا ہوتا ہے۔ اسی طرح سے حسین اور قبول صورت عورت مردوں کے لئے زہر قاتل ہے۔ اس کے علاوہ میں تعلیم یافتہ لڑکی کے ساتھ بھی بیاہ نہ کروں گا۔ پڑھی لکھی لڑکیاں اپنے برابر کسی کو سمجھتی ہی نہیں ہیں۔ وہ دن رات ناول ہی پڑھا کرتی ہیں۔ روز نئے نئے اور خوبصورت خط لکھنے کے کاغذ اور پھول دار لفافے منگائے جاتے ہیں اگر کوئی پوچھے کہ کن کو خطوط لکھے جاتے ہیں۔ تو بڑی ڈھٹائی سے جواب دیں گی "اپنی سہیلیوں کو اور کن کو" خط وکتابت کے آگے ان کو گھر کے کام کاج کے لئے فرصت ہی نہیں

ملتی۔ دن بھر تاش کھیلا کرتی ہیں اور کسی نے کچھ اعتراض کیا تو پھر آفت ہی آجاتی ہے۔ ملٹن اور شکسپیر کے آگے وہ فطرت نگار تلسی اور قادرالکلام کیشو کی کوئی حقیقت ہی نہیں سمجھتیں اگر بدقسمتی سے دو چار بچے پیدا ہوگئے تو وہ ادھر سے ادھر روتے پھرتے ہیں۔ ہارمونیم کی سُریلی صداؤں سے وہ اتنی ازخود رفتہ ہوجاتی ہیں۔ کہ ان کو اپنے بچوں کے کھلانے پلانے کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ میں ایسی لڑکیوں سے شادی کرکے اپنی زندگی تباہ نہیں کرسکتا،،

راجندر کی باتوں پر لڑکے خوب ہنستے اور اس کا مذاق اڑاتے۔ کالج میں سب انہیں خبطی۔ جنونی اور خدا جانے کیا کیا کہتے لیکن راجندر کو اس کی کچھ پرواہ نہ تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے خیالات کا اظہار آزادی سے کرتا جس پر بسا اوقات ان کے احباب کہتے۔ اچھا بابو وقت آنے دو تو دیکھیں گے کہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر کہاں تک عمل کرتے ہو۔ ایسی باتیں بہت سُنی ہیں۔ لیکن کسی کو اس پر عمل کرتے نہیں دیکھا۔ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے" پوجا کی چھٹی ختم ہونے میں ایک دن باقی تھا۔ راجندر کی ماں گنگا اشنان کرنے گئی۔ گھاٹ گاؤں سے تھوڑی دور پر تھا۔ وہاں پہنچ کر راجندر کی ماں سے اپندر بابو کی بیوی سے جو اس کی لڑکپن کی سہیلی تھی ملاقات ہوئی۔ پہلے تو ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر اپندر بابو کی بیوی نے اپنی لڑکی کا پیغام دیا۔

ماں۔ بہن میری بھی خواہش ہے۔ لیکن کیا کروں۔ مجبور ہوں۔ راجندر شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔ کئی مرتبہ اس کی نسبت ہوئی اور مجھے راجندر کی ضد سے شرمندگی اٹھانی پڑی۔

اپندر بابو کی بیوی۔ اچھا ایک دفعہ اور کوشش کرو راجندر اب جوان ہے اگر اس کی شادی ہوگئی تو تمہارے دن بڑے سُکھ میں کٹیں گے۔

ماں۔ میں ضرور کوشش کروں گی۔ اگر راجندر مان گیا۔ تو بیاہ پھاگن میں ہوگا۔

اپندر کی بیوی۔ آخر شادی نہ کرنے کی راجندر کیا وجہ بتاتا ہے۔

ماں۔ اے بہن یہ نہ پوچھو کہتے بھی ہنسی آتی ہے۔

اپندر کی بیوی۔ نہیں نہیں اس میں ہنسنے کی کون بات۔ ذرا میں بھی تو سُنوں آخر وہ کہتا کیا ہے۔

ماں۔ وہ کہتا ہے کہ میں تعلیم یافتہ اور حسین لڑکی سے شادی نہ کروں گا۔

اپندر کی بیوی۔ یہ تو عجیب بات ہے آج کل کے لڑکے تو حسین اور تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے مرے جاتے ہیں تمہارا راجندر خدا جانے کس مزاج کا ہے۔ تو کیا اس کا مطلب ہے کہ وہ غیر تعلیمیافتہ اور کالی کلوٹی لڑکی سے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔

ماں۔ ہاں۔

اپندر بابو کی بیوی نے کچھ دیر سوچا اور کہا۔ اچھا بہن ایک کام کرو۔ راجندر سے ابھی جاکر کہہ دو کہ اس کے حسب مرضی ایک لڑکی مل گئی ہے۔ اور اس کو کل

علی الصباح میرے مکان پر بھیج دینا میں سب انتظام کر لوں گی۔

راجندر کی ماں نے سوچا "شاید اپندر بابو کی بیوی اپنی خوبصورت اور تعلیم یافتہ لڑکی پلنا کو دکھائے گی۔ راجندر پلنا کی خوبصورتی دیکھ کر شاید شادی کے لئے راضی ہو جائے گا"

راجندر کی ماں نے کہا "اچھا بہن میں کل سویرے راجندر کو تمہارے ہاں بھیج دوں گی"۔

راجندر کی ماں جب گھر واپس ہوئی تو اس نے راجندر سے ذکر کیا اور وہ اپندر بابو کے مکان پر جانے کے لئے راضی ہو گیا۔

صبح ہوتے ہی راجندر اپندر بابو کے مکان پر پہنچ گیا وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا۔ کہ اپندر بابو مکان پر نہیں ہیں۔ بلکہ کہیں باہر گئے ہیں۔ ایک لڑکے نے جس سے راجندر ناواقف تھا اس کا استقبال کیا۔ اور مزاج پرسی کی تھوڑی دیر میں ایک خادمہ نے آکر انہیں جانے کے لئے کہا اور راجندر کی طرف منہ بنا کر مسکرائی لیکن اس نے کچھ خیال نہ کیا دونوں لڑکے اندر گئے۔ راجندر ایک دلکش سجے سجائے کمرہ میں بٹھائے گئے جہاں ایک میز پر چاندی کی تھالی میں کچھ مٹھائی اور پھل رکھے ہوئے تھے۔ راجندر کی کرسی کے قریب ہی ایک اور خالی کرسی رکھی ہوئی تھی۔ میزبان کے کہنے سے راجندر نے کچھ مٹھائی کھائی اسی وقت باہر سے چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی اور ایک خادمہ کمرے میں داخل ہوئی جس کے ہمراہ ایک چودہ پندرہ برس کی لڑکی تھی۔ خادمہ نے لڑکی کو خالی کرسی پر بٹھا دیا۔

راجندر نے شرما کر نظر نیچی کر لی وہ آہستہ آہستہ پھل کھانے لگا لیکن کبھی کبھی اس لڑکی کی طرف بھی دیکھتا جاتا تھا۔ جو کرسی پر بیٹھی ہوئی پاگلوں کی طرح کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑا رہی تھی۔ بدن پر نیلے رنگ کی ایک بوسیدہ ساری تھی اس کا سر کھلا ہوا تھا اور بال بے ترتیبی سے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ لڑکی بہت کالی تھی اس کی آنکھیں اندر کی طرف گھسی ہوئی تھیں اور سامنے کے دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ راجندر نے سوچا اس لڑکی کے ساتھ اُس کا بیاہ ہونے والا ہے۔ اس نے غور سے لڑکی طرف دیکھ کر پوچھا "تمہارا کیا نام ہے" لڑکی نے راجندر کی طرف دیکھا اور زبان کو منہ سے باہر نکال کر کہا۔ "کیا"

"تمہارا کیا نام ہے"

"میرا نام جگدمبا (پرانے زمانے کا نام) ہے اس پر میزبان اور خادمہ نے لڑکی کی طرف غصہ سے دیکھا تو اس نے فوراً کہا "پلنا"

جو لڑکا راجندر کے ساتھ اندر آیا تھا اس نے کہا کہ پہلے اس لڑکی کا نام جگدمبا تھا۔ لیکن اب تو سب اسے پلنا کہتے ہیں۔

راجندر نے سوچا "یہ نام کا بدلنا اچھا نہیں ہوا — جگدمبا! آہا کیسا پیارا اور پاک نام ہے۔ ایسے پیارے نام

ہمارے قدیم زمانہ کے رشی منی رکھتے تھے۔ اگر میں اس کے ساتھ بیاہ کروں گا تو میں پھر اس کا نام جگدمبا رکھ دوں گا"

راجندر نے پھر پوچھا "تم کچھ پڑھی لکھی ہو"۔

پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی لڑکی نے زبان نکال کر کہا کیا،

"تم پڑھ لکھ سکتی ہو"

"بالکل نہیں ــــ میرا بھائی ــــ"

خادمہ اور اس کے لڑکے نے پھر لڑکی کی طرف دیکھا جس سے وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

راجندر اور بھی خوش ہو گیا یہی تو وہ چاہتا تھا یہی تو اس کی دلی منشا تھی۔ اس نے سوچا "اب میں اپنے دوستوں کے سامنے سرخرو ہو جاؤں گا۔ میں نے جو سوچا تھا وہی کرکے دکھا دوں گا"

راجندر نے پھر لڑکی سے کہا "اچھا اب جا سکتی ہو"

لڑکی نے بدستور زبان نکال کر کہا "کیا"

"اب جاؤ"

خادمہ اس لڑکی کو کمرہ سے باہر نکال لے گئی اس عرصہ میں راجندر میوہ کھا چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک پندرہ برس کی لڑکی چاندی کی تھالی میں پان اور الائچی ہاتھوں میں لئے اٹھلاتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی۔ وہ بہت قبول صورت تھی۔ ایسی صورت جس پر شباب کی مستانہ اور فتنۂ خیز دلاویزیاں نثار ہو رہی تھیں۔ وہ مخملی کنارے کی ایک ریشمی ساری پہنے ہوئے تھی۔ کانوں میں طلائی بندے ہاتھوں میں سونے کے کڑے اور پاؤں میں چاندی کے لچھے تھے اس کی خوبصورت آنکھوں سے محبت اور پریم کی نورانی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ راجندر کے سامنے والی میز پر پان رکھ کر وہ خراماں خراماں چلی گئی۔ جاتے وقت وہ منہ بنا کر ہنسی۔ راجندر نے دل میں کہا "یہ بہت خوبصورت لڑکی ہے اگر میں اس کے ساتھ بیاہ کر لوں تو میرا عہد ٹوٹ جائے اور مجھے بڑی شرمندگی ہو۔ یہ لڑکی بہت مغرور معلوم ہوتی ہے"

پان کھا کر اسی لڑکے کے ساتھ راجندر گھر سے باہر آیا دروازہ پر کھڑی ہوئی ایک خادمہ نے راجندر سے ہنسکر پوچھا "بابو جی گھر کی عورتوں نے پوچھا ہے۔ کہ کنیا پسند ہے کہ نہیں"

غرور کے ساتھ راجندر نے جواب دیا "ہاں پسند ہے"

گھر لوٹتے وقت راجندر گزری ہوئی باتوں کو سوچنے لگا۔ گاؤں کی لڑکیاں کنوئیں سے پانی بھر کر سر پر گھڑے لئے واپس ہو رہی تھیں راجندر نے ان کی طرف دیکھا۔ ان میں کئی خوبصورت تھیں اور کئی بدصورت لیکن جگدمبا سے زیادہ کوئی کالی کلوٹی اور بدصورت نہ تھی۔ گھر پہنچ کر اس کی ماں نے پوچھا۔

"کہو کنیا پسند کر آئے"

"جی ہاں"

"تو کیا اب میں بات چیت ٹھیک کر لوں"

"آپ کی خوشی"

"تو پھاگن میں بیاہ ٹھیک ہوگا نا"
"جیسی آپ کی خوشی"

اس دن سے راجندر کچھ اُداس رہنے لگا وہ اکثر سوچا کرتا "جگدمبا بدصورت ہے اس کی کوئی فکر نہیں۔ لیکن افسوس ہے اس میں کچھ شعور بھی تو نہیں ہے"

چھٹیوں کے بعد جب وہ کلکتہ واپس ہوا تو اس کی طبیعت کا رنگ ہی اور ہوگیا۔ کالج کے لڑکوں نے دیکھا کہ راجندر کا چہرہ اُترا ہوا ہے جب ان لوگوں کو اس کی منگیتر کا نام معلوم ہوا تو وہ خوب ہنسے جگدمبا کی شکل وصورت کا خوب مذاق اڑایا گیا۔ راجندر کو لڑکے جب بہت دق کرتے تو وہ کہتا "جی ہاں آپ لوگوں کو تو تھیٹر کے نام بہت پسند آتے ہیں۔ چندراولی۔ گل بکاؤلی کے آگے آپ لوگ جگدمبا کے نام کو کیوں پسند کرنے لگے۔ اس پر لڑکے اور بھی ہنستے اور وہ کھسیا کر رہ جاتا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب جگدمبا کی یاد سے خود راجندر کا دل کانپ اُٹھتا وہ کالج تو جاتا لیکن پڑھنے میں دل نہ لگتا لڑکے چھیڑتے "راجندر تمہارا چہرہ زرد ہوگیا ہے پریم کا اثر معلوم ہوتا ہے"

بستر پر وہ رات بھر کروٹیں بدلتا آنکھیں بند ہوتے ہی اُسے ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے وہ جگدمبا کو اکثر کالی مائی کے روپ میں دیکھتا۔

جب بیاہ میں دو دن باقی رہ گئے تو اس نے سوچا کہ ماں کو لکھ دے کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتا وہ اس دن کالج بھی نہیں گیا اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا خط لکھتا رہا اور پھاڑتا رہا۔ اس نے سوچا کہ "اگر میں شادی روک دونگا تو میرے دوست واحباب میرا مذاق اڑائیں گے" اسی ادھیڑبن میں شام ہوئی اور رات آگئی آخر اس نے فیصلہ کیا۔ کہ بغیر کسی کو اطلاع دیئے ہوئے وہ کہیں بھاگ جائے۔ اس نے اٹھ کر ٹائم ٹیبل دیکھا لیکن پھر اس کا خیال بدل گیا "کیا میں اپنے قول سے اپنے پیمان سے ہٹ جاؤں نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا میں شادی ضرور کروں گا" وقت پر وہ مکان پہنچا۔ لڑائی کے وقت بہادر سپاہی ڈر کو بھول جاتا ہے۔ آدمیوں کی بھیڑ روشنی اور باجا گاجا نے راجندر کا دل بڑھا دیا اور اس کا بیاہ ہوگیا۔ جب سہاگن کے گھونگھٹ کھولنے کی رسم ہوئی۔ تو شگوں کے لئے دولھا اور دولھن، کے سر پر ایک رنگین ریشمی کپڑے کا ٹکڑا ڈال دیا گیا۔ دولھن کی صورت دیکھ کر راجندر متحیر ہوگیا "کیا یہ وہی کالی کلوٹی بدصورت جگدمبا ہے نہیں نہیں یہ تو وہ پان دے جانے والی سُندری ہے!" راجندر کے دل میں پریم کی آگ بھڑک اٹھی۔ سُندری کی نگاہوں میں زبردست قوت جاذبہ تھی۔ جس نے راجندر کی روح کو رگوں سے کھینچ لیا اور وہ دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

جب دن رات سے گلے مل کر رخصت ہوا اور پورنماشی کا چاند نیلے آسمان میں مسکرانے لگا تو راجندر سہاگن کے کمرہ میں داخل ہوا۔ دولھن سے بات چیت کرنے کی اس نے کوشش کی لیکن وہ تھوڑی دیر تک کامیاب نہ ہوا۔

تب اس نے ایک ترکیب سوچی کہ اگر وہ دولھن کے والدین کی شکایت یا برائی کرے تو وہ خاموش نہیں رہ سکتی۔ یہ خیال کر کے اس نے کہا "تمہاری ماں نے میرے ساتھ ایسی چالاکی کیوں کی؟"

یہ سنتے ہی گھونگھٹ والی بول اٹھی "کیا آپ نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں خوبصورت ہوں اس لئے آپ میرے ساتھ بیاہ نہ کریں گے۔ ایسا کہنے سے کیا میری ہتک نہیں ہوئی۔ ایسوں کے ساتھ ایسا ہی چاہیئے"۔

اب تک راجندر اس مسئلہ کو حل نہ کر سکا تھا اس نے پھر کہا "ارے تو وہ کالی مائی کون تھی جس کا مجھے درشن کرایا گیا تھا"۔

"وہ ہمارے گاؤں کے تیلی کی لڑکی تھی آپ کے ساتھ مذاق کیا گیا تھا"۔

اس کے بعد پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ راجندر بورڈنگ ہاؤس کے پھاٹک پر کھڑا ہوا ڈاکیہ کی راہ دیکھتا رہتا کہ وہ پران پیاری کا خط لاتا ہوگا۔

ملخص ——— اعظم کریوی

غزل

(از جناب میرزا شجاع مردی ایڈیٹر رسالہ "غالب" (امرتسر)

نشانہ ستم روزگار رہنے دے — نہ چھیڑ اے خلش عشق یار رہنے دے!
خلل نہ جذبۂ دل آئے ان کی راحت میں — مجھے رہین غم انتظار رہنے دے!
تعلقات جہاں کا ہے ترک ہی بہتر — دلے گزار و گزر گیر و دار رہنے دے!
تڑپ رہے ہیں شہیدان عشق قبروں میں — بس اب خرام قیامت نثار رہنے دے!
بڑھا نہ جا عبث اے پنجۂ جنوں حد سے — لباس عقل نہ کر تار تار رہنے دے!
نہ آزما دل وحشت سرشت کو ہمدم — بیان جوشش فصل بہار رہنے دے!

تڑپ تڑپ کے نہ ہم یوں بسر کریں شیون
قرار سے جو دل بے قرار رہنے دے!

مہمات عالمگیری

(تعارف)

(از حضرت رمضی اجمیری)

صبح جوانی شامِ پیری سے تبدیل ہو چکی ہے، آفتاب حیات افق مغرب پر آخری لمحہ کے انتظار میں لرز رہا ہے، یہ ہاتھ جو قبضۂ شمشیر کو چھوڑنا نہیں جانتے تھے، یہ بازو جس نے دشمنوں کے مغفر و زرہ پر اپنی قوت کا ثبوت دیا ہے، یہ پشت جو کبھی تیر کے مانند راست تھی، یہ چہرہ جو کبھی ماء الشباب سے درخشاں رہتا تھا، آہ! آج ضعف پیری اور سخافتِ شیب نے ان تمام خوبیوں سے محروم کر دیا، ہاتھ رعشہ ناک ہیں۔ اور بازو کمزور پشت خمیدہ ہے، اور چہرہ حزن و نقاہت کی تصویر! دنیا یکسر ظلمت و حرماں بن کر رہ گئی ہے۔ اور اس پیر کہن سال کا دل ایک دردناک تشنج کے ساتھ، عہد ماضی کی صولت و حشمت کی طرف دوڑتا ہے، ہاں اکثر رات کی تاریکی میں، طلوع سحر کی صباحت میں، دوپہر کے سناٹے میں یاد ماضی کے خوابوں میں غرق ہو جاتا ہوں۔ یہاں تک کہ دردناک حال کی ایک خفیف جھلک، طلسم ماضی کو باطل کر دیتی ہے، اور میری بے نور آنکھیں جو کبھی دیدۂ زرقا کی طرح تیز بین تھیں۔ آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ آہ میں نے دنیا کی عظیم ترین مملکت کے عظیم ترین بادشاہ کے سطوت و جبروت کو اپنی پوری تابش و تنویر کے عالم میں دیکھا ہے، ہاں ان آنکھوں نے بڑے بڑے مغرور فرمانرواؤں اچھے اچھے شیر دل سورماؤں کی گردنیں ایک آسمان شکوہ انسان کے سامنے عجز سے جھکی ہوئی دیکھی ہیں۔ اور اس پر شوکت زمانہ کی یاد میرے سینہ میں ایک طوفان حسرت، ایک طغیان یاس جوش زن کر کے بیخود بنا دیتی ہے، مگر وہ زمانہ گزر گیا، اور وہ دن نہیں رہے، اور میں یہاں دولت آباد کے جنگلوں میں ہنگامۂ دنیا سے دور، اپنی بقیۂ زندگی بسر کر رہا ہوں، نحیف و پیر، زار و حزیں، دل شکستہ و پر بستہ! میں — میر وحید بیجا پوری۔

آفتاب اسی طرح طلوع و غروب ہوا کرے گا، شب و روز ہمیشہ یوں ہی ہم آغوش ہوتے رہیں گے۔ موسموں کا یہ تبدل و تغیر اسی طرح استمرار پذیر رہے گا، لیکن یہ امتداد زمانہ، یہ مرور ایام، ناممکن ہے، کہ عرش آشیاں شاہ محی الدین عالمگیر اورنگ زیب جیسا کوئی زبردست شہنشاہ پیدا کر سکے، دلیری و شجاعت میں یکتا۔ فتوت و شہامت میں عدیم النظیر، عقل و دانش میں کامل۔ علم و فضل میں بے عدیل۔ سیاست و حکمرانی کے جملہ نکات سے واقف،

شہنشاہ ظاہری و معنوی کمالات کا جامع تھا، میں نے بڑے ماہرین سیاست کو اس کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرتے۔ اچھے اچھے عاقل و زیرک انسانوں کو

اس کے حضور میں کوتاہیٔ فہم کا اعتراف کرتے، زبردست سے زبردست متمرد و سرکش جنگجویوں کو اس کی ہیبت کے آگے لرزہ براندام دیکھا ہے، اور باللہ العظیم مجھے اس کی غلامی و نمک خواری پر بے انتہا فخر و ناز ہے، برّد اللہ مضجعہ و نوّر اللہ مرقدہٗ۔

متواضع و منکسر المزاج۔ بردبار و حلیم، زہد و متورع قائم اللیل۔ صائم النہار۔ شہنشاہ بالطبع فقر و درویشی کی طرف مائل تھا۔ چنانچہ عہد شباب میں دولت و تنعم سے بے نیاز ہوکر وہ غربی گھاٹوں میں عازل و معتکف ہوگیا تھا۔ جس پر اس کے بھائیوں نے اس کا مضحکہ اڑایا، اور شاہجہان بادشاہ سخت ناراض ہوا۔ مگر نوجوان شہزادہ نے کچھ پروا نہ کی، لیکن جب ایک برس کے بعد ملک و مذہب کے فرائض نے اُسے پکارا۔ اس نے اپنا زاویۂ عزلت چھوڑ کر پھر سپہگری کی طرف رجوع کی، مگر حقیقتہً یہ رجعت چند روزہ تھی۔ اور اگر وہ صورت حالات سے مجبور نہ ہو جاتا۔ تو کبھی بھی وہیم سلطنت پر قدم نہ رکھتا، کیونکہ شہنشاہ یک خرقۂ گدائی کو صد قبائے بادشاہی سے بہتر سمجھتا تھا پھر بادشاہ ہونے کے بعد بھی یہ حقیقت کوئی راز نہیں ہے کہ شہنشاہ نے باآں ہمہ قدرت و اختیار، اپنی ساری زندگی فقر و مسکنت میں گذاری، فرقان حمید کا لکھنا اس کے لئے وجہ کفاف تھا۔ اور تزکیۂ نفس کے واسطے وہ شب بیداری کرکے صلوٰۃ و تسبیح گردانی میں مشغول رہتا تھا۔ اپنی ذات کے لئے وہ بیت المال میں سے ایک دانگ بھی نہیں لیتا تھا۔ اور حدیث و تفسیر کے لئے اس نے بہترین علماً کا ایک گروہ منتخب کیا تھا۔ اس کا دربار اس کے پیشروؤں کے علی الرغم، عیش و عشرت کے تمام لوازم سے پاک تھا اور اس میں مسخروں اور بادگویوں کو بار نہ تھا۔ دنیا پرستی کے کسی مشغلہ سے اسے دلچسپی نہ تھی اور چنگ و رباب سے وہ طبعاً متنفر تھا۔ نواہی سے مجتنب، اوامر کا پابند میرے مرحوم آقا! خدائے لم یزل تجھے نعمائے عقبیٰ میں سے بہترین نعمتیں عطا فرمائے۔!

عہد شہزادگی میں شاہجہان بادشاہ نے اُسے دکن میں مقرر کیا تھا۔ دکن ہی میں اس کی عمر کے آخری سال بسر ہوئے، اور دکن ہی میں اس نے جان، جان آفرین کے سپرد کی، دکن! جو ہر وقت لڑائیوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔ اس کا اہتمام اور کس کے ہاتھ میں دیا جا سکتا تھا؛ داراشکوہ کے؛ جس کو اپنے مشرکانہ تصوف اور کفر نوازی سے فرصت نہ تھی۔ جو کفر و اسلام کو دو توام بہنیں کہا کرتا تھا! یا شجاع کے؛۔ جسے جام مے اور مہوشان چین و چگل کی موجودگی میں کوئی اور چیز یاد نہ رہتی تھی! یا مراد بخش کے؛ جو اگرچہ شیر دل و تہمتن تھا۔ لیکن مینائے شراب کی الفت میں ان دیگر صفات کو بروئے کار لانے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ نہیں، بلکہ وہاں ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی۔ جو شجیع و جوانمرد ہونے کے ساتھ مستقل مزاج، صائب الرائے، سلیم الطبع۔ اور صحیح الدماغ ہو، اور۔ پروردگار عالم اس کی روح کو علی علیین جگہ عنایت فرمائے، میرے

دلی نعمت میں یہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ بلخ وقندار میں شہنشاہ نے جس بہادری اور فوج کی رہنمائی کا ثبوت دیا تھا۔اس نے شاہ جہاں کو مجبور کیا۔ کہ وہ دکن جیسے خطرناک صوبہ کو اسی کے تصرف و اختیار میں دے ، یہ تفویض شہنشاہ کی جرأت وبسالت کا ایک نمونۂ اعتراف تھی یاد آیا یکہ ، ہمارا شہنشاہ خود بہ نفس نفیس رہنمائی کرتا ہوا معرکۂ کارزار میں سرگرم مبارزت ہوتا تھا، اور "اللہ سمعاً" کے نعرۂ جان بخش سے فوج میں ہمت وحوصلہ کی ایک روح پھونک دیتا تھا۔اس کا تنہا وجود اس لشکر عظیم کی جمعیت خاطر کا موجب تھا۔ فوج کا ایک ایک سپاہی شہنشاہ کے ایک اشارہ چشم پر اپنی جان دینے کے لئے تیار ہوتا تھا۔اور آہ! جب عین ہنگامۂ جدال وقتال میں دفعتہً شور وشغب کچھ خفیف ہوجاتا۔اور لشکریوں کو معلوم ہوتا۔کہ شہنشاہ نماز میں مشغول ہے۔ تو لوگوں کے قلوب میں کیسا مذہب کا جوش، دین کا کیسا ولولہ اٹھتا تھا! مگر یہ سب باتیں اب خواب وخیال ہوگئیں۔شہنشاہ نہایت اطمینان وسکون کے ساتھ خاک دولت آباد میں خوابیدہ ہے، اور میں۔اس کا ادنیٰ ترین خادم اس کے مزار کی جاروب کشی میں فلاح دین ودنیا مضمر سمجھتا ہوں۔

طبیعت مُردہ ہے، اور دل افسردہ! دل میں ایک عجیب اذیت رساں ویرانی کا احساس رہتا ہے، ہر وقت ایک بے کیفی طاری رہنے لگی ہے، اب کہ سنہ ۱۱۳۰ ہجری ہے اور شہنشاہ کو جنت آشیانی ہوئے بارہ برس بھی نہیں گزرے، کیا کیا انقلاب رونما ہوچکے ہیں، آبادی سے طبیعت نفور ہے، کیونکہ وہاں لوگ دہلی کے متعلق عجیب عجیب ناخوش گوار خبریں سناتے ہیں۔اور شہنشاہ کے وارثین کی نااہلی کے کچھ تذکرے کرتے ہیں، طبیعت اس بات کی متحمل نہیں، کہ وہ سلطنت جس کی آبیاری شہنشاہ نے اپنے شریف خون سے کی تھی۔اس کی تباہی کا حال خموشی سے سُنیں، پھر اس لئے اور پھر اس واسطے کہ بعض کور نمک شہنشاہ پر، اس کی رحلت کے بعد زبان طعن دراز کرتے ہیں، اور دست وبازو میں انتقام کی قوت نہیں رہی ہے، میں نے آبادی میں جانا ترک کردیا ہے، اب میرے لئے سوائے اس کے اور کیا رہ گیا ہے۔کہ شہنشاہ کے مزار پر جاروب کشی کروں، اور جب بہت دل گھبرائے تو واقعات ماضیہ لکھ کر اور پھر اسی زمانہ کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرکے مسرور ہولوں،

اب میں ابتدا سے لکھوں گا، اور بتاؤں گا۔کہ کس طرح مجھے شہنشاہ کی خدمت کا فخر حاصل ہوا ۔

سنہ ۱۰۵۷ ہجری کا زمانہ تھا، میری عمر کوئی اُنیس بیس برس کی ہوگی، میں ضروری تعلیم حاصل کرنے کے بعد فنون حربیہ سیکھ رہا تھا۔ ایک روز میرے والد مرحوم نے جو شاہ بیجاپور کی فوج میں ملازم تھے ، مجھے بلا کر کہا تم فنون حربیہ کی تقریباً تکمیل کرچکے ہو، چونکہ جنگ کا اندیشہ ہے۔اس لئے شاہ فوج میں اضافہ کرنا چاہتا ہے تمہاری قابلیت دکھانے کا یہ اچھا موقع مل گیا ہے، شنبہ کے روز

تم بالکل تیار ہو جاناہ
اب یہ ایک عجیب بات تھی، کہ باوجود اس کے، کہ میں اپنے گردوپیش اورنگ زیب کی مذمت ہی مذمت سُنتا تھا، کیونکہ شہنشاہ نے شہزادگی کے زمانہ ہی میں، دکن میں اپنے تصرف و اقتدار کے لئے سختیاں شروع کردی تھیں، مجھے اس سے بہت عقیدت تھی، لوگ اس کی بہادری کی داستانیں بُرے پیرایہ میں بیان کرتے تھے، اور میں دل ہی دل میں اس کی محبت کو استوار کرتا جاتا تھا، میں ایک تو طبعاً شجاع پسند تھا۔ اور کچھ ازدیادِ عقیدت کی یہ وجہ ہوئی۔ کہ لوگ اورنگ زیب کے حالات بیان کرتے وقت اس کے مافوق الانسان شجاعانہ کارناموں کا ذکر کرتے تھے، جو مہم افغانستان کے موقعہ پر اس سے ظہور میں آئے، اور اس وقت اس کی عمر مجھ سے کچھ ہی زائد تھی، میرا خواب تمنا یہ تھا۔ کہ میں کسی طرح اورنگ زیب کی فوج میں داخل ہوکر دادِ شجاعت دوں اور اس کی آنکھوں سے ایک پسندیدگی کی نظر حاصل کرلوں، میرے بیشتر اوقات اس کی تدابیر سوچنے میں گزرتے تھے، اور میں خدا جانے ذہن میں کیا منصوبے باندھا کرتا تھا، اور کیسی کیسی توقعات وابستہ کیا کرتا تھا۔ اور پھر جب ایک دفعہ شہنشاہ کا لشکر بیجاپور سے گزر رہا تھا، اور میں نے خود شہنشاہ کو دیکھ لیا تو اس کی صورت دیکھ کر میری عقیدت شیفتگی کی حد تک پہنچ گئی، لیکن اپنا مافی الضمیر میں والد سے کس طرح کہہ سکتا تھا۔ اس لئے

میں نے خوشی سے جواب دیا، مگر میں فوج میں ملازمت کرنا نہیں چاہتا۔"

والد۔ (بے انتہا متعجب ہوکر) پھر کیا کروگے!

میں۔ (عاجزی سے) "ابھی میں کچھ عرض نہیں کرسکتا۔"

والد۔ (شفقت سے) "آخر کچھ تمہارا منشار تو معلوم ہو"

والد کو مجھ سے بے حد محبت تھی اور اس پر اعتماد کرکے میں نے سوچا کہ اپنی دل نشین آرزو بیان کردوں میں نے کہا، "میں عرض کردوں گا۔ تو آپ غالباً خفا ہوں گے۔"

میں۔ میں یہ چاہتا ہوں۔ کہ شاہ اورنگ زیب کی فوج میں داخل ہوجاؤں۔

والد۔ (معاً برافروختہ ہوکر) کیا! کورنمک تو دشمنوں سے ملنا چاہتا ہے۔

میں۔ مگر اورنگ زیب ہمارے بادشاہ کا بھی سردار ہے، دشمن نہیں۔

والد۔ احمق! تو ان باتوں کو کیا جانتا ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ بادشاہ فوج میں کیوں اضافہ کر رہا ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ بادشاہ اس کوشش میں ہے، کہ خفیہ طور پر شاہ گولکنڈہ سے اتحاد کرکے اورنگ زیب پر متفقہ حملہ کیا جائے، معاذاللہ! میں نے والد سے کہا جناب گستاخی معاف میں اورنگ زیب کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکتا۔"

والد۔ (سُرخ ہوکر) یہ عجیب خبط ہے، "تمہیں اورنگ زیب سے کیا فائدہ پہنچا ہے، یہ کھلی ہوئی نمک حرامی

ہے۔ اگر بادشاہ کو ذرا خبر ہو جائے۔ تو تمہیں شکنجہ میں کسوا دے۔"

وہ اور بھی بہت کچھ خفا ہوتے رہے، اور اگرچہ اس وقت معاملہ رفت و گذشت ہوگیا۔ مگر میں نے سمجھ لیا۔ کہ اپنی حیات مستقبلہ کے لئے مجھے جو کچھ فیصلہ کرنا ہے، وہ اب کر لینا چاہئے، ورنہ تاخیر و تعویق کا وقت نہیں رہا ہے، چنانچہ میں نے اسی دن ایک فیصلہ کر لیا، اور شام کو چند ضروری چیزیں لے کر برہان پور کی طرف جو اس وقت شاہزادہ کا مستقر تھا بغیر کسی کو اطلاع دیئے پا پیادہ روانہ ہوگیا۔

رات تاریک تھی، اور راستہ ناہموار، اور اگرچہ میرے لئے یہ پہلا موقع تھا، مگر میں بالکل بے پروائی سے شوق کے پروں پر اڑتا چلا جا رہا تھا۔ درخت سائیں سائیں کر رہے تھے، دونوں طرف برابر تاریکی میں سے جنگلی جانوروں کے بھاگنے کی آواز آتی تھی، اور بعض وقت جب شیر کے دہاڑنے کی آواز دوش ہوا پر میرے کان میں آتی۔ تو غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ قبضہ شمشیر پر پہنچ جاتا۔ میں سوچ رہا تھا اور چل رہا تھا۔ چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ خدا جانے کیا کیا تدبیریں میں نے سوچیں اور کن کن امیدوں کے محل بنائے، مگر جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ جب خدا خود میر ساماں ہو جائے تو بندہ کو جمع اسباب کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ میں نے کتنی مسافت طے کی۔ لیکن جس وقت بے خودی خیالات سے میں چونکا۔ تو سپیدۂ سحری نمودار ہو رہا تھا۔ اور دور ایک چرس چلانے والے کا گانا کسی گاؤں کے ہونے کا پتہ دے رہا تھا۔

میری حالت غلبۂ خواب سے خستہ ہو رہی تھی۔ بدن شل اور تکان سے چور چور تھا۔ مگر میں نے بعجلت ناشتۂ صباحی سے فراغت حاصل کر کے ایک آرام دہ بہلی کرایہ کی، اور ابھی آفتاب نے بقدر ربع بھی سفر آسمان طے نہ کیا تھا۔ کہ بہلی گاؤں سے نصف فرسنگ دور پہنچ چکی تھی اور میں اس کی آغوش میں پڑا ہوا گہری نیند میں غرق تھا۔

اثنائے سفر میں کوئی قابل ذکر بات وقوع پذیر نہ ہوئی المختصر یہ کہ بعد قطع مراحل و طے منازل میں برہان پور میں داخل ہوا۔

میں نے وہاں ایک رباط میں قیام کیا۔ اور میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر مہمان خانۂ رباط میں جہاں شاہزادۂ اورنگ زیب کے حکم سے ہر مسافر کو پہلے تین دن تک بطور مہمان شاہی کھانا کھلایا جاتا تھا۔ جا رہا تھا۔ کہ تین مسافر جن کے چہروں سے تجربہ کاری اور سرد و گرم چشیدگی کے تمام آثار ظاہر تھے۔ گھوڑوں پر سوار رباط میں داخل ہوئے تینوں موٹے موٹے اور قدرے کثیف کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ سروں پر بڑی بڑی اور بے ترتیبی سے بندھی ہوئی گولکنڈہ کے طرز کی دستاریں تھیں۔ کمر میں چوڑی اور ٹخنے تک لٹکتی ہوئی تلواریں۔ آنکھوں سے خونخواری برستی تھی۔ خم لب سے سنگدلی کا اظہار ہوتا تھا۔ تینوں نے اپنے گھوڑے درختوں سے باندھے۔ اور مہمان خانہ میں داخل

ہوئے۔ میں بھی ان کے پیچھے گیا۔ اتفاق سے سوائے ہم چار کے اس وقت مہمان خانہ میں کوئی اور نہ تھا۔

غرض کھانا آیا۔ اور ہم نے کھانا شروع کیا۔ وہ تینوں دسترخوان کے ایک طرف بیٹھے تھے۔ اور میں دوسری طرف تینوں بہت خموشی کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ میری جانب انہوں نے صرف ایک دفعہ نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔ جلدی جلدی یہ لوگ کھانا کھا کر اٹھ گئے۔ اور میں بیٹھا رہا۔ ان کے جانے کے بعد دفعتہً میری نظر جہاں وہ بیٹھے تھے وہاں پڑی۔ ایک دبیز کاغذ کا لفافہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے بغیر کسی قسم کے احساس کے ہاتھ بڑھایا۔ اور لفافہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ تین لمحہ نہ گذرے ہوں گے۔ کہ ان میں سے ایک حواس باختہ سا اندر آکر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر دوسرا آیا پھر تیسرا۔ تینوں حد درجہ سراسیمہ معلوم ہوتے تھے۔ اور دوسری جانب مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا۔ کہ لفافہ کی تلاش میں ہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ تھوڑی دیر ان کو پریشان کر کے لفافہ دے دوں گا۔ مگر ان کی یہ انتہائی پریشانی دیکھ کر مجھے کچھ شبہ ہوا۔ اور بجلی کی طرح ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ یہ لوگ گولکنڈہ کے معلوم ہوتے تھے۔ ممکن ہے اس لفافہ کا تعلق شہزادہ اورنگ زیب سے ہو۔ غالباً اس کا حصول کسی نہ کسی طرح شہزادے کے لئے سودمند ہوسکے۔ میں نے عزم کر لیا۔ کہ خواہ کچھ ہو۔ میں اس لفافہ کو دیکھوں گا۔ تینوں ادھر ادھر دیکھ کر اور مجھ پر اشتباہی نظریں ڈال کر باہر چلے گئے میں بھی کچھ توقف کے بعد نکلا۔ اور دیکھا کہ دونوں رباط کے سامنے والے صحن میں سر جھکائے ہوئے تلاش میں مشغول ہیں۔ اور تیسرا گھوڑا دوڑائے ہوئے جس سڑک سے آئے تھے ادھر جا رہا ہے۔ اور جھک جھک کر دیکھتا جاتا ہے۔

میں قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرہ میں گیا۔ اور دروازہ بند کر کے پُر اضطراب دل کے ساتھ لفافہ نکالا۔ چپڑی توڑ کر میں نے لفافہ کھولا۔ اور اندر سے کاغذ نکال کر جلدی جلدی نظر دوڑائی۔ لکھا تھا۔

عالیجاہ۔ شاہ بیجاپور۔

بعد از تقدیم مراسم، خادم عرض پرداز ہے۔ کہ آنحضرت کی منشا سے شہنشاہ گولکنڈہ باخبر ہوئے۔ لیکن مصالح کے بنا پر شہنشاہ فی الحال آنحضرت کی خواہش کی ہمنوائی سے معذور ہیں۔ خادم (وزیر گولکنڈہ) میر جملہ ۲۰ بہمن"

میرا سانس تیزی سے چلنے لگا۔ بیجاپور میں جو افواہ میں نے سُنی تھی۔ یہ خط اس کی تصدیق تھا۔ شاہزادہ اورنگ زیب پر اپنی وفاداری ظاہر کرنے کا اس سے بہتر کیا ذریعہ ہوسکتا تھا۔ لیکن ابھی مجھ پر سے اس لمحہ کی اضطراب آفرینی پورے طور پر فرد نہ ہوئی تھی۔ کہ کسی نے دق الباب کیا۔ میں نے جلدی سے لفافہ جیب میں رکھ کر دروازہ کھولا۔ اور میری آنکھیں ان تینوں مسافروں کے اُترے ہوئے چہروں سے دوچار ہوئیں۔ بہت خاموشی کے ساتھ وہ میرے کمرہ میں یکے بعد دیگرے داخل ہوئے۔

اور دروازہ بھیڑ کر ایک نے کہا "جناب من! ہمارا لفافہ آپ نے لیا ہے۔"

مجھے اس کے درشت لہجہ اور توہین آمیز طریق الزام پر غصہ آگیا۔ اور میں نے قبضہ شمشیر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ حضرت من! آپ کو معلوم ہے کہ اس قسم کے سفیہانہ اتہام کا جواب زبان تیغ سے دیا جاتا ہے۔

اس نے بشرہ میں خفیف سی تبدیلی پیدا کئے بغیر سرد مہری سے کہا۔ "یہاں سے نصف فرسنگ تک لفافہ میرے پاس موجود تھا۔ سڑک پر، صحن میں، مہمان خانہ کے اندر سب جگہ تلاش کیا جا چکا ہے، مگر نہیں ملا۔ لاجرم اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ مہمان خانہ میں میری جیب سے نکل پڑا ہوگا اور وہاں چونکہ سوائے آپ کے کوئی اور نہ تھا۔ اس لئے یقیناً آپ ہی نے اٹھایا ہے۔ اس کی بازیافتگی پر ہماری موت وزیست کا انحصار ہے۔ آپ دیدیجئے۔ ورنہ۔ ۔ ۔"

نہایت سرعت سے تین تلواریں چمک کر بلند ہو گئیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ حملہ کریں۔ میں اپنی مدافعت کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ بہت دیر تک شمشیر زنی ہوتی رہی لیکن نہ انہیں مجروح کرنے کا موقعہ ملا۔ اور مجھے تو فارغ سے فرصت ہی نہ تھی۔ یہ لوگ اگرچہ آزمودہ شمشیر زن تھے لیکن چونکہ مجھے مدت سے اورنگ زیب کی فوج میں داخل ہونے کی تمنا تھی۔ اس لئے میں نے بھی کچھ کم توجہ اور تن دہی سے یہ فن حاصل نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ان کی انتہائی کوشش کے بعد بھی میں نے ان کے کسی وار کو اپنے تک نہ پہنچنے دیا۔ ابھی ہم میں آویزش جاری تھی۔ کہ حسن اتفاق رباط کا ایک خادم ادھر سے گذرا اور تلواروں کی چقماق سے اس کی توجہ ادھر منعطف ہوئی۔ اس نے جھانک کر دیکھا اور شور بلند کر دیا۔ چشم زدن میں رباط کے تمام لوگ دروازہ پر جمع ہو گئے۔ میرے حملہ آوروں نے دیکھ کر اپنے حملوں کو اور تیز کر دیا۔ باہر چیخ پکار، تگ دو دو ہو رہی تھی۔ دفعتہً دو سُرخ وسپید طویل القامت جنگجو سپاہی کمرہ میں داخل ہوئے۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا۔ کہ یہ اورنگ زیب کے لشکری ہیں اور پکار کر کہا "یہ لوگ شہزادہ اورنگ زیب کے مخالفین ہیں۔ اور مجھ سے وہ خط واپس لینا چاہتے ہیں۔ جو شہزادہ کے لئے سُودمند ہوگا۔" اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوًا۔ کیونکہ میری توجہ دوسری طرف ہوتے ہی ایک نے میرے کاندھے پر تلوار ماری۔ میرا شانہ جھُول گیا اور شدتِ کرب سے میں بیہوش ہو کر گر پڑا!

جس وقت مجھے ہوش آیا تو کسی کے نہایت خوش الحانی کے ساتھ کلام مجید پڑھنے کی آواز میرے کان میں آ رہی تھی۔ میں نے آنکھ کھولی اور میری حیرت اور گھبراہٹ کی کوئی حد نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا۔ کہ رات کا وقت ہے۔ میں ایک مختصر سے کمرہ میں ہوں۔ جس میں چٹائی بچھی ہوئی ہے۔ اور ایک گوشہ میں شہزادہ اورنگ زیب گاڑھے کا لباس پہنے ہوئے جائے نماز پر بیٹھا ہوًا، ایک معمولی سی شمع کی روشنی میں کلام پاک کی تلاوت میں

مشغول ہے۔ میں اپنے نرم اور گدگدے بستر پر دفعۃً اٹھ بیٹھا۔ آہ! شہنشاہ گاڑھے کا لباس پہنے اور گاڑھے کا رومال اپنے سر پر باندھے ہوئے تھا، مگر اس حالت سے زیادہ محبت و مرعوبیت میرے دل میں اس وقت بھی کبھی نہ ہوئی۔ جب وہ دربار کے اوقات میں قبائے سلطانی زیب بر اور تاج شاہی زینت سر کئے ہوتا تھا۔ تاج شاہی! جس میں کوہ نور جیسا ہیرا نور پاشیاں کرتا تھا۔!

اورنگ زیب نے تلاوت سے فارغ ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں گھبرا کر اٹھا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سلام کیا۔ شہزادے نے مسکرا کر نہایت شیریں لہجہ میں پوچھا "امید ہے اب زخم اچھا ہوگا۔"

اُس وقت مجھے خیال آیا کہ میں زخمی ہو گیا تھا۔ شہزادہ کی موجودگی میں، میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ کہ میں یہاں کس طرح آیا۔ کیوں آیا۔ کب آیا۔ میں بھول گیا تھا۔ کہ میں کسی سے لڑا تھا۔ زخمی ہوا تھا۔ مجھے بس یہ یاد تھا۔ کہ میں ایسی جگہ ہوں۔ جہاں ایک ملکوتی صفات شہزادہ زہد و اتقا کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ جس کو باوجود قدرت و اختیار لذائذ دنیوی سے نفرت ہے۔ آہ! میرا دل اس وقت اپنے شہزادہ پر قربان ہونے کو چاہ رہا تھا۔

میرے زخم پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور قطعی کوئی تکلیف نہ تھی۔ میں نے مسرت و امتنان سے رُکی ہوئی آواز میں کہا "غلام کا زخم بالکل اچھا ہو گیا ہے"۔

شہزادہ کے چہرہ پر خفیف سا ناخوشگواری کا اثر ظاہر ہوا۔ اُس نے کہا "اگر آپ لفظ غلام کو 'میں' سے بدل دیں تو اچھا ہے"۔

شہنشاہ حد درجہ مساوات پسند تھا۔ وہ اپنے ادنیٰ ادنیٰ خادموں سے نہایت شائستگی کے ساتھ گفتگو کرتا تھا۔ اور درباری اوقات کے علاوہ اسے اپنے تئیں تعظیمی القابات سے پکارا جانا سخت ناپسند تھا۔

شہزادے نے پھر کہا "اگر ممکن ہو تو آپ مجھے تمام واقعہ سنائیں"۔

میں نے اپنا واقعہ شروع سے آخر تک مَن وعَن سُنایا۔ میری عقیدت، والد کی ناراضگی۔ مسافروں کی چیرہ دستی! اور جب دو تین دفعہ میں نے شہزادہ کے چہرہ پر تبسم دیکھا تو مجھ پر وفور مسرت سے شادی مرگ کی کیفیت طاری ہونے لگی!

شہزادہ نے تمام واقعہ سُننے کے بعد خوش مزاجی سے کہا "اگر الحرب خدعۃ" کی حمایت آپ کے ساتھ نہ ہوتی تو میں اس خط لے لینے کے قصّہ کو بہ نظرِ پسندیدگی نہیں دیکھتا"۔

اس کے بعد میں مرحمت خاص کے ساتھ پانچسو سپاہیوں کے دستہ پر سالار مقرر ہوا اور پھر بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ کس طرح شاہی سپاہیوں نے ان تین مسافروں کو گرفتار کر لیا تھا اور میری جیب میں سے خط نکالتے ہوئے میرا واقعہ سنایا تھا۔ جس پر شہزادے نے حکم دیا تھا کہ فوراً مرہم پٹی کر کے اطاق خاص میں ایک

کبھی نرم بستر پر سویا ہوگا۔ اگولکنڈہ کے خط کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ صرف اس بات کے انکشاف نے کہ وہ خط پکڑا گیا ہے

گلکدہ

(از میرزا بیضا خاں صاحب مروی۔ ایرانی)

نمودہ معجزِ صبا چہ جمعِ نور و نار ہا ضیائے نو بہار ہا فروغِ لالہ زار ہا

بیا بیا نگارِ من نگارِ من قرارِ من دلم ز دست می رود۔ رود ز دست کار ہا

بیا بچشم جائے تو، بسر نہیم پائے تو بجان و دل فدائے تو نہ یک نہ صد ہزار ہا

بہ بین بباغ لالہ را، گرفتہ خوش پیالہ را بکش مئے دو سالہ را، چہ رنج روزگار ہا

بدرگہِ تو عاشقاں گزارند نذرِ جاں فتادہ اند کشتگاں یمین و ہم یسار ہا

بشاخِ گل غزل سرا، چہ طائران خوشنوا وز نسیم جانفزا، ز نغمۂ مرغزار ہا

بخونِ دل وضو کنم، کہ بیعتِ سبو کنم بہ کیف ہاؤ ہو کنم، کنار جوئبار ہا

بہ بین بہ گلشنِ من شگفتہ گل چمن چمن شدہ طرازِ انجمن، ز فیضِ نو بہار ہا

ز لالہ ژالہ می چکد، صبا لبش ہمے مکد دلِ ہزار می طپد ز رنجِ اضطرار ہا

بپائے کوہ دیدنی کنارِ چشمۂ رواں

حواصل و کلنگہا تدرو ہا و سار ہا

مرقع لاہور

(از میر ارشاد علی صاحب ارشد دہلوی)

مسلسل

اور جس کے صلے میں بادشاہ نے بہت سا انعام واکرام دیا۔ حوض کو تانبے کے سکّے سے بھروا دیا۔ جب یہ سکّے گنے گئے۔ تو بیس کروڑ نکلے۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ حکیم ان سکّوں کو اٹھا کر لے جائے۔ مگر اس نے معذوری ظاہر کی۔ اور معذرت چاہی جس پر بادشاہ سلامت نے اسے دس ہزار روپیہ چہرہ شاہی دیا۔ اس سے سترہ سال پہلے ایک اور حکیم نے فتح پور سیکری میں ایک ایسا ہی حوض بنانا چاہا تھا مگر وہ ناکامیاب رہا تھا۔"

یہ شہر ادیبوں۔ شاعروں۔ مصنفوں۔ حکیموں اور پیروں کا بھی جائے مسکن و آخری قیام گاہ رہا ہے۔

راجہ ٹوڈرمل۔ فیضی۔ عرفی۔ مولانا ابو اسحاق قادری وغیرہ نے یہیں وفات پائی۔ اور پیوند خاک ہوئے۔

۱۶۰۶ء میں جہانگیر ہندوستان کا بادشاہ ہوا۔ اکبر سے زیادہ جہانگیر نے لاہور کو رونق دی۔ اسے لاہور سے خاص وابستگی تھی۔ اس کے زمانے میں آگرہ تو برائے نام ہندوستان کا دارالخلافہ تھا۔ بادشاہ اکثر لاہور ہی میں رہا کرتا تھا۔ اور اسی راستے سے کابل و کشمیر جاتا تھا۔ اسی لاہور میں ہفت اقلیم کے ایلچی و سفیر باریاب ہوا کرتے تھے۔

۱۶۱۶ء میں لاہور میں نہایت عظیم وبا پڑی۔ جس سے اس شہر کی آبادی کا نصف حصہ ضایع ہو گیا۔

۱۶۲۱ء میں لاہور میں بادشاہ سلامت کے پانچویں لڑکے شہریار کی شادی نور جہاں کے پہلے خاوند کی لڑکی لاڈلی بیگم عرف مہرالنساء سے بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ اس وقت آصف جاہ لاہور کا گورنر تھا۔

(Richard Still) رچرڈ سٹل اور جان کروتھر (John Crowther) دو انگریز تجاروں نے ۱۶۲۶ء عہد جہانگیر میں تجارت کی خاطر ہند کا سفر کیا۔ وہ متحدہ طور پر لاہور کی بابت لکھتے ہیں!

"لاہور:۔ ہندوستان کے بہترین شہروں میں سے ایک خوش نما شہر ہے۔ ایسا پُر بہار و لالہ زار شہر ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔ ہندوستان کے تمام اطراف کے تجار یہاں آتے جاتے ہیں ٹھٹہ ملک سندھ کے لئے مال لے جاتے ہیں۔ تقریباً ۱۲-۱۴ ہزار لدے ہوئے اونٹ یہاں سے قندہار اور فارس کی طرف جاتے ہیں"۔

۱۶۲۸ء میں جہانگیر نے بمقام راجوڑی واقعہ کشمیر انتقال کیا۔ اور لاہور میں نورجہاں کے باغ میں مدفون ہوا۔

اسی سن میں شاہ جہان بادشاہ سریر آرائے تخت سلطنت ہوا۔ اس کے عہد میں لاہور اپنی معراج کمال کو پہنچا۔ اور ایسا وسیع اور خوشنما بنا کہ آج تین سو برس تک بھی اسے وہ گزشتہ شان وشوکت نصیب نہ ہوئی۔ شاہ جہان لاہور ہی میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے اسے لاہور سے ایک خاص اُنسیت تھی۔ اسے عمارت کا خاص شوق تھا۔ محمد صالح لاہوری اپنی کتاب اعمال صالح میں لکھتا ہے کہ بادشاہ کو عمارات کا شوقین پاکر تمام رعایا کو میں بھی عمارات کا خاص شوق پیدا ہو گیا۔ بلکہ جیسا راجہ ویسی پرجا۔ ہر ایک صاحب مقدور نے اپنے مقدور سے بڑھ کر عمارات اور باغات بنوائے۔ جس طرف بھی نظر اُٹھتی تھی۔ شہر رشک باغ ارم معلوم ہوتا تھا۔ پھولوں کی یہ کثرت تھی کہ اردگرد میلوں تک فضائے شہر معطر رہا کرتی تھی۔

شاہ جہان لاہور ہی میں اکثر دربار کیا کرتا تھا۔ اسی جگہ ایران۔ توران۔ بلخ۔ بصرہ وغیرہ کے سفیر باریاب و آستانہ بوس ہوا کرتے تھے۔ اسی کے عہد میں قندہار کے مشہور انجنیر علی مردان خان والیٔ قندہار نے اپنا علاقہ بادشاہ کے سپرد کر کے حلقہ بگوشی اختیار کی۔ اسی نے لاہور میں شالامار باغ کی بنا ڈالی اور علاقہ نورپور سے ایک نہر۔ علی مردان خان کی نہر نکالی۔ (دہلی میں بھی ایک نہر اس کی یادگار اب تک باقی ہے) اس کا روضہ بھی شالامار باغ کی طرف واقعہ ہے۔ سکھوں کے عہد میں دیگر عمارتوں کی طرح یہ عمارت بھی بُری طرح خستہ ہوئی۔ اب صرف ڈھانچہ سا باقی ہے۔

۱۶۳۷ء میں علی مردان خان کی نہر بصرف دو لاکھ روپیہ طیار ہو گئی۔ بادشاہ نے خلیل اللہ خان کو حکم دیا۔ کہ ایک نادر باغ اس کے کنارے پر لگایا جائے۔ چنانچہ شالامار باغ کی تعمیر عمل میں آئی۔ تفصیل کے لئے بادشاہ نامہ ملاحظہ فرمایئے۔ جس میں درختوں اور میووں کی پوری پوری تفصیل تک درج ہے۔ اس سن میں وزیر خان گورنر لاہور اور آصف خان سپہ سالار لاہور فوت ہوئے۔

فارغ البالی اور خوشحالی کا یہ عالم تھا کہ باید و شاید صرف صوبۂ لاہور کے محاصل نوّے کروڑ روپیہ سالانہ تھے صوبۂ ملتان کے اٹھائیس اور صوبۂ کشمیر کے پندرہ کروڑ روپیہ سالانہ تھے۔

شہزادہ داراشکوہ بادشاہ کا سب سے بڑا لڑکا۔ لاہور کی رہائش اور زیبائش کا بہت شائق تھا۔ اہالیان لاہور بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس نے شہر کے ایک طرف ایک وسیع محلہ چوک داراشکوہ بنوایا۔ اور ایک بازار نخاس بنوایا۔ یہ چوک اس جگہ واقعہ تھا جہاں اب سلطان کی سرائے واقع ہے ۱۸۵۴ء میں برٹش عملداری میں میاں سلطان ٹھیکیدار کے ہاتھ بہ عمارات فروخت کی گئیں۔ جس نے اس کی اینٹوں کی خاطر اسے بیخ و بُن سے اکھاڑ ڈالا۔ میاں سلطان کے دست تباہ کن سے شاہان سلف کی بہت سی عمارات کا نشان تک مٹ گیا۔

شاہ جہان کے عہد میں لاہور میں بادشاہی عمارات شلاً مقبرہ جہانگیر۔ آصف جاہ۔ مسجد وزیر خان۔ شالامار باغ وغیرہ کے علاوہ دیگر اُمرا ونا نے شہر کے اردگرد دریا کے کنارے بیسوں باغات اور حویلیاں تعمیر کی تھیں۔ ایک سیاح کو لاہور پر واقعی باغ جنت کا دھوکا ہوتا تھا۔

اگر ہر ایک عمارت کی تفصیل لکھی جائے۔ تو یہ مضمون طول ؟ ل ہو جائے۔ ناظرین تصور کر لیں۔ کہ یہ بچی کھچی ٹوٹی پھوٹی جو عمارات نظر آتی ہیں۔ یہ اس زمانے کی جدید تعمیر شدہ عمارات کی ہزاروں حصّہ بھی شان و شوکت نہیں رکھتیں۔

مسجد وزیر خان کی جدید عمارت شہر کی شان و شوکت کو کس قدر بڑھاتی ہو گی، شالامار باغ کی دلکش تفریح گاہ پریزاد شہزادیوں کے پائے نازک سے پامال ہوتی ہو گی۔ پریرو ستاروں کے جھرمٹ چہل قدمیاں۔ اٹھکیلیاں کرتے ہوں گے۔ اس کے آبشاروں کی بغل میں فواروں کی چھاؤں میں۔ بارہ دریوں کے اندر۔ دیوزاد درختوں کے نیچے ماہوشوں کے سریلے گلوں سے وادیٔ کشمیر و کابل کے سُہانے و دلکش ترانے گائے جاتے ہوں گے۔ اسکے جھرنوں کے کنارے پر طبع رس شہزادیاں اشعار موزوں کیا کرتی ہوں گی۔

بادشاہ نامہ میں لکھا ہے۔ کہ جھرنے والی بارہ دری اور آبشار کے قرب و جوار کا علاقہ زیب النسا بیگم دختر اورنگ زیب کی خاص جائے تفریح تھا۔ میاں کی خاموش فضا میں آبشار کی دھیمی ترنم ریزی اس شاعر کے قلب و دماغ کو ایک لطیف ہیجان میں لے آتی تھی۔ اکثر اس جگہ بیٹھ کر وہ محبت نواز۔ مجروح خو عشق شہزادی اشعار موزوں کیا کرتی۔ چنانچہ ایکبار جب کہ کسی خاص وجہ سے شہزادی موصوفہ کے دل پر غم و حسرت کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے اس آبشار کے پاس آکر تخت مرمریں پر بیٹھ گئی۔ پانی کی سرگرداں روانی اور دھیمی آواز سے متاثر ہو کر یہ اشعار زبان پر لائی۔ سہ

اے آبشار نوحہ گر از بہر کیستی
چیں بر جبیں فگندہ ز اندوہِ کیستی
آیا چہ درد بود کہ چوں ما تمام شب
سر بسنگ میزوی و میگریستی

یعنی

اے آبشار نوحہ گری کس کے واسطے
تیوری پہ بل پڑے ہیں تری کس کے واسطے
کیا درد ہے جو میری طرح تو تمام رات
سر کو پٹخ کے کھوتا ہے جی کس کے واسطے

مؤلف

اب بھی یہ مقام عاشق مزاج۔ فرقت نصیب۔ حرماں کیش ہستیوں کی خاص آماجگاہ ہے۔ اُس وقت کیا کیفیت ہو گی۔

شاہ جہاں کے عہد میں ایک ہسپانوی پادری سیاحت ہند کے لئے آیا اس نے لاہور کی رونق۔ شان و شوکت۔ تمدن

معاشرت۔ تجارت۔ صنعت۔ حرفت کے متعلق لکھا ہے[1]

ہم آگرے سے چل کر اکتیویں دن کی صبح کو شہر لاہور میں پہنچے۔ یہ ایک نہایت عظیم شہر ہے۔ یورپ کا کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا باوجود اس بات کے کہ یہ اندرونی علاقہ کی آبادی نہایت گنجان ہے۔ پھر بھی مکانات کی قلت ہے اور لوگ خاص کر اُمراٗ شہر سے باہر میلوں تک آباد ہیں۔ یہ نہایت خوشنما اور باوضع شہر ہے۔ بڑے بڑے دروازوں اور خوبصورت عمارات سے مرصع ہے۔ میں شہر میں داخل ہونے کو تو ہوگیا۔ مگر یہ ایک نہایت دشوار کام تھا بازار میں اس قدر آمدورفت تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ پیدل اور راہگیروں کے علاوہ۔ صاحب مقدور لوگ گھوڑوں اونٹوں اور ہاتھیوں پر سوار بازاروں میں ہر وقت آتے جاتے ہیں۔ درباری لوگ جنہیں پابندیٔ اوقات کا خیال ہوتا ہے وہ تو علے الصباح ہی شہر سے نکل جاتے ہیں۔ ورنہ عین وقت پران کا شہر سے نکلنا اور دربار میں حاضر ہونا محال نہیں تو مشکل ضرور ہوجائے۔ کیونکہ ہر ایک درباری کی معیت میں کم ازکم چار پانچ سو رفقا ہوتے ہیں۔

ہمیں اس بھیڑ میں سے گزرنا محال ہوگیا۔ کوشش کی مگر بے سود۔ آخر بڑی دیر میں جوں توں کر کے دروازۂ شہر سے باہر آئے۔ اور فصیل سے آدھ فرسنگ کے فاصلے پر ایک طرف کھڑے ہوکر تماشا دیکھنے لگے۔ شہر کے باہر دو رویہ دوکانیں تھیں۔ جن میں گوناگوں اشیا آنے جانے والوں کے لئے فروخت ہوئی تھیں۔ ہمیں شوق اُچھلا کہ بڑے بازار میں جاکر وہاں کی سیر کریں۔ بعد خرابیٔ بسیار دھکا پیل کرتے ہوئے وہاں پہنچے۔ قسم قسم کے کھانوں اور مٹھائیوں کی خوشبو سے دماغ معطر ہوگیا۔ یہاں بیشمار دوکانیں تھیں اور ہر ایک دوکان ایک مکمل باورچیخانہ تھا۔ یہاں کئی قسم کا گوشت بکتا ہے پلے ہوئے اور شکاری، ہر قسم کے جانوروں کا گوشت بھنا ہوا اور شوربے دار ملتا ہے۔ سوٗر کا گوشت یہاں بالکل استعمال نہیں کیا جاتا اس کی بجائے گھوڑے کا گوشت بعض جگہ بکتا ہے۔ اسی بازار میں آگے بڑھ کر دیکھا کہ ایک دوکان ہے۔ جہاں پر ولایت کی مُرغیاں۔ مرغابیاں اور دیگر آبی جانور بکتے ہیں کہیں دوکان میں مکھن۔ تیل۔ خوشبویات۔ مصالح۔ دالیں وغیرہ بھری پڑی ہیں۔ بعض دوکانیں نہایت نفیس و عجیب و غریب خوش ذائقہ میووں سے پُر ہیں۔ گیہوں۔ چاول و دیگر اجناس کی بھی از حد افراط ہے۔

عجیب تر بات جو دیکھنے میں آئی وہ یہ ہے۔ کہ یہاں کئی قسم کی روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔ اور ہر ایک کا نام اور اس کا ذائقہ مختلف ہے۔ معمولی روٹی کئی قسم کے آٹوں کی آمیزش سے لوہے کی گول گول چادروں پر لگائی جاتی ہے۔ اسے "اُپاس" کہتے ہیں۔ وہ لوگ جو کارواں کے ساتھ سفر کرتے ہیں وہ ایک اور روٹی کھاتے ہیں۔ جسے کروچہ (Karucha) یعنی (کلچہ) کہتے ہیں۔ یہ سفید باریک آٹے کی ہوتی ہے۔ تیسری قسم کی روٹی نہایت خوش نما اور لذیذ ہوتی ہے اسے "روغنی" کہتے ہیں۔ یہ عمدہ میوے

[1] دیکھو آنریبل مسٹر جسٹس تھارنٹن کی کتاب "تاریخ و صنادید لاہور"۔

اور گھی کی آمیزش سے پکتی ہے۔ چنانچہ اور بھی کئی قسم کی روٹیاں ہیں۔ جن کے نام مجھے یاد نہیں رہے میرے خیال میں میں ماکولات کے متعلق تو واضح طور پر بیان کر چکا ہوں۔ مگر ایک اور نہایت ضروری بات جو ہر ایک غیر ملکی سیاح کو حیران کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ جملہ اشیا باوجود اتنی نفاست اور لذت کے نہایت سستے داموں پر فروخت کی جاتی ہیں۔ جس کا اندازہ میرے اس بیان سے سراسر حقیقت پر مبنی ہے۔ بخوبی ہو سکتا ہے۔ کہ اگر ایک آدمی تمام دن امیرانہ ٹھاٹھ سے کھاتا ہے یعنی بازار میں جو جو چیزیں اُسے مرغوب خاطر ہوں کھائے اور خوب پیٹ بھر کر کھائے تو اس کے دو نقرئی ریلز (Silver Reals) یعنی پانچ پنس گویا پانچ آنے ہوئے اس سے یہاں کی اشیاءٔ خوردنی کی افراط کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اشیاء کی لذّت، کوچہ و بازار کی صفائی ازحد دلپذیر ہے۔ کاروبار نہایت خاموشی اور اوّل درجے کی ایمانداری سے ہوتا ہے مجال نہیں۔ کہ کسی کے مال پر کوئی نظر بد ڈالے۔ تاجروں کا سامان چوری چکاری سے بالکل محفوظ اور مامون ہے۔

پھر آگے چل کر لکھتا ہے: "لاہور نہایت خوشگوار قطعہ ارض میں واقع ہے۔ اس کے ایک طرف دریائے راوی کا پانی اس کی دیواروں کو چومتا ہے دوسری طرف فرحت بخش باغات۔ محلات۔ سیرگاہیں ہیں۔ یہ شہر ہندوستان کے دوسرے درجے کا شہر ہے۔ اس کی آبادی اور افراط اشیاء خوردنی و میوہ جات کا اندازہ کرنا ہو تو بازار دل شکو[1] کی سیر سے ہو سکتا ہے۔ قابل دید ہے۔ کوئی یورپ کا شہر اس کی خوبصورتی و دلاویزی۔ رونق۔ تجارت۔ دولت کا مقابلہ نہیں کر سکتا!"

جان بپٹسٹ ٹیورنیر (Jhon Babtiste Tavernier)

ایک فرانسیسی جوہری نے ہند کی سیاحت ۱۶۴۱ء سے ۱۶۶۸ء تک کی ہے۔ شاہ جہان اور اورنگ زیب کے زمانے کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ یہ سوداگر اصفہان۔ قندھار۔ کابل۔ لاہور سے ہوتا ہوا دہلی اور آگرے پہنچا۔ وہ اپنی "Travels" یعنی سفرنامے میں لاہور کے حالات لکھتا ہے:

"یہ ایک نہایت عظیم اور خوبصورت شہر ہے۔ دریائے راوی کے کنارے آباد ہے۔ پہلے دریا اس کی دیواروں کے نیچے بہتا تھا۔ مگر اب آدھ میل کے قریب فاصلہ ہو گیا ہے اس کے مکانات دہلی اور آگرے سے زیادہ بلند ہیں۔ بہت سے مقامات قابل دید ہیں۔ خاص کر شاہی محلات نہایت ہی خوبصورت ہیں۔ باغات اس قدر فرح بخش شگفتہ اور دلکشا ہیں کہ ان کی سیر سے طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ لاہور کی دل بستگیاں اس قدر کشش رکھتی ہیں کہ ایک بار آ کر کسی صاحب دل کا جی مشکل سے یہاں سے جانے کو چاہتا ہے بھولی چھپی شراب بھی مل جاتی ہے۔"

۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب نے عنان سلطنت ہند سنبھالی۔ اس کے عہد سے لاہور کا تنزل شروع ہوا۔ اور

[1] یہ بازار دراصل بازار دل شکوہ یا دلکشا کہلاتا تھا۔ مگر افسوس اس کا اب کوئی نشان باقی نہیں۔

پھر ایسا گرا کہ آج تک باوجود اس قدر طویل امن وعافیت کے زمانۂ حال کا لاہور شاہ جہانی لاہور کے نصف وسعت کو نہیں پہنچا۔ اور وہ شاہانہ خوبصورتی اور ستاسماں تو ایک خواب ہو گئے ہیں۔

اورنگ زیب اپنے طویل عہد میں لاہور سے بیگانہ رہا۔ دکن کی مہمات۔ مرہٹوں کی سرکوبی اور سکھوں کی قزاقیوں کے گوناگون فتنہ اور فسادات کے دُور کرنے میں سرگرم ومصروف رہا۔ بادشاہ کی عدم دلچسپی اُمرا کی عدم دلچسپی ہوتی ہے۔ اس طرح اس شہر کو زوال شروع ہوا۔

مگر پھر بھی چند ایک عمارات اس کے زمانے میں لاہور میں تعمیر ہوئیں۔ شہزادہ دارا شکوہ نے جسے حضرت میاںمیر علیہ الرحمۃ سے خاص عقیدت تھی۔ بے انتہا عمارتی مصالحہ ان کے مقبرے کے لئے مہیا کر رکھا تھا۔ مگر اورنگ زیب جو قبر پرستی اور مُردوں کے عالیشان مقبرے بنوانے کے خلاف تھا۔ اس نے اس مصالحہ سے ایک عالیشان مسجد تعمیر کروائی۔ جو شاہی مسجد کے نام سے اب تک مشہور ہے۔

عالمگیر کے عہد ۱۶۶۲ء میں دریائے راوی نے چڑھائی کی اور لاہور کا بیشتر حصہ غرقاب ہو گیا۔ اورنگ زیب نے ایک بند عالمگیری بنوایا۔ یہ طول میں چار میل تھا۔ اسے چونے اور سیسے کی آمیزش سے بنوایا گیا تھا۔ اس کے کنارے جابجا رہٹ لگوا دیئے تھے۔ جن سے اُمرا کے باغات کی آبپاشی ہوتی تھی۔ اور کہیں کہیں سیڑھیاں اور اہل ہنود کے لئے گھاٹ بنوائے۔ اس بند نے شہر کے لئے سد سکندری کا کام دیا۔ جب سے دریا نے پھر کبھی شہر کا رُخ نہیں کیا۔ اس بند کا ایک ٹکڑا اب تک ہیرا منڈی اور مستی دروازے کے درمیان قلعہ کے سامنے باقی ہے۔ اور کچھ حصہ قصبہ بھوگی وال میں بھی بقایا ہے۔

۱۶۶۸ء میں اورنگ زیب نے لاہور میں دربار منعقد کیا۔ اور سرحدی علاقہ جات کا بہ نفس نفیس معائنہ فرمایا اورنگ زیب ایک پختہ کار شاعر تھا۔ اس زمانۂ قیام میں اس نے ایک غزل لکھی اور خلیل اللہ خان گورنر لاہور کو اپنی چٹھی کے ملاحظہ کے لئے بھیجی۔ ناظرین کے تفنن طبع کی خاطر وقف قرطاس کی جاتی ہے۔

زدود دل چہ نویسم کہ جوشش مے تابی ست
زشوق جاں چہ نگارم کہ نامہ سیمابی ست
شب خیال فراقِ کہ ریخت خون دلم
کہ تار اشک گلابی و دیدہ عنابی ست
چگونہ شرح دہم حال دل کہ بے تابم
زیادِ متابِ رُخش دل کتان مہتابی ست
نشستہ ایم دریں بحر تا خدا چہ کند
بکشتیٔ کہ زیک قطرہ آب گردابی ست
نماند صورت راز دلم نہاں عزت
کہ دیدہ صفحہ تصویر رنگ بے خوابی ست

(باقی باقی)

قندِ پارسی

(از جناب اشک کپورتھلوی)

ناتوانی نقدِ جان صرفِ تن آسانی مکن
یوسفِ خود را بچاہِ حرص، زندانی مکن

گر حیات جاودانت آرزوئے دل شدست
در رہِ جاناں تامّل از گرانجانی مکن

حق شناسی نیست غافل، پیش او غیر از نیاز
دعویٔ باطل، ز نازِ پاک دامانی مکن

صد درستی را دہد آب از شکست توبہ اش
در گنہ عذرِ دگر غیر از پشیمانی مکن

تلخیٔ فرہاد از شیریں لباں گردد نصیب
چشم خود را جوئے شیر از ہرزہ سامانی مکن

نیست کس اے اشک از دریائے معنی آشنا
پیشِ ہر نافہم فکر گوہر افشانی مکن!

نذرِ اختر

(ابوالعفر نازش رضوی)

اے جنوں ہنگام وحشت بادیہ پیما ہو
تنگیٔ دل میں تڑپ منت کشِ صحرا نہ ہو

تاقیامت تیرِ اُلفت کی خلش باقی رہے
یاالٰہی حشر تک زخمِ جگر اچھا نہ ہو

ہے تعجب رشکِ عیسٰے تجھ کو سب دنیا ہے
اور اک بیمارِ غم تجھ سے کبھی اچھا نہ ہو

ہے وہ محتاجِ تراحم اُو بتِ نا آشنا
جس کا دنیا میں کوئی تیرے سوا اپنا نہ ہو

بحرِ دنیا میں وہی پاتا ہے نازش آبرو
مثلِ ساحل جو کبھی شرمندۂ دریا نہ ہو

بہترین عطر اور تیل

اگر آپ کو

نہایت اعلیٰ اور مفید روغنیات اور عطریات وغیرہ کی ضرورت ہو تو صرف ہمارے کارخانہ بھر گرا اینڈ کو بازار سید مٹھا لاہور سے طلب فرمائیے ہمارے نرخ دوسروں سے ارزاں اور تیل و عطریات دوسروں سے بہتر اور مفید ہیں قیمتیں ذیل میں ملاحظہ ہوں۔

تیلوں کے نرخ

نام روغن	درجہ	بوتل سالم	بوتل نصف	نام روغن	درجہ	بوتل سالم	بوتل نصف
روغن گلاب	خاص	[illegible]	[illegible]	روغن مولسری	خاص	[illegible]	[illegible]
روغن چنبیلی	〃	[illegible]	[illegible]	روغن حسن عنبری	〃	[illegible]	[illegible]
روغن کیوڑہ	〃	[illegible]	[illegible]	روغن کرنا	〃	[illegible]	[illegible]
روغن موتیا	〃	[illegible]	[illegible]	روغن جوہی	〃	[illegible]	[illegible]
روغن حنا	〃	للعہ	[illegible]	روغن [illegible]	〃	[illegible]	[illegible]
روغن دھنیا سبز	〃	للعہ	[illegible]	روغن ترپھلا	〃	للعہ	[illegible]
روغن [illegible] سنگھار	〃	[illegible]	[illegible]	روغن آملہ	〃	للعہ	[illegible]

عطروں کے نرخ

نام عطر	فی تولہ درجہ اوّل	فی تولہ درجہ دوم
عطر کیوڑہ	[illegible]	[illegible]
عطر موتیا	[illegible]	[illegible]
عطر حنا	[illegible]	[illegible]
مشک عنبر	[illegible]	[illegible]
عطر چنبیلی	[illegible]	[illegible]
عطر نرگس	[illegible]	[illegible]
عطر جوہی	[illegible]	[illegible]
عطر حسن	[illegible]	[illegible]
عطر مولسری	[illegible]	[illegible]
عطر ہار سنگھار	[illegible]	[illegible]
عطر کرنا	[illegible]	[illegible]
عطر کستوری	[illegible]	[illegible]
عطر [illegible]	[illegible]	[illegible]
عطر گلاب	[illegible]	[illegible]

ملنے کا پتہ بھر گرا اینڈ کو بازار سید مٹھا لاہور!

عمل تسخیر القلب ہر کس رجسٹرڈ

منتر ہذا ہمیں سالہا سال کی تلاش وجستجو کے بعد ایک بزرگ تجربہ کار عامل کامل بنگالی صاحب سے صد ملتجیات کے صلہ میں از نقد وقت عطا ہوا ہے جو ہمارت سہل الحصول زود اثر پُرتاثیر اور مجرب المجرب ہے خوبی یہ ہے کہ صرف تین روز میں مراد حاصل ہوتی ہے۔ (بشرطیکہ محبت پاک ہو) اور عامل کو گھر سے باہر جانا نہیں پڑتا نیز مطلوب چاہے کیسا ہی سنگدل کیوں نہ ہو طالب کا مطیع وتابعدار بن جائیگا اور جبتک ملاقات نہ کریگا کسی طرح سے قرار نہ آئیگا قیمت پیشگی کلاں صرف ہدیہ

عمل تسخیر ہمزاد عمل ہذا چند روز ہوئے ایک فقیر سے ہمارے ہاتھ لگا تھا ہمارا ارادہ اسکو مشتہر کرنیکا نہ تھا مگر عمل تسخیر القلب ہر کس کے خریداروں نے ایسے عمل کا انتہائی اشتیاق ظاہر کر کے شائع کرنے پر مجبور کیا قیمت پیشگی پانچ روپیہ ۸ آنہ بذریعہ وی پی پانچ روپیہ آٹھ آنے اور مبلغ پچاس روپیہ بعد کامیابی کی مگر پانچ روپیہ ۸ آنے کے ہمراہ پچاس روپیہ کا اقرار نامہ ضرور آنا چاہئے۔ **نوٹ** صرف سات یوم میں کامیابی ہوتی ہے

ترکیب بغض بھی ہمارے پاس نیز بہدف ہے قیمت پیشگی پانچ روپیہ چار آنہ رازداری کی قسمیہ تحریر کا آنا لازمی ہے

نوٹ مندرجہ بالا عملوں سے جو صاحب کسی ایک کو بھی جھوٹا ثابت کر دینگے انکو ہم دگنی قیمت واپس دینگے اگر انکار کریں تو بذریعہ عدالت چارہ جوئی کر کے وصول کر سکتے ہیں نیز انکو یہ بھی اختیار ہوگا کہ انکی نسبت شکایت جس پرچہ میں چاہیں درج کرائیں مگر از روئے ایمان

۲ ہر ایک عمل کی قیمت پانچ روپیہ چار آنہ کی پیشگی اور پانچ روپیہ ۸ آنہ کا وی پی مگر جو صاحب ایک سے زیادہ عمل ایک ساتھ طلب فرمائینگے انسے پانچ روپیہ فی عمل کے حساب پیشگی لئے جاوینگے۔ ۳ صرف وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جسکو کہ خاکسار اجازت دیگا دوسرا ہرگز کامیاب نہ ہوگا

۴ ہر عمل کسی کو نہ بتانیکی حلفیہ تحریر آنے پر روانہ ہوگا۔

سارٹیفکیٹ (۱) عالی جناب ٹھاکر شیو راج سنگھ صاحب زمیندار مراد آباد محلہ گلگھر سے رقمطراز ہیں مکرم بندہ تسلیم آپکے منتر نے مجھے کافی امداد دی اور میں اپنے کام میں کامیاب ہو گیا لہذا مبلغ پچیس ۲۵ روپیہ بطور نذرانہ ارسال خدمت ہیں مقبول فرمایئے

(۲) عالیجناب ٹھیکہ دار کابیہاں ممتا رام گلاؤٹی ضلع بلند شہر سے تحریر فرماتے ہیں جناب من تسلیم آپکے عطیہ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کیونکہ وہ اپنے اثر میں نہایت پُرتاثیر ثابت ہوا۔ بدیں خیال اسکا نذرانہ اسکے اوصاف کے مقابلہ میں بیحد قلیل ہے بغرض کرنے سے میرے چند احباب بھی اسکے بہت معتقد ہو گئے جنہوں نے آج مجھ سے تذکرہ کیا ہے کہ ہم نے بھی اسکا نذرانہ بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیا ہے میں علاوہ ازیں خلق کی بات بھی امید کرتا ہوں کہ آپکے اس نایاب فیض سے بہت سے لوگ مستفیض ہو کر آپکے شکر گذار رہینگے۔ ایسے ہی سینکڑوں موجود ہیں مگر چونکہ ہمیں مشتہر کرنیکی اجازت نہیں دی اسلئے مجبور ہیں۔

ملنے کا پتہ منیجر کارخانہ دلربائے عالم جنتری رجسٹرڈ امروہہ۔ یو۔ پی

کیا آپ ہندوستانی ہیں!

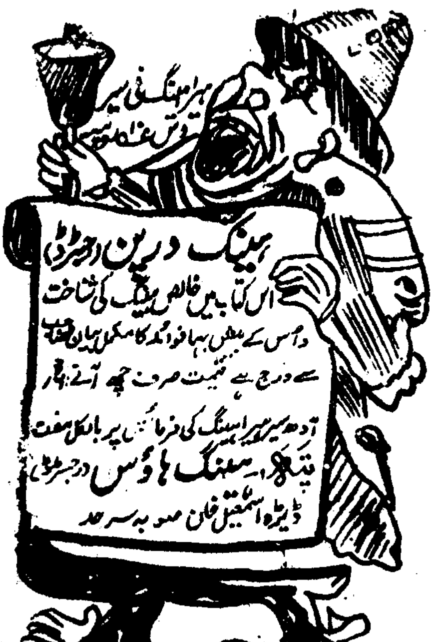
اگر آپ ہندوستانی ہیں۔ تو آیورویدک ادویہ جو فائدہ پہنچائینگی وہ دیگر ادویہ سے غیر ممکن ہے۔ کیونکہ آپ کا جسم ہندوستانی آب وہوا کا پروردہ ہے ۔ اور آیورویدک ادویہ ہندوستانی آب وہوا کے عین مطابق ہیں۔ لیکن ان کے تیار کرنے کا طریقہ درست نہ ہو تو بھی یہ راس نہیں آتیں۔ آیورویدک ادویہ کی جان اور آیورویدک کا لب لباب جو نہایت جانفشانی اور دماغ سوزی کے بعد تیار کیگئی ہیں ۔ وہ مقویات سرتاج عالم ہیں

آتنک نگرہ گولیاں

جو تقریباً نصف صدی سے ہندوستان اور دیگر ممالک میں اپنی فتح کا ڈنکہ بجا رہی ہیں۔ ہر قسم کی کمزوری کو رفع کر کے اعلیٰ درجہ کی طاقت و توانائی بخشتی ہیں۔ قبض۔ بدہضمی۔ خون کی خرابی۔ ادر کمی دیریہ کی ہر قسم کی شکایتیں دور کر کے پوری صحت بخشتی ہیں۔ انسان کی ٹوٹی ہوئی زندگی از سر نو درست کرتی ہیں۔ قیمت رفاہ عام کی غرض سے فی ڈبیہ صرف ایکروپیہ۔ پانچ ڈبیہ چار روپیہ جو صرف دو ہفتہ کے اندر از کار رفتہ اشخاص کو پوری صحت بخشتا ہے۔ یہ لاثانی اور اعلیٰ درجہ کا طلائے واجی کرن ہے طلا ہے قیمت فی شیشی ایکروپیہ (۱ عدد)

المشتہر

ویدشاستری آتنک نگرہ اوشدھالیہ جام نگر کاٹھیاواڑ



ڈیرہ اسمٰعیلخان صوبہ سرحدی کا قدیمی مشہور معروف

سرمہ رفیق بصر رجسٹرڈ

یہ قیمتی اجزا سے مرکب سرمہ جملہ امراض چشم کے لئے تریاق اکبر اور باریک بینوں کے لئے تحفہ بے بہا ہے۔ دھند۔ غبار۔ درد سری۔ رتوند۔ آشوب چشم خارش وغیرہ امراض کو جڑھ سے اکھیڑنا اس کا ادنےٰ سا کرشمہ ہے بشیر خوار بچہ۔ جوان۔ بوڑھا مرد۔ عورت مریض سب کیلئے یکساں مفید ہے آنکھوں کو ٹھنڈک تازگی بخشنے میں بے نظیر ہے بینائی کو تیز کرتا ہے۔ کوئی گھر اس کی موجودگی سے خالی نہ رہنا چاہیے۔ قیمت صرف ۸ر فی شیشی +

منگانے کا پتہ

کارخانہ سرمہ رفیق بصر رجسٹرڈ ڈیرہ اسمٰعیلخان صوبہ سرحدی



سنہری نکات مدنی
چھپ گئی ہے
فوراً خرید لو
ورنہ ختم ہو جائے گی

قواعد

۱۔ بہارستان :۔ ہر ماہ انگریزی کی یکم تاریخ کو شایع ہوتا ہے۔

۲۔ سالانہ چندہ پانچ روپئے، ششماہی تین روپے، نمونہ آٹھ آنہ، (علاوہ محصولڈاک)، غیر ممالک سے آٹھ روپیہ (سالانہ) پیشگی آنے پر رسالہ جاری کیا جاتا ہے۔

۳۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ آنا ضروری ہے۔

۴۔ خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے کے پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے

۵۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۵ تاریخ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

۶۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا پورا پتہ لکھیں۔

پبلشر منشی محمد صادق مزنگ لاہور

افسردہ اور غمگین دلوں کیلئے زندہ دلی کا جاں بخش مژدہ

نکاتِ رموزی

ضیاء الملک ملا رموزی موجدِ گلابی اردو

کے

جدید ظریفانہ مضامین کا ایک دلآویز مجموعہ

ملنے کا پتہ:-

قیمت مہ ۸ — منشی محمد صادق منیجر "بہارستان" مزنگ لاہور — قیمت عہ ۸